حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی

ترتیب

○ حضرت معاویہؓ اور خلافت وملوکیت (۱)

(حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی جائزہ)

مولانا محمد تقی عثمانی

○ حضرت معاویہؓ اور خلافت وملوکیت (۲)

(ترجمان القرآن لاہور کے اعتراضات کا جواب)

مولانا محمد تقی عثمانی

○ حضرت معاویہؓ شخصیت، کردار اور کارنامے

(حضرت معاویہؓ کی سیرت ومناقب)

مولانا محمود اشرف عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

○☆○

حضرت معاویہؓ' ان جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیئے' حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کا دورِ حکومت تاریخ اسلام کے درخشاں زمانوں میں ہے۔ جس میں اندرونی طور پر امن و اطمینان کا دور دورہ بھی تھا اور ملک سے باہر دشمنوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن حضرت معاویہؓ کے مخالفین نے ان پر اعتراضات و الزامات کا کچھ اس انداز سے انبار لگایا ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ تابناک زمانہ سبائی پروپیگنڈے کے گرد و غبار میں روپوش ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے عرصہ سے میری خواہش تھی کہ حضرت معاویہؓ پر جو مشہور اعتراضات کئے گئے ہیں' ان کا واقعات کی روشنی میں جائزہ لے کر اصل حقیقت واضح کی جائے۔ اتفاق سے اسی دوران مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" منظر عام پر آئی' اور اطراف ملک سے ہم سے مطالبہ ہوا کہ اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کریں۔ اس کتاب میں حضرت معاویہؓ پر عائد کئے گئے اعتراضات کو مرتب طریقہ سے یکجا کر دیا گیا تھا' چنانچہ کتاب کے اس حصہ پر جو حضرت معاویہؓ سے متعلق تھا' میں نے ماہنامہ "البلاغ" میں ایک سلسلۂ مضامین تحریر کیا جو نو قسطوں پر شائع ہوا۔

بحمد اللہ اس سلسلۂ مضامین کو ہر علمی حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا' اور اب اپنے کرم فرماؤں کے اصرار پر اسے کتابی شکل میں لایا جا رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ کتابی صورت میں لاتے وقت میں حضرت معاویہؓ کی سیرت اور مناقب پر مثبت انداز میں بھی ایک مضمون تحریر کروں' لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات میں مجھے اس کا موقعہ نہیں مل سکا' بالآخر

میری فرمائش پر برادر زادہ عزیز مولوی محمود اشرف صاحب سلمہ اللہ تعالی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا' اور ماشاء اللہ اس موضوع پر بڑی حسن و خوبی اور سلیقہ کے ساتھ ایک جامع مضمون تیار کردیا جو عزیز موصوف کا نقشِ اول ہے' اور انشاء اللہ ان کے روشن علمی مستقبل کا آئینہ دار۔

اس طرح یہ کتاب اب محض ایک تنقید ہی نہیں ہے' بلکہ اس میں حضرت معاویہؓ کی سیرت' آپ کے فضائل و مناقب' آپ کے عہدِ حکومت کے حالات اور آپ پر مخالفین کے تمام بے جا الزامات کا مدلّل جواب بھی انشاء اللہ مل جائے گا' اور مشاجرات صحابہ کے مسئلہ میں اہل سنت کا معتدل موقف بھی دلائل کے ساتھ واضح ہو سکے گا۔ اللہ تعالی اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے' اور اسے شکوک و شبہات کے ازالہ کا سبب بنائے۔ آمین

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی ۱۴

۲۷ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ

(حصہ اول) حضرت معاویہؓ اور خلافت وملوکیت

عنوان | صفحہ

عنوان — صفحہ

(حصہ دوم) حضرت معاویہؓ اور خلافت ملوکیت

(ترجمان القرآن لاہور کے تبصرے کا جواب)

(حصہ سوم) حضرت معاویہؓ (شخصیت، کردار، اور کارنامے

عنوان	صفحہ

حصہ اوّل

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

(حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی جائزہ)

مولانا محمّد تقی عثمانی

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

چند سال پہلے جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جو کتاب "خلافت و ملوکیت" کے نام سے شائع ہوئی ہے اس کے بارے میں البلاغ کے اجراء کے وقت سے ہمارے پاس خطوط کا تانتا بندھا رہا ہے' ملک و بیرون ملک سے مختلف حضرات اس کتاب کے بارے میں ہمارا مؤقف پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ اب تک ہم نے اس موضوع پر دو وجہ سے کچھ شائع کرنے سے گریز کیا تھا۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ البلاغ کا بنیادی مقصد اس قسم کی بحثوں سے میل نہیں کھاتا۔ ہماری کوشش روزِ اول سے یہ رہی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہی رہے گی کہ البلاغ کی تمام تر توجہ ان بنیادی مسائل کی طرف رکھی جائے جو بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کو درپیش ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ "خلافت و ملوکیت" کا جو حصہ اس وقت سوالات اور اعتراضات کا محور بنا ہوا ہے' وہ ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہے جسے بحث و تمحیص کا موضوع بنانا بہ حالات موجودہ ہم کسی کے لئے بھی نہیں مناسب سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہمارا اجمالی عقیدہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی نگاہوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ان سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ انسان نہیں دیکھے۔ حق و صداقت کے اس مقدس قافلے کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور اگر کسی سے کبھی کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ ان کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا؟ اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسلو۔
عما کانوا یعملون

یہ ایک امت تھی جو گذر گئی۔ ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے
اعمال تمہارے لئے، اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیسا عمل
کیا تھا؟

ان دو باتوں کے پیش نظر ہم اب تک نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھانے، بلکہ "خلافت وملوکیت" کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز کرتے رہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ فتنہ پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑا ہو گیا جس سے بچنے کے لئے ہم نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ پچھلے دنوں اس کتاب کے مباحث دینی حلقوں کا موضوعِ بحث بنے رہے۔ اور اس کے موافق و مخالف تحریروں کا ایک انبار لگ گیا۔ ادھر ہمیں اس کتاب کے مطالعے اور اس کے بہت سے قارئین سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ جن حضرات نے اسے عقیدت اور احترام کے ساتھ پڑھا ہے ان کے دل میں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا دور ہونا ضروری ہے، ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ افراط و تفریط سے ہٹ کر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلے کی حقیقت واضح کر دی جائے۔ اسی ضرورت کا احساس اس مقالے کی شانِ نزول ہے۔

اس مقالے کو منظرِعام پر لانے کے لئے ہم نے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا ہے جب کہ اس موضوع پر بحث و مناظرہ کی گرما گرمی دھیمی پڑ رہی ہے۔ اور فریقین کی طرف سے اس کتاب کی حمایت و تردید میں اچھا خاصا مواد سامنے آچکا ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے قارئین کو بحث و مباحثہ کی اس فضاء سے آزاد ہو کر سوچنے کی دعوت دی جائے جو حقیقت پسندی کے جذبہ کے لئے زہر قاتل ہوا کرتی ہے۔

جن حضرات نے خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا ہے، ہمارا اصل مخاطب وہ ہیں، اور ہم نہایت دردمندی کے ساتھ یہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس مقالے کا بحث و مباحثہ کے بجائے افہام و تفہیم کے ماحول میں مطالعہ فرمائیں، ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اگر ان معروضات کو اسی جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو یہ مضمون تطویل بحث کا سبب نہیں بنے گا بلکہ انشاء اللہ افتراق و انتشار کی موجودہ کیفیت میں کمی ہی آئے گی۔

بحث کیوں چھیڑی گئی؟

ہمارے لئے سب سے پہلے تو یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اس پُر فتن دور میں مشاجرات صحابہ کی اس بحث کو چھیڑنے کا کیا موقع تھا؟ امت مسلمہ کو اس وقت جو بنیادی مسائل درپیش ہیں' اور جتنا بڑا کام اس کے سامنے ہے' مولانا مودودی صاحب یقیناً ہم سے زیادہ اس سے واقف ہوں گے۔ اس اہم کام کے لئے جس یکسوئی اور یک جہتی کی ضرورت ہے' وہ بھی کسی سے مخفی نہیں' کون نہیں جانتا کہ آج کی دنیا میں دولت و حکومت پر اور علمی اور فکری مرکزوں پر ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنے والے نشرواشاعت کے دوررس رسائل پر تمام تر قبضہ یا ان لوگوں کا ہے جو کھلے طور پر دشمن اسلام ہیں اور آپس کے ہزاروں اختلاف کے باوجود اپنا سب سے بڑا خطرہ اسلام کو سمجھے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلے میں متحد ہیں' یا پھر کچھ ایسے ہاتھوں میں ہے جو مسلمان کہلانے کے باوجود ان سے ایسے مرعوب ہیں کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ اس کو کھینچ تان کر کسی طرح ان آقاؤں کی مرضی کے مطابق بنا دیا جائے۔ ان حالات میں اسلام دشمن عناصر کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر کوئی قوت اہل حق کے پاس ہے تو وہ صرف ان کا باہمی اتحاد و اتفاق اور اجتماعی کوشش ہے۔ اس کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ آپس کے سابقہ اختلافات کو بھی ایک خاص دائرہ میں محدود کر کے ان سب کی پوری طاقت اس محاذ پر صرف ہو جس طرف سے کھلے کفرو الحاد کی یلغار ہے۔ اور کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں ملت کی فکری اور عملی توانائیاں غیر ضروری یا ثانوی اہمیت کے مسائل پر صرف کرنے کے بجائے ان بنیادی مسائل پر خرچ کی جائیں جو اس وقت عالم اسلام کے لئے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔

جہاں تک اسلام کے نظامِ خلافت کی تشریح و توضیح کا تعلق ہے' بلاشبہ وہ وقت کی بڑی اہم ضرورت تھی اور اس موضوع پر مولانا نے بھی "خلافت و ملوکیت" کے ابتدائی تین ابواب میں بحیثیت مجموعی بڑی قابل قدر کوشش فرمائی ہے۔ لیکن موجودہ وقت کی ضرورت کے لئے اتنا واضح کر دینا بالکل کافی تھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ وہ کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس میں مقننہ' عدلیہ اور انتظامیہ کے حدود اختیار کیا ہوتے ہیں؟ اور راعی و رعیت کے تعلقات کی

نوعیت کیا ہوتی ہے؟ رہی یہ بحث کہ تاریخ اسلام میں خلافت ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہوئی؟ اور اس کی ذمہ داری کس کس پر عائد ہوتی ہے؟ سو یہ خالصتاً ایک ایسی تاریخی بحث ہے جس کی تحقیق ایک علمی نکتہ آفرینی تو کہلا سکتی ہے لیکن اس سے موجودہ دور کے مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر فائدہ متعلق نہیں ہے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ یہ موضوع کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر ماضی میں کسی نے بحث نہ کی ہو۔ یا اس کی وجہ سے علم تاریخ میں کوئی ناقابل برداشت خلا پایا جاتا ہو۔ آج سے کم و بیش پانچ سو سال پہلے علامہ ابن خلدون جیسے عالمگیر شہرت کے مؤرخ نے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے اور اس علمی خلاء کو نہایت سلامت فکر کے ساتھ پر کر دیا ہے انہوں نے اپنے شہرہ آفاق مقدمے کے تیسرے باب میں خلافت و ملوکیت پر بڑی مبسوط بحث کی ہے' اور اس باب کی چھبیس ویں فصل کا تو عنوان ہی یہ ہے کہ:

فی انقلاب الخلافۃ الی الملک[۱]

خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کا بیان

اس فصل میں انہوں نے اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں اس انقلاب کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں' تاریخ اور بالخصوص تاریخ اسلام کے واقعات اور اس کے اتار چڑھاؤ پر ابن خلدونؒ سے زیادہ نظر رکھنے کا دعویٰ اس دور میں شاید ہی کسی کو ہو' ان کے افکار کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور تمام مسلمان اور غیر مسلم مؤرخین تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں ان کے مقام بلند کے معترف ہیں' اپنی اس بحث میں مشاجرات صحابہؓ کے دریائے خون سے وہ نہایت سلامتی کے ساتھ گذرے ہیں۔

لہٰذا موجودہ زمانہ میں اس مسئلے کی کھود کرید اتنی ہی مضر ہے جتنی بخت نصر کے حملے کے وقت یہودیوں کی یہ بحث کہ حضرت مسیحؑ کے فضلات پاک تھے یا ناپاک؟ یا تاتاریوں کی یلغار کے وقت اہل بغداد کی یہ تحقیق کہ حضرت علیؓ افضل تھے یا حضرت معاویہؓ؟

مولانا مودودی صاحب نے اس بحث کو چھیڑنے کی وجہ جواز یہ بیان فرمائی ہے کہ:

آج پاکستان میں تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون' باب ۳' فصل ۲۶ ص ۳۶۲ تا ۳۹۱' دار الکتاب اللبنانی' بیروت' ۱۹۵۶

اسلامی تاریخ اور علم سیاست کے متعلق اسلامی نظریات پڑھ رہے ہیں۔
ابھی کچھ مدت پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے سیاسیات کے امتحان میں یہ سوالات آئے تھے کہ قرآن نے ریاست کے متعلق کیا اصول بیان کیے ہیں؟ عہدِ رسالت میں ان اصولوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا گیا' خلافت کیا چیز تھی اور یہ ادارہ بادشاہی میں کیوں اور کیسے تبدیل ہوا؟ اب کیا معترض حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان طلباء ان سوالات کے وہ جوابات دیں جو مغربی مصنفین نے دیئے ہیں؟ یا ناکافی مطالعہ کے ساتھ خود الٹی سیدھی رائیں قائم کریں؟ یا ان لوگوں سے دھوکا کھائیں جو تاریخ ہی کو نہیں 'اسلام کے تصورِ خلافت تک کو مسخ کر رہے ہیں؟ الخ" [۱]

لیکن ہمارا خیال ہے کہ مولانا جب بحث و مباحثہ کی موجودہ فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو انہیں خود اپنا یہ عذر کمزور محسوس ہو گا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مسلمان طلباء ان سوالات کے کیا جواب دیں؟ تو اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انہیں وہ جواب دینا چاہیے جو ابن خلدونؒ نے مقدمہ میں دیا ہے اور جس کا ترجمہ ان کے نصاب میں داخل بھی ہے۔ اسے چھوڑ کر مغربی مصنفین یا کسی اور کی طرف وہ اسی وقت رجوع کریں گے جب کہ انہیں از خود بھٹکنے یا گمراہ ہونے کی خواہش ہو اور ظاہر ہے کہ اس خواہش کی موجودگی میں کوئی کتاب ان کی مدد نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی یہ بات بلاشبہ معقول ہے کہ:

"اگر ہم صحتِ نقل اور معقول و مدلّل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہیں کریں گے اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتّب طریقے سے دنیا کے سامنے پیش نہیں کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ

---

[۱] خلافت و ملوکیت ص ۳۰۰

زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھا دیں گے" [1]

لیکن ہمیں اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

۱۔ مولانا نے اس فقرے میں دو خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرنے والے اس کے ذریعہ "اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھا دیں گے۔" دوسرے یہ کہ اس سے خود اسلامی تاریخ کا غلط تصور سامنے آئے گا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے سو اگر یہ لوگ ہماری تاریخ سے ہمارے نظام حکومت اور ہمارے نظام زندگی کا استنباط کرنے کی حماقت کریں گے تو ہمارا صحیح جواب یہ ہو گا کہ ہمارا نظامِ حکومت اور ہمارا "نظامِ زندگی" تاریخ کی عام روایات سے نہیں، قرآن سے اور ان احادیث سے و آثار سے مستنبط ہے جو جرح و تعدیل کی کڑی شرائط پر پوری اترتی ہیں۔ ہمارے نظامِ زندگی کو سمجھنا ہے تو قرآن و حدیث سے اور فقہ و کلام سے سمجھو، خود مولانا مودودی بھی اس بات کو تسلیم فرماتے ہیں کہ "حرام و حلال فرض و واجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ" اور یہ فیصلہ کہ "دین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے" عام تاریخی روایات سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے آخر یہ کیسے جائز ہو گا کہ اپنے نظامِ زندگی کے غلط تصور کو ختم کرنے کے لئے ہم خود ان لوگوں کی اس اصولی غلطی کا اعادہ کریں اور اپنے نظامِ زندگی کا صحیح تصور ثابت کرنے کے لئے ان کی توجہ قرآن و حدیث کی طرف منعطف کرانے کے بجائے خود بھی تاریخی بحثوں میں الجھ جائیں۔؟

رہ گئی دوسری بات کہ اگر ہم نے خود صحتِ نقل کے ساتھ اپنی تاریخ کو مرتّب نہ کیا تو یہ لوگ ہماری تاریخ کا نہایت غلط تصور ذہنوں میں بٹھا دیں گے۔ سو یہ بات بلاشبہ بالکل درست ہے اور فی الواقع اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو تحقیق و نظر کی چھلنی میں چھان کر اس طرح مرتّب کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے آ سکے۔ لیکن اول تو ہم نہایت ادب کے ساتھ یہ گذارش کریں گے کہ مولانا مودودی صاحب نے خود ہماری تاریخ کا جو تصور دے دیا ہے اور ان کی کتاب کے تاریخی حصے سے عہدِ صحابہؓ و تابعین کا جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے وہ بجائے خود انتہائی غلط اور خطرناک تاثر ہے، اور ہم یہ

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۳۰۰

سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تاثر اور کیا دے سکتے ہیں؟ دوسرے مولانا خود ہی غور فرمائیں کیا یہ عظیم کام اتنی آسانی سے عمل میں آسکتا ہے کہ خلافت وملوکیت کی خالص احکامی بحث کے ضمن میں اس قدر سرسری طور پر اسے انجام دیا جائے؟ اگر ہمیں اپنی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ اصلی شکل میں پیش کر کے دلوں کو اس پر مطمئن کرنا ہے تو محض چند یکطرفہ روایات کو جمع کر دینے سے کچھ حاصل نہ ہو گا' اس کے بجائے ہمیں تحقیق و تنقید کے اصول مدلّل طریقے سے معین کرنے ہوں گے'........ ہر روایت کے بارے میں معقول دلائل کے ساتھ یہ بتانا ہو گا کہ ہم نے اس کی مخالف روایات کو چھوڑ کر اسے کیوں اختیار کیا ہے؟ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر آپ طبریؒ' ابن کثیرؒ اور ابن اثیرؒ کے حوالوں سے واقعات کا ایک تسلسل قائم فرما کر دکھلائیں اور "دوسرے لوگ" بعینہ ان ہی کتابوں کے حوالوں سے واقعات کا دوسرا تسلسل ثابت کر دیں تو اس سے وہ "نئی نسل" آخر کیسے مطمئن ہو سکے گی جس کی گمراہی کا آپ کو خوف ہے؟

اسی لئے ہمارے رائے یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور خاص طور سے اس کے مشاجرات صحابہؓ والے حصے کی تحقیق کا یہ کام یا تو اس پر فتن دور میں چھیڑا نہ جائے کیونکہ امت کے سامنے اس سے زیادہ اہم مسائل ہیں جن کے مقابلے میں یہ کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا یا پھر.... انفرادی رائے قائم کرنے کے بجائے متوازن فکر رکھنے والے اہلِ بصیرت علماء کی ایک جماعت اس کام کو انجام دے۔ اور تاریخ کی تحقیق و تنقید کے اصول طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ علماء کا مشورہ اور تعاون حاصل کرے۔ اس کے بغیر اس سلسلے کی انفرادی کوششیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کو نئے میدان فراہم کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دے سکیں گی۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اس معاملے میں ابن خلدونؒ جیسے اہل بصیرت اور متوازن الفکر مؤرخین کی اس تحقیق پر اعتماد کیا جائے' جو انہوں نے تاریخ اسلام کے اولین مآخذ کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد پیش کی ہے۔ اس موضوع پر اگر کوئی انفرادی کوشش ہو بھی تو وہ اسی تحقیق کو بنیاد بنا کر اسے مزید وسعت دے اور کوئی ایسا نتیجہ نکال کر منظر عام پر نہ لائے جو صدیوں کے مسلّمات کے خلاف ہو جس سے ذہنوں میں خلجان پیدا ہو اور افتراق اور انتشار کا دروازہ کھلے۔

اس مختصر گذارش کے بعد ہم "خلافت و ملوکیت" کی ان باتوں کی طرف آتے ہیں جو

ہماری نگاہ میں سخت قابلِ اعتراض ہیں۔ قاعدے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم پہلے صحابہ کرامؓ کی عدالت اور تاریخی روایات کی حیثیت سے متعلق ان اصولی مباحث پر گفتگو کرتے جو مولانا نے اپنے معترضین کے جواب میں چھیڑے ہیں' اس کے بعد جزئیات کی طرف آتے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت وغیرہ کے بارے میں جو اصولی بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں' مولانا مودودی صاحب کی اس کتاب کے بعد وہ شاید اس وقت تک مولانا کے قارئین کے دلوں میں بیٹھ نہ سکے جب تک مولانا کے بیان کردہ واقعات پر تبصرہ نہ کیا جائے خلافت و ملوکیت کو پڑھنے والوں میں اکثریت ایسے حضرات کی ہوگی جن کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ مولانا کے بیان کردہ ہر واقعے کو اس کے اصل مآخذ میں دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ واقعہ جو تاثر دے رہا ہے وہ فی الواقع صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے بجائے یقیناً بیشتر حضرات نے مولانا مودودی صاحب کی نقل پر اعتماد کر کے اس کتاب سے وہی تاثر لیا ہوگا جو یہ کتاب دے رہی ہے' ایسی حالت میں جب تک ان واقعات کی حقیقت نہ بتائی جائے۔ عدالتِ صحابہؓ کی بحث "خلافت و ملوکیت" کے ان قارئین کے دلوں میں نہیں اتر سکے گی جنہوں نے اس کتاب کو عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے ان جزئی واقعات ہی کو سامنے لے آئیں جن پر ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

پوری کتاب پر کماحقہ تبصرہ کرنا تو چند در چند وجوہ کی بناء پر ہمارے لئے ممکن نہیں ہے' ہم یہاں صرف ان اعتراضات کو زیر بحث لائیں گے جو مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر وارد کئے ہیں' حضرت عثمانؓ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے' وہ بھی کئی مقامات پر اپنے اسلوب بیان اور کئی جگہوں پر اپنے مواد کے لحاظ سے بہت قابل اعتراض ہے' لیکن حضرت معاویہؓ کے بارے میں تو وہ انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور ہماری پر خلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سے واپس لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی جذبے کے تحت ہم نے یہاں صرف ان اعتراضات کو اپنی گفتگو کے لئے چنا ہے جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کئے ہیں۔ ہم ایک بار پھر یہ گذارش کریں گے کہ ہماری ان معروضات کو بحث و مباحثہ کی فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھا جائے اور چونکہ معاملہ صحابہ کرام کا ہے اس لئے اس نازک معاملے میں ذہن کو جماعتی تحزب یا شخصی اعتقاد کی قیود سے بالکل آزاد کر لیا جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ دردمندانہ

گزارش قابلِ قبول ہوگی۔

۱۔ بدعت کا الزام

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں۔

"ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی' اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے' اور اس معاملے میں حلال و حرام کی تمیز روانہ رکھتے تھے' مختلف خلفائے بنی امیہ کے عہد میں قانون کی پابندی کا کیا حال رہا' اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہو گئی تھی۔"

اس "پالیسی" کو ثابت کرنے کے لئے مولانا نے چھ سات واقعات لکھے ہیں۔ پہلا واقعہ وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ :

"امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے' نہ مسلمان کافر کا' حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا' حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا' مگر ہشام بن عبد الملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کر دیا۔" (ص۔ ۱۷۳)

اس واقعہ کے لئے مولانا نے البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۹' اور جلد ۹ صفحہ ۲۳۲ کا حوالہ دیا ہے لہٰذا پہلے اس کتاب کی اصل عبارت ملاحظہ فرمالیجئے۔

حدثنی الزہری قال: کان لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکرؓ و عمرؓ وعثمانؓ و علیؓ' فلما ولی الخلافۃ معاویۃ ورث المسلم من الکافر ولم یورث الکافر من المسلم' واخذ بذالک

الخلفاء من بعدہ فلما قام عمر بن عبدالعزیز راجع السنۃ الاولی و تبعہ فی ذلک یزید بن عبدالملک، فلما قام ھشام اخذ بسنۃ الخلفاء یعنی انہ ورث المسلم من الکافر۔"

"امام زہری فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ اور خلفائے اربعہؓ کے عہد میں نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا تھا نہ کافر مسلمان کا، پھر جب معاویہؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا، اور کافر کو مسلمان کا وارث نہ بنایا، ان کے بعد خلفاء نے بھی یہی معمول رکھا، پھر جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا۔ اور یزید بن عبدالملک نے بھی ان کی اتباع کی، پھر جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سنت پر عمل کیا یعنی مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا۔[1]

اب اصل صورت حال ملاحظہ فرمایئے، واقعہ اصل میں یہ ہے کہ یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے مختلف فیہ رہا ہے۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، اس اختلاف کی تشریح علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے۔

"واما المسلم فھل یرث من الکافر ام لا، فقالت عامۃ الصحابۃ رضی اللہ تعالٰی عنھم لا یرث، وبہ اخذ علماءنا والشافعیؒ وھذا استحسان والقیاس ان یرث وھو قول معاذ بن جبلؓ ومعاویۃ بن ابی سفیانؓ وبہ اخذ مسروق والحسن و محمد بن الحنفیۃ و محمد بن علی بن حسین۔"[2]

"رہی یہ بات کہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، سو عام صحابہ کرامؓ کا قول تو یہی ہے کہ وہ وارث نہ ہو گا، اور اسی کو ہمارے علماء "حنفیہ" اور امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے لیکن یہ استحسان ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وارث ہو اور یہی حضرت معاذ بن جبل اور حضرت معاویہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۳۲ ج ۹ مطبعۃ السعادۃ

[2] عمدۃ القاری ص ۲۶۰ ج ۲۳ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ باب لا یرث المسلم الکافر الخ

کا مذہب ہے' اور اسی کو مسروقؒ' حسنؒ' محمد بن حنفیہؒ اور محمد بن علی بن حسینؒ نے اختیار کیا ہے۔"

اور حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں[۱]

"اخرج ابن ابی شیبة من طریق عبداللہ بن معقل قال مارایت قضاء احسن من قضاء قضی به معاویة نرث اهل الکتاب ولا یرثونا کما یحل النکاح فیهم ولا یحل لهم و به قال مسروق و سعید بن المسیب و ابراهیم النخعی و اسحاق"

"ابن ابی شیبہؒ نے حضرت عبداللہ بن معقل سے نقل کیا ہے' وہ فرماتے تھے کہ میں نے کوئی فیصلہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے بہتر نہیں دیکھا کہ ہم اہل کتاب کے وارث ہوں اور وہ نہ ہوں' یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے لئے ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے' مگر ان کے لئے ہماری عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔ اور یہی مذہب مسروقؒ' سعید بن المسیبؒ' ابراہیم نخعی اور اسحاق رحمتہ اللہ کا ہے۔"

پھر حافظ ابن حجرؒ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کی تائید میں ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے۔

"عن معاذ" قال یرث المسلم من الکافر من غیر عکس واحتج بانه سمع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول الاسلام یزید ولا ینقص وهو حدیث اخرجه ابوداؤد و صححه الحاکم"

"حضرت معاذؓ فرماتے تھے کہ مسلمان کافر کا وارث ہو گا مگر اس کا عکس نہیں ہو گا' وہ دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ انہوں نے خود رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اسلام (انسانی حقوق میں) زیادتی کرتا ہے' کمی نہیں کرتا۔ یہ حدیث امام ابو داؤدؒ نے روایت کی ہے اور حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔"

---

[۱] فتح الباری ص ۴۱ ج ۱۲ المطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۴۸ھ باب مذکور

یہ تمام صورت حال آپ کے سامنے ہے' اسے ذہن میں رکھ کر مولانا مودودی کی مذکورہ عبارت کو ایک بار پھر پڑھئے' مولانا نے یہ واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا حضرت معاویہؓ اس مسئلے میں بالکل منفرد ہیں' اور کسی اجتہادی رائے کی بناء پر نہیں بلکہ (معاذاللہ) کسی سیاسی غرض سے انہوں نے یہ "بدعت" جاری کی ہے۔ اور اس طرح "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کرڈالا ہے' لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ سراسر فقہی مسئلہ ہے جس میں وہ تنہا بھی نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت معاذ بن جبل جیسے جلیل القدر صحابی (جن کے علم و فقہ پر خود آنحضرتؐ کی شہادت موجود ہے[1]) اور تابعین میں سے مسروق" حسن بصری" ابراہیم نخعی" محمد بن حنفیہ" محمد بن علی بن حسین" اور اسحاق بن راہویہ" جیسے فقہاء بھی ان کے ساتھ ہیں۔ حضرت معاویہؓ کا یہ فقہی مسلک بلاشبہ بعد کے فقہاء نے اختیار نہیں کیا' ہم خود بھی اس مسلک کے قائل نہیں ہیں' لیکن ساتھ ہی ہمارا اعتقاد یہ بھی ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ اپنے اس اجتہاد میں بالکل تنہا ہوں تب بھی اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ان کے اس اجتہاد کو "بدعت" کہا جائے' یا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ انہوں نے سیاست کو دین پر غالب رکھنے اور "حلال و حرام کی تمیز" کو مٹانے کی "پالیسی" شروع کردی تھی' کیا حضرت علیؓ سے اختلاف کرکے حضرت معاویہؓ کو اتنا بھی حق نہیں رہا کہ وہ کسی شرعی مسئلے میں اپنے علم و فضل سے کام لے کر کوئی اجتہاد کرسکیں؟ جب کہ وہ فقہاء میں سے ہیں' اور ان کے بارے میں صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ :۔

> قیل لابن عباسؓ هل لک فی امیر المومنین معاویة؟ ما اوتر الا بواحدة
> قال : أصاب' انه فقیه[2]"

> "حضرت ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ امیر المومنین معاویہؓ ہمیشہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں' کیا آپ اس معاملے میں کچھ فرمائیں گے؟
> "حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا! انہوں نے درست کیا' وہ فقیہ ہیں"

---

[1] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم' اعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل

[2] صحیح بخاری' کتاب المناقب' ذکر معاویة بن ابی سفیانؓ ص ۵۳۱ ج ۱: نور محمد کراچی

یہی وجہ ہے کہ وہ امام زہریؒ جن کا مقولہ مولانا مودودی صاحب نے نقل کیا ہے 'حضرت معاویہؓ سے اس معاملے میں اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے اس فعل کو "بدعت" نہیں کہتے' بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے :

راجع السنۃ الاولیٰ [1]

"پہلی سنت کو لوٹا دیا"

اس میں "پہلی سنت" کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ دوسری سنت جو حضرت معاویہؓ نے جاری رکھی تھی، وہ بھی سنت ہی تھی' بدعت نہ تھی' لیکن حیرت ہے کہ مولانا مودودی صاحب اُن کے اس جملے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں :

"حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا۔" (ص ۱۷۳)

(۲) نصف دیت کا معاملہ

حضرت معاویہؓ کے عہد میں "قانون کی بالاتری کے خاتمے" اور سیاست کو دین پر غالب رکھنے کی "پالیسی" کی دوسری شہادت مولانا مودودی نے یہ پیش کی ہے :

"حافظ ابن کثیر "کہتے [2] ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا' سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا۔ اور باقی خود لینی شروع کر دی۔"

(ص ۱۷۳'۱۷۴)

اس میں اول تو خط کشیدہ جملہ نہ حافظ ابن کثیرؒ کا ہے' نہ امام زہریؒ کا۔ بلکہ یہ خود مولانا کا ہے۔ (یہ نشاندہی ہم نے اس لئے کی ہے کہ مولانا کی عبارت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حافظ ابن کثیر کا ہے)

البدایہ والنہایہ کی اصل عبارت یہ ہے :

---

[1] البدایہ والنہایہ' ص ۲۳۲ ج ۹

[2] اس معاملے میں بھی مولانا مودودی سے غلطی ہوئی ہے' یہ مقولہ خود حافظ ابن کثیرؒ کا نہیں ہے بلکہ امام زہری ہی کا ہے' وبہ قال الزھری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں

"وبه قال الزهري و مضت السنة ان دية المعاهد كدية المسلم وكان معاوية اول من قصرها الى النصف واخذ النصف لنفسه"[1]

"مذکورہ سند ہی سے امام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ! سنت یہ چلی آتی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہوگی، اور حضرت معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کردیا، اور نصف اپنے واسطے لے لی۔

یہ درست ہے کہ یہ عبارت سرسری نظر میں بڑی مغالطہ انگیز ہے، کیونکہ اس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے باقی نصف دیت خود اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کردی تھی، لیکن کاش! مولانا مودودی اس مجمل اور سرسری مقولے کو دیکھ کر حضرت معاویہؓ پر اتنا سنگین الزام عائد کرنے سے قبل صورت حال کی پوری تحقیق فرمالیتے، ہمارا خیال ہے کہ اگر مولانا اس موقع پر شروح حدیث میں سے کسی بھی مستند کتاب کی مراجعت فرماتے تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہتی۔

واقعہ اصل میں یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا یہ مقولہ نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کا پورا مقولہ سامنے ہو تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، مشہور محدث امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ان کا یہ مقولہ ابن جریج کی سند سے پوری تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمایئے :

"عن الزهري قال كانت دية اليهودي والنصراني في زمن نبي الله صلى الله عليه وسلم مثل دية المسلم وابي بكر و عمر و عثمان رضي الله عنهم فلما كان معاوية اعطى اهل المقتول النصف والقى النصف في بيت المال قال ثم قضى عمر بن عبدالعزيز في النصف والقى ما كان جعل معاوية"[2]

"امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی کی دیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان کی دیت کے برابر تھی، حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور

---

[1] البدایہ والنہایہ، ص ۱۳۹ ج ۸

[2] السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ص ۱۰۲ ج ۸ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن ۱۳۵۴ھ

عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا۔ پھر جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو آدھی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدھی بیت المال میں داخل کردی، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دیت تو آدھی ہی رکھی، مگر (بیت المال کا) جو حصہ معاویہؓ نے مقرر کیا تھا وہ ساقط کردیا۔"

اس سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ حضرت معاویہؓ نے آدھی دیت خود لینی شروع نہیں کی تھی بلکہ بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس میں "اخذ النصف لنفسہ" (آدھی خود لینی شروع کردی) سے مراد بیت المال کے لئے لینا ہے نہ کہ اپنے ذاتی استعمال کے لئے۔

اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہد کی دیت مسلمان کے برابر کی تھی تو حضرت معاویہؓ نے اسے نصف کرکے باقی نصف کو بیت المال میں کیوں داخل کردیا؟ سو حقیقت یہ ہے کہ معاہد کی دیت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایتیں مروی ہیں، اس لئے یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس طرح منقول ہے کہ:

عقل الکافر نصف دیۃ المسلم[1]

"کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی"

چنانچہ اسی حدیث کے پیش نظر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ اسی بات کے قائل ہیں کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہیے[2] اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

دیۃ ذمی دیۃ مسلم

"ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے"[3]

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا مسلک اسی حدیث پر مبنی ہے، اور وہ

---

[1] رواہ احمدؒ و النسائیؒ والترمذی وروی مثلہ ابن ماجہؒ (نیل الاوطار ص ۶۴ ج ۷ مطبع عثمانیہ ۱۳۵۷ھ)

[2] نیل الاوطار ص ۶۵ ج ۷ وبدایۃ المجتہد ص ۳۴۳ ج ۲ [3] السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ص ۱۰۲ ج ۸

مسلمان اور معاہد کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ یہ دونوں روایتیں مروی ہیں' اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دلوادی اور باقی نصف بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی ایک عقلی وجہ بھی خود بیان فرمائی' حضرت ربیعہ" فرماتے ہیں کہ :

"فقال معاویۃؓ ان کان اھلہ اصیبوا بہ فقد اصیب بہ بیت مال المسلمین فاجعلوا لبیت مال المسلمین النصف ولاھلہ النصف خمسمائۃ دینار ثم قتل رجل اخر من اھل الذمۃ فقال معاویۃؓ لوانا نظرنا الی ھذا الذی یدخل بیت المال فجعلناہ وضیعا عن المسلمین وعونا لھم[2]"

"حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ ذمی کے قتل سے اگر اس کے رشتہ داروں کو نقصان پہنچا ہے تو مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچا ہے (کیونکہ جو جزیہ وہ ادا کیا کرتا تھا وہ بند ہوگیا۔ تقی) لہٰذا دیت کا آدھا حصہ (پانچ سو دینار) مقتول کے رشتے داروں کو دے دو اور آدھا بیت المال کو' اس کے بعد ذمیوں میں سے ایک اور شخص قتل ہوا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ جو رقم ہم بیت المال میں داخل کررہے ہیں، اگر ہم اس پر غور کریں تو اس سے ایک طرف مسلمانوں کا بوجھ ہلکا ہو اور دوسری طرف یہ ان کے لئے اعانت بھی ہوئی۔

ایک مجتہد کو حق ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس اجتہاد سے علمی طور پر اختلاف کرے لیکن یہ اعتراف ہر غیر جانب دار شخص کو کرنا پڑے گا کہ حضرت معاویہؓ نے اس طرح

---

[1] نیل الاوطار ص ۵۵ ج ۷ وبدایۃ المجتہد ۳۱۴ ج ۲

[2] مراسیل ابی داؤد" ص ۱۳ مطبوعہ اصح المطابع۔ والجوہر النقی تحت البیہقی" ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۸' ہم نے یہ الفاظ موخر الذکر سے نقل کئے ہیں' اول الذکر میں "وضیعا عن" کے بجائے "ونیفا علی" کا لفظ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعارض احادیث میں جس خوبی کے ساتھ تطبیق دی ہے وہ ان کے تفقہ اور علمی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انصاف فرمایئے کہ ان کے اس حسین فقہی اجتہاد کی تعریف کرنے کے بجائے اسے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" قرار دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟

یہاں ایک بات اور واضح کر دینا مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ اگرچہ امام زہریؒ کا قول یہی ہے کہ حضرت معاویہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر قرار دیتے آرہے تھے اور حضرت معاویہؓ نے پہلی بار اس میں تغیر کیا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں روایات بہت مختلف ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں تو ہم ابھی لکھ کر آئے ہیں' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی اس معاملے میں مختلف روایات مروی ہیں' بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ ان کے عہد میں ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے ایک تہائی وصول کی جاتی تھی۔ مشہور محدث علامہ ابن الترکمانیؒ تحریر فرماتے ہیں :

وعمرؓ وعثمانؓ قد اختلف عنهما[1]

اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے مختلف روایات مروی ہیں۔

اسی لئے امام شافعیؒ نے بھی اسی ایک تہائی والے مسلک کو اختیار کیا ہے۔[2]

(۳) مال غنیمت میں خیانت

ایک اسی قسم کا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :۔

"مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنت کی رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونا چاہئے جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو' لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے

---

[1] الجوہر النقی تحت سنن البیہقی ص ۱۰۳ ج ۸ مزید ملاحظہ ہو نیل الاوطار ص ۶۵ ج ۷

[2] نیل الاوطار بحوالہ مذکورہ وبدایۃ المجتہد ص ۳۱۴ ج ۲

لئے الگ نکال دیا جائے' پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔" (ص : ۱۷۴)

اس اعتراض کی سند میں مولانا نے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے ہیں' جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۹ جلد ۸ کا حوالہ بھی ہے' ہم یہاں اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں :۔

وفی هذه السنة غزا الحكم بن عمرو نائب زياد على خراسان جبل الاسل عن امر زياد فقتل منهم خلقا كثيرا وغنم اموالاً جمة فكتب اليه زياد:
ان امير المومنين قد جاء كتابه ان يصطفى له كل صفراء و بيضاء يعنى الذهب والفضة ۔ يجمع كله من هذه الغنيمة لبيت المال فكتب الحكم بن عمرو : ان كتاب الله مقدم على كتاب امير المومنين' وانه والله لو كانت السماوات والارض على علو فاتقى الله يجعل له مخرجا' ثم نادى فى الناس ان اغدوا على قسم غنيمتكم فقسمها بينهم وخالف زيادا فيما كتب اليه عن معاوية وعزل الخمس كما امر الله ورسوله[1]

"اسی سال خراسان میں زیاد کے نائب حضرت حکم بن عمروؓ نے زیاد کے حکم سے جبل الاسل کے مقام پر جہاد کیا بہت سے آدمیوں کو قتل کیا اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا' تو زیاد نے انہیں لکھا کہ :

امیر المومنین کا خط آیا ہے کہ سونا چاندی ان کے لئے الگ کرلیا جائے اور اس مال غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔ حکم بن عمروؓ نے جواب میں لکھا کہ اللہ کی کتاب امیر المومنین کے خط پر مقدم ہے' اور خدا کی قسم اگر آسمان وزمین کسی کے دشمن ہو جائیں اور وہ اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے پھر

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۹ : ج ۸

انہوں نے لوگوں میں اعلان کیا کہ تم اپنے مال غنیمت کو تقسیم کرنا شروع
کردو' چنانچہ اس مال غنیمت کو انہوں نے لوگوں کے درمیان تقسیم کردیا۔
اور زیاد نے حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کر کے جو کچھ انہیں لکھا تھا'
اس کی مخالفت کی اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول
کے حکم کے مطابق بیت المال کے لئے الگ کیا۔"

اس عبارت کا مولانا مودودی صاحب کی عبارت کے ساتھ مقابلہ فرمایئے تو مندرجہ ذیل فرق واضح طور پر نظر آئیں گے :

(۱) البدایہ والنہایہ کی اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ اس حکم کی رو سے حضرت معاویہؓ کی ذات کے لئے سونا چاندی نکالنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ بیت المال کے لئے نکالنا پیش نظر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ حکم کے الفاظ صاف لکھ رہے ہیں کہ :۔

یجمع کله من هذه الغنیمة لبیت المال

"اس مال غنیمت میں سے سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا
جائے۔"

مگر مولانا مودودی اسی عبارت کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی' سونا ان کے
لئے الگ نکال لیا جائے۔" (ص : ۱۷۴)

ہمارا ناطقہ قطعی طور پر سر بگریباں ہے کہ اس تفاوت کی کیا تاویل کیا توجیہہ کریں؟"

(۲) مولانا مودودی کی عبارت کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا یہ تاثر لے گا کہ جن تواریخ کا مولانا نے حوالہ دیا ہے ان میں صراحت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا یہ حکم براہ راست منقول ہوگا' اسی حکم کو دیکھ کر مولانا نے یہ عبارت لکھی ہے لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ البدایہ والنہایہ میں اور اسی طرح باقی تمام تواریخ میں حضرت معاویہؓ کا براہ راست کوئی حکم منقول نہیں بلکہ زیاد نے ان کی طرف منسوب کر کے اپنے ایک نائب کو ایسا لکھا تھا[1] اور یہ بات کسی تاریخ سے

---

[1] اسی وجہ سے حافظ ابن کثیرؒ نے بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ خالف زیادا فیما کتب الیه عن معاویة" اور خالف معاویہ نہیں فرمایا:

ثابت نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے واقعۃً زیاد کو ایسا لکھا تھا یا زیاد نے خواہ مخواہ ان کی
طرف یہ غلط بات منسوب کردی تھی؟
(۳) مولانا مودودی نے اس "حکم" کا تو ذکر فرمایا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ اس حکم کی تعمیل
سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ اگر اصل کتابوں کی مراجعت نہ کی جائے تو ہر پڑھنے والا یہ
سمجھے گا کہ یقیناً اس حکم کی تعمیل بھی کی گئی ہوگی۔ حالانکہ آپ نے دیکھا البدایہ والنہایہ میں
صاف تصریح ہے کہ حضرت حکم بن عمروؓ نے اس مجمل حکم کی بھی تعمیل نہیں فرمائی۔
(۴) مولانا مودودی صاحب کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ حکم
مستقل طور سے جاری کردیا ہوگا۔ حالانکہ اگر زیاد کو سچا مان لیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ
حکم ایک خاص جہاد سے متعلق تھا۔ گویا صورتحال تاریخ کی روشنی میں یہ ہے کہ زیاد نے
اپنے ایک نائب کو خط لکھتے وقت یہ لکھا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے لکھا ہے کہ جبل الاسل کے
جہاد میں جو مال غنیمت ملا ہے اس میں سے سونا چاندی بیت المال کے لئے الگ کرلیا جائے
نائب کو زیاد کا یہ خط ملا مگر اس نے اس حکم کو کتاب اللہ کے خلاف سمجھ کر اس کی تعمیل نہ
کی، لیکن مولانا نے آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ دیا اور حضرت معاویہؓ پر مال غنیمت کی
تقسیم کے معاملہ میں کتاب وسنت کی "صریح خلاف ورزی" کا الزام لگا کر براہ راست لکھ دیا
کہ :

"حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے سونا چاندی ان کے لئے
الگ نکال لیا جائے۔"

تاریخ کے اندر اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہم نے اوپر بعینہ نقل کردیا ہے
اب مولانا مودودی کی عبارت سے قطع نظر کرکے اصل عبارت پر آپ غور فرمائیں گے تو
ممکن ہے کہ ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر حضرت معاویہؓ کا یہ حکم شریعت کے مطابق تھا
حضرت حکم بن عمروؓ نے جو خود صحابہؓ میں سے ہیں، اس پر اتنی خفگی کا اظہار کیوں فرمایا؟ اور
اسے کتاب اللہ کے خلاف کیوں قرار دیا؟ اس شبہ کے جواب میں عرض ہے کہ جتنی تواریخ
ہم نے دیکھی ہیں، ان سب میں یہ واقعہ اس قدر اجمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے
صحیح صورتحال کا پتہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔
اول تو زیاد کا واسطہ ہی مخدوش ہے، کچھ پتہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے واقعۃً ا

مضمون کا خط لکھا بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر لکھا تھا تو اس کے الفاظ کیا تھے؟ اور ان کا واقعی منشاء کیا تھا؟ زیاد نے ان کے الفاظ روایت بالمعنیٰ (INDIRECT NARRATION) کے طور پر ذکر کئے ہیں جس میں ردّوبدل کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

اور اگر فرض کرلیا جائے کہ زیاد نے کسی بددیانتی یا غلط فہمی کے بغیر حضرت معاویہؓ کا خط درست طور پر نقل کیا ہو تب بھی عین ممکن ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو' اور حضرت معاویہؓ اپنے اندازے یا کسی اطلاع کی بناء پر یہ سمجھے ہوں کہ جبل الاسل کے جہاد میں جو سونا چاندی ہاتھ آیا ہے وہ کل مال غنیمت کے پانچویں حصے سے زائد نہیں ہے اس لئے انہوں نے بیت المال کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ حکم جاری فرمایا ہو کہ مال غنیمت میں سے جو پانچواں حصہ بیت المال کے لئے بھیجا جائے گا اس میں دیگر اشیاء کے بجائے صرف سونا چاندی ہی بھیجا جائے۔ ظاہر ہے یہ حکم کسی طرح کتاب وسنت کے خلاف نہ تھا لیکن حضرت حکم بن عمروؓ نے اس پر اس لئے ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ فی الواقعہ مال غنیمت کے طور پر ملنے والا سونا چاندی پانچویں حصہ سے زائد تھا۔ ایسی صورت میں وہ سارا سونا چاندی بیت المال میں داخل کرنے کو کتاب اللہ کے خلاف تصور کرتے تھے۔

غرض کہ اس مجمل واقعہ کی بہت سی توجیہات ممکن ہیں۔ اب یہ بات عقل اور دیانت کے قطعی خلاف ہوگی کہ ہم ان قوی احتمالات کو قطعی طور پر رد کردیں جن سے حضرت معاویہؓ کی مکمل براءت واضح ہوتی ہو' اور جو ضعیف احتمالات ان کی ذات والا صفات کو مجروح کرتے ہوں انہیں اختیار کر کے بلا تامل یہ حکم لگادیں کہ "حضرت معاویہؓ نے مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔"

حضرت علیؓ پر سبّ و شتم

مولانا مودودی صاحب نے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت حضرت معاویہؓ پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ :-

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبر رسولؐ پر عین روضہ نبویؐ کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس راویت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سبّ علیؓ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کردی :-

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ... الخ(ص : ۱۷۴)

مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کئے ہیں، ایک یہ کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ پر خود سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دوسرے یہ کہ انکے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب تینوں دعوؤں کا اصل ماخذ میں مطالعہ کیجئے:

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے سو حضرت معاویہؓ کی طرف اس "مکروہ بدعت" کو منسوب کرنے کے لئے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کئے ہیں (طبری جلد ۴ ص

۱۸۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۴ ج ۴ ص ۱۵۴، البدایہ ج ۹ ص ۸۰) ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظر غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ "خود" حضرت علیؓ پر بر سر منبر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے لیکن چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اس "انسانی اخلاق کے خلاف" فعل کا ارتکاب وہ "خود" کیا کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمایئے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے میں مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے۔ مثلاً مسعودی کی مروج الذہب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں چند روایات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:-

لما جاء خبر قتل علیؓ الی معاویةؓ جعل یبکی، فقالت له امراته اتبکیه وقد قاتلته فقال ویحک انک لا تدرین ما فقد الناس من الفضل والفقه والعلم [1]

"جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے۔ ان کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ آپ اب ان کو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں، ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم و فضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔"

یہاں حضرت معاویہؓ کی اہلیہ محترمہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ اب آپ انہیں کیوں روتے ہیں جب کہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے، لیکن یہ نہیں کہا کہ زندگی میں تو آپ ان پر سبّ وشتم

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۰ ج ۸

کیا کرتے تھے' اب ان پر کیوں روتے ہیں؟

(۲) امام احمد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاۃؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت زید بن عمر بن خطابؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو کچھ برا بھلا کہا' حضرت معاویہؓ نے اس پر انہیں توبیخ کرتے ہوئے فرمایا

نشتم علیا وھو جدہ

"تم علیؓ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں۔"[1]

(۳) علامہ ابن اثیر جزریؒ نے حضرت معاویہؓ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے' اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ

لن یاتیکم من بعدی الا من انا خیر منہ کما ان من قبلی کان خیر امنی[2]

میرے بعد تمہارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا' میں اس سے بہتر ہوں گا' جس طرح مجھ سے پہلے جتنے (خلفاء) تھے مجھ سے بہتر تھے۔

(۴) علامہ ابن عبدالبرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا کہ "میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو" ضرار صدائی نے بڑے بلیغ الفاظ میں حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کیں' حضرت معاویہؓ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے' پھر فرمایا

رحم اللہ ابا الحسن' کان واللہ کذالک

اللہ ابوالحسن (علی) پر رحم کرے' خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔[3]

نیز حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علیؓ سے خط و کتابت کے ذریعے معلومات حاصل کیا کرتے تھے چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ

---

[1] البدایہ ص ۲۴۸ ج ۴ مطبعۃ الاستقامہ بالقاہرۃ ۱۳۵۸ھ و الکامل لابن الاثیر ص ۵ ج ۴

[2] الکامل لابن الاثیر ص ۲ ج ۴

[3] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۳' ۴۴ ج ۳۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ' القاہرہ ۱۹۳۰ء

ذھب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالبؓ

"ابن ابی طالبؓ کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہو گئے۔"[۱]

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے؟

پھر دوسرا دعویٰ مولانا نے یہ کیا ہے کہ "ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں بر سر منبر حضرت علیؓ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کے "تمام گورنروں" کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علیؓ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کیا کرو۔

لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مولانا نے پیش کئے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ اول تو یہ سمجھ لیجئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہؓ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے، ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ دوسرے مروان بن الحکم[۲] اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لئے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے

---

[۱] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۵ ج ۳، ذکر سیدنا علیؓ بن ابی طالب

[۲] طبری ج ۴ ص ۱۸۸ اور کامل ابن اثیر ص ۲۳۴ ج ۳ کا حوالہ مولانا نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے متعلق دیا ہے اور البدایہ ص ۲۵۹ ج ۸ کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے۔ رہ گیا البدایہ ص ۸۰ ج ۹ کا حوالہ سو اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الثقفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہؓ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبدالملک کا گورنر تھا۔ اسی طرح ابن اثیر ص ۱۵۴ ج ۴ میں بنوامیہ کے خلفاء کا عمومی تذکرہ ہے حضرت معاویہؓ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں۔

زیادہ حضرت معاویہؓ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آگیا کہ حضرت معاویہؓ کے "تمام گورنر" خود حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ یہ "تمام گورنر" کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جاسکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی سن لیجئے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ پر سبّ و شتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ ابن جریر طبریؒ نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے نقل کرکے ابن اثیر جزریؒ نے اپنی تاریخ الکامل میں اسے درج کردیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں[1] :-

"قال هشام بن محمد عن ابی مخنف عن المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير و فضيل بن خديج والحسين بن عقبة المرادى قال كل قد حدثنى بعض هذا الحديث فاجتمع حديثهم فيما سقت من حديث حجر بن عدى الكندى واصحابه ان معاوية بن ابى سفيان لما ولى المغيرة بن شعبة فى جمادى سنة ۴۱ دعاه فحمد الله واثنى عليه ثم قال اما بعد... وقد اردت ايصاك باشياء كثيرة فانا تاركها اعتماداً على بصرك بما يرضينى ويسعد سلطانى ويصلح به رعيتى ولست تاركاً ايصاءك بخصلة لاتتحم عن شتم على و ذمه والترحم على عثمان والاستغفار له والعيب على اصحاب على والاقصاء لهم وترك الاستماع منهم.. قال ابو مخنف قال الصقعب بن زهير سمعت الشعبى يقول.. واقام المغيرة على الكوفة عاملا لمعاوية سبع سنين واشهراً وهو من احسن شيئ سيرة واشده حبا للعافية غير انه لايدع ذم على والوقوع فيه له"

---

[1] الطبری: ص ۱۸۷، ۱۸۸ ج ۴

"ہشام بن محمد نے ابو مخنف سے' اور انہوں نے مجالد بن سعید' صقعب ابن زہیر' فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبۃ مرادی سے راویت کیا ہے کہ ابو مخنف کہتے ہیں کہ ان چاروں نے مجھے آئندہ واقعہ کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے سنائے' لہٰذا حجر بن عدی کندی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ "جب ماہ جمادی ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہؓ کو گورنر بنایا تو انہیں بلا کر پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی' پھر کہا کہ..... میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت چیزوں کی نصیحت کروں' لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھنے' میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح کرنے پر پوری نظر رکھتے ہو' اسلئے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں۔ البتہ تمہیں ایک نصیحت کرنا میں ترک نہیں کر سکتا وہ یہ کہ علیؓ کی مذمت کرنے اور انہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا' عثمانؓ پر رحمت بھیجتے رہنا اور ان کے لئے استغفار کرتے رہنا۔ علیؓ کے اصحاب پر عیب لگانا' انہیں دور رکھنا اور ان کی بات نہ سننا' عثمانؓ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا' انہیں قریب رکھنا اور ان کی باتیں سنا کرنا.... ابو مخنف کہتا ہے کہ صقعب بن زہیر نے کہا کہ میں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا کہ.... مغیرہؓ کوفہ میں' معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے' البتہ وہ علیؓ کی مذمت اور انہیں برا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے۔"

یہ ہے وہ روایت جو مولانا کے مذکورہ بیان کی اصل الاصول ہے۔ اور جسے دیکھ کر مولانا نے صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر نہیں بلکہ خود حضرت معاویہؓ اور ان کے تمام گورنروں پر بلا استثناء الزام لگا دیا ہے کہ وہ بر سر منبر حضرت علیؓ پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو خود اسی روایت میں آگے چل کر صاف لکھا ہوا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کس طرح کیا کرتے تھے؟ ٹھیک اسی صفحہ پر جس پر ابو مخنف کے مذکورہ بالا الفاظ لکھے ہیں' آگے یہ الفاظ بھی ہیں

کہ :

"قام المغیرة فقال فی علی و عثمان کما کان یقول و کانت مقالته اللهم ارحم عثمان بن عفان و تجاوز عنه واجزه باحسن عمله فانه عمل بکتابک واتبع سنة نبیک صلی الله علیه وسلم وجمع کلمتنا و حقن دماء نا وقتل مظلوما اللهم فارحم أنصاره واولیاءه و محبیه والطالبین بدمه ویدعو علی قتلته [1]"

"حضرت مغیرہ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؓ اور عثمانؓ کے بارے میں جو کچھ کہا کرتے تھے وہی کہا۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ یا اللہ عثمانؓ بن عفان پر رحم فرما اور ان سے درگزر فرما اور ان کے بہتر عمل کی انہیں جزا دے' کیونکہ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور ہماری بات ایک کردی' اور ہمارے خون کو بچایا اور مظلوم ہو کر قتل ہوگئے' یا اللہ ان کے مددگاروں' دوستوں' محبت کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما اور وہ ان کے قاتلوں کے لئے بددعا کرتے تھے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت حضرت مغیرہؓ حضرت علیؓ کی ذات پر کوئی شتم نہیں فرماتے تھے' بلکہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے۔ جسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ پر لعن وطعن سے تعبیر کردیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہ کے الفاظ صراحتاً نقل کر رہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تاثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے لیا۔ یا اس تعبیر پر جو "روایت بالمعنی" (INDIRECT NARRATION) میں انہوں نے اختیار کی۔

پھر دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ حافظ ابن جریرؒ نے یہ روایت جس سند کے ساتھ نقل کی ہے' وہ اول سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔

اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلبی ہے جو مشہور راوی محمد بن السائب الکلبی کا بیٹا ہے اس کے بارے میں ابن عساکرؒ کا قول ہے کہ : ۔

---

[1] الطبری ص ۱۸۸: ج ۴

رافضی لیس بثقة

"وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں"[1]

اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن ابی طی نے اسے امامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے اور ابن ابی یعقوب حربیؒ فرماتے ہیں کہ :

راویة للمثالب غاية

"انتہا درجے کی مثالب روایت کرتا ہے۔"

پھر دوسرا راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن عدیؒ فرماتے ہیں :

شیعی محترق صاحب اخبارھم[2]

"جلا بھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔"

تیسرا راوی مجالد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انہیں ضعیف مانا گیا ہے۔ امام یحییٰ بن سعید قطانؒ کے کوئی دوست کہیں جا رہے تھے، انہوں نے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو۔"

انہوں نے کہا۔ "وہب بن جریر کے پاس جا رہا ہوں، وہ سیرت کی کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد سناتے ہیں۔" یحییٰ بن سعید نے فرمایا "تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے۔"[3]

اس کے علاوہ اشج کا قول ہے کہ۔ یہ "شیعہ ہے"[4]

چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو حاتم کا قول ہے کہ فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے

---

[1] لسان المیزان ص ۱۹۶ ج ۶ دائرۃ المعارف ۱۳۳۰ھ

[2] ایضاً ص ۱۹۷ ج ۶

[3] ابو حاتم الرازیؒ: کتاب الجرح والتعدیل ص ۳۶۱ ج ۴ قسم اول، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۷۲ھ و تہذیب التہذیب ایضاً ص ۴۰ ج ۱۰ سن ۱۳۲۶ھ

[4] میزان الاعتدال ص ۴۳۸ ج ۳

اور جو راوی اس سے روایت کرتا ہے وہ متروک ہے۔[1] ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابو مخنف نے کیا ہے، یعنی مقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج، وہ تو سرے سے مجہول ہی ہیں۔[2]

اب آپ غور فرمائیے کہ جس روایت کے تمام راوی ازاول تا آخر شیعہ ہوں، اور ان میں سے بعض نے مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابہ کرامؓ کی طرف بری بھلی باتیں منسوب کریں۔ کیا ایسی روایت کے ذریعے حضرت معاویہؓ یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے خلاف کوئی الزام عائد کرنا سراسر ظلم نہ ہو گا؟ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ: میں نے قاضی ابوبکر بن العربی اور علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کر کے آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کی رد میں لکھی ہیں لہٰذا ان کی حیثیت "وکیل صفائی" کی سی ہو گئی ہے۔[3]

اب مولانا مودودی صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضا ہے کہ "وکیل صفائی" کی بات تو سنی ہی نہ جائے۔ خواہ وہ کتنی ثقہ، قابل اعتماد اور قابل احترام شخصیت ہو، اور دوسری طرف "مدعی" کی بات کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی جھوٹا اور افتراء پرداز ہو؟ قاضی ابوبکر بن عربیؒ اور ابن تیمیہؒ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ کے دشمن نہیں، صرف حضرت معاویہؓ کے ثقہ دوست ہیں۔ دوسری طرف ہشام بن الکلبی اور ابو مخنف حضرت معاویہؓ کے کھلے دشمن ہیں۔ اور ان کی افتراء پردازی ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت ہے، یہ آخر غیر جانب داری کا کون سا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے "حب معاویہؓ" کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دوسرے فریق کی روایات پر ان کے "بغض معاویہؓ" کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مولانا مودودی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

---

[1] میزان الاعتدال ص ۳۴۴ ج ۲ و لسان المیزان ص ۲۵۳ ج ۴

[2] مقعب بن زہیر کو اگرچہ امام ابو زرعہؒ نے ثقہ قرار دیا ہے مگر اس کے بارے میں ابو حاتم رازیؒ فرماتے ہیں شیخ لیس بمشہور (الجرح و التعدیل ص ۲۵۵ ج ۲ قسم ۱) اور فضیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہو مجہول روی عن رجل متروک الحدیث (ص ۷۲ ج ۳ قسم ۲)

[3] خلافت و ملوکیت: ص ۳۲۰

"بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے..... یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے اختیار کئے ہیں..... الخ

پھر آگے لکھتے ہیں۔

"اس لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد' ابن عبدالبر' ابن کثیر' ابن جریر' ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کئے ہیں انہیں رد کر دیا جائے۔ الخ" (ص ۳۱۷ تا ۳۱۹)

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جو روایتیں ان مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کردی ہیں' انہیں بس آنکھ بند کر کے قبول ہی کرلینا چاہیے' تو آخر ان حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنے کی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ کیا اس طرز عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کی صحت و سقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کر دیا' اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھو اور اہم نتائج اخذ کرنے کے لئے صرف ان روایات پر بھروسہ کرو جو تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔ ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں "اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جانے" کی ممانعت کر دی جائے[1] تو خدارا مولانا مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابن

---

[1] پھر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ ابو مخنف' کلبی اور ہشام جیسے لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے تو مولانا اسماء الرجال کی کتابیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں اور دوسرے مورخین کو قابل اعتماد ثابت کرنے کے لئے ص ۳۰۹ سے ۳۲۰ تک وہ بلا تکلف اسماء الرجال ہی کے علماء اور کتابوں کے حوالے دیتے چلے گئے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں کہ کیا جرح و تعدیل صرف ان مورخین ہی کے بارے میں کی جاسکتی ہے جن کی کتابیں اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اور ان سے

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

جریرؒ نے جو یہ نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام (معاذ اللہ) اوریا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے اس لئے اسے متعدد خطرناک جنگی مہمات پر روانہ کر کے اسے مروا دیا پھر اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ اسے رد کر دینے کی آخر کیا وجہ ہے؟ نیز ابن جریرؒ نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں' ان میں ترجیح آخر کس بناء پر دی جا سکے گی۔

تطویل سے بچنے کے لئے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیار صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے بر سر منبر حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اس لئے مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں ناقابل قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مولانا کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ روایت قطعی طور پر ناقابل اعتماد ہے :

۱۔ اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں' اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو حضرت معاویہؓ پر طعن کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

۲۔ اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں' اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجہ میں شاید قابل قبول ہو سکتی ہو۔ لیکن اس کے ذریعے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہو سکتی جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو[۱]۔

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

اوپر کے مؤرخین کے حالات کی چھان بین نہیں کرنی چاہئے؟ یا اسماء الرجال کی کتابوں میں سے مورخین کی' صرف تعدیل ہی نقل کی جا سکتی ہے اور "جرح" نقل کرنا ممنوع ہے؟ یا صرف ان مورخین کے حالات اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھنے چاہئیں جو ثقہ ہیں اور مجروح مورخین کے حالات کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع نہ کرنا چاہئے؟ ان میں سے کون سی بات ہے جسے صحیح کہا جائے؟

[۱] مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: "بعض حضرات اس معاملے میں یہ نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

۳۔ یہ روایت درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی' اس لئے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت معاویہؓ کے حکم سے سات سال سے زائد مدت تک منبروں پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر "سب وشتم کی بوچھاڑ" کرتے رہے تو :

(الف) اس "سب و شتم" کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں۔ یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

(ب) کیا پوری امت اسلامیہ اپنے "خیر القرون" میں ایسے اہل جرأت اور اہل انصاف سے قطعی طور پر خالی ہو گئی تھی جو اس "مکروہ بدعت" سے حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں کو روکتے' کیا حضرت حجر بن عدیؓ کے علاوہ کوئی باغیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

(ج) عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے۔ حضرت معاویہؓ کے عقل و تدبر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہو گا' کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان جیسا صاحب فراست انسان محض بغض کے جذبات میں بہہ کر ایک ایسا بے فائدہ اقدام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے؟ کوفہ حضرت علیؓ کے معتقدین کا مرکز

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

کہ ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو ان کی شان کے مطابق ہو اور ہر اس بات کو رد کر دیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو خواہ وہ کسی صحیح حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو" (ص ۳۰۵) ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کے معترضین میں سے کسی نے یہ "قاعدہ کلیہ" بیان کیا بھی ہے یا نہیں' بہرحال ہم اس قاعدہ کلیہ کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ درست مانتے ہیں۔ ہماری نظر میں قاعدہ یہ ہے کہ "ہر اس ضعیف روایت کو رد کر دیا جائے گا جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو' خواہ وہ روایت تاریخ کی ہو۔ یا حدیث کی" ہمارا خیال ہے کہ مولانا کو اس "قاعدہ کلیہ" پر کوئی اشکال نہ ہونا چاہئے' اس لئے کہ بقول حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ "صحابہؓ" کی عدالت قرآن' سنت متواترہ اور اجماع سے ثابت ہے اور اس کے خلاف کوئی بات ضعیف روایات کے بل پر ثابت نہیں کی جا سکتی۔

تھا۔ کیا حضرت معاویہؓ ان کے سامنے حضرت علیؓ پر سب و شتم کروا کر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد بھی اہل کوفہ سے برابر لڑائی ٹھنی رہے اور وہ کبھی دل سے حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست دان بھی کبھی یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلاوجہ اسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔[1]

ان وجوہ کی بناء پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابل قبول ہے۔ دوسری روایت جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے البدایہ والنہایہ کی ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ولما كان (مروان) متوليا على المدينة لمعاوية كان يسب عليا كل جمعة على المنبر' وقال له الحسن بن علي: لقد لعن الله اباك الحكم وانت في صلبه على لسان نبيه فقال: لعن الله الحكم وما ولد والله اعلم"

"جب مروان مدینہ منورہ میں حضرت معاویہؓ کا گورنر تھا' اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر سب و شتم کیا کرتا تھا' اور اس سے حضرت حسن بن علیؓ نے فرمایا کہ : تیرے باپ حکم پر اللہ نے اپنے نبیؐ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا' اور یہ کہا تھا کہ حکم اور اس کی اولاد پر خدا کی لعنت ہو۔[2]

---

[1] جناب مولانا مودودی صاحب تو اس قسم کے درایتی قرائن کی بناء پر بالکل صحیح الاسناد احادیث کو بھی رد کر دینے کے قائل ہیں' چنانچہ حضرت سلیمانؑ کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد ماننے کے باوجود مولانا نے اس لئے رد کر دیا ہے کہ وہ درایت کے اس جیسے قرائن کے خلاف ہے' حالانکہ وہ حدیث بھی کوئی "احکامی حدیث" نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہی ہے' کیا اس موقع پر وہ درایت کے ان قرائن کی بناء پر ایک سراسر ضعیف روایت کو رد نہیں فرمائیں گے؟

[2] البدایہ والنہایہ ص ۲۵۹ ج ۸

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے[1] لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منورہ کی گورنری کے دوران حضرت علیؓ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علیؓ کو محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گذرتے تھے لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ :

"ان رجلاً جاء الی سھل بن سعد فقال ھذا فلان لامیر المدینۃ یدعو علیا عند المنبر قال فیقول ماذا قال یقول لہ ابو تراب فضحک و قال واللہ ما سماہ الا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وما کان لہ اسم احب الیہ منہ"

"ایک شخص حضرت سہلؓ کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ کو سب و شتم کرتا ہے، حضرت سہلؓ نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ انہیں "ابو تراب" کہتا ہے۔ حضرت سہلؓ ہنس پڑے اور فرمایا خدا کی قسم اس نام سے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکارا ہے اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔"[2]

اگر یہاں "امیر مدینہ" سے مراد مروان ہی ہے، جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو اس "سب و شتم" کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ابو تراب کے معنی ہیں "مٹی کا باپ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارا کرتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہوگا۔ اگر فرض کیجئے کہ مروان اس سے بھی زیادہ کچھ نازیبا الفاظ حضرت علیؓ کی شان میں استعمال کرتا تھا تو آخر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ یہ کام حضرت معاویہؓ کے حکم سے کرتا تھا۔ مولانا نے البدایہ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے، اس

---

[1] اول تو اس لئے کہ یہ پوری عبارت البدایہ و النہایہ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے دوسرے اس لئے کہ اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں۔

[2] صحیح بخاری کتاب المناقب، باب مناقب علیؓ ص ۵۲۵ جلد اول اصح المطابع کراچی

میں بھی کہیں یہ مذکور نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اس کام کا حکم دیا تھا یا وہ اس کے اس فعل پر راضی تھے۔ ایسی صورت میں یہ الفاظ لکھنے کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت معاویہؓ :

"خود 'اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔"

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ :

۱۔ خود حضرت معاویہؓ کی طرف سب و شتم کی جو نسبت مولانا نے کی ہے' اس کا تو کوئی ادنیٰ ثبوت بھی مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں' بلکہ کہیں نہیں ہے اور اس کے برعکس حضرت معاویہؓ سے حضرت علیؓ کی تعریف وتوصیف کے جملے منقول ہیں۔

۲۔ اسی طرح تمام گورنر کا جو لفظ مولانا نے استعمال کیا ہے وہ بھی بالکل بلا دلیل ہے' مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں صرف دو گورنروں کا ذکر ہے۔

۳۔ ان دو گورنروں میں سے ایک یعنی مروان بن الحکم کے بارے میں مولانا کے دیئے ہوئے حوالے کے اندر یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ پر سب وشتم کیا کرتا تھا۔

۴۔ سب و شتم کی بوچھاڑ کا لفظ بھی بلا دلیل ہے' اس لئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے حوالے میں تو سب و شتم کے الفاظ منقول نہیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انہیں "سب وشتم" کھینچ تان کر ہی کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ دوسرے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں مولانا نے حوالہ صحیح دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ روایت از اول تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت ودرایت ہر اعتبار سے واجب الرد ہے۔

استلحاق زیاد

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ :

"زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی' زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابو سفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی' حضرت ابو سفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ زیاد ان ہی کے نطفہ سے ہے' جوان ہو کر یہ شخص اعلیٰ درجے کا مدبر' منتظم' فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا' حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں' ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا ولد الحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا مکروہ ہے' وہ تو ظاہر ہی ہے مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل ہے۔ کیوں کہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ "بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں۔" ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے پردہ فرمایا۔" (ص ۱۷۵)

مولانا نے جس افسوسناک انداز سے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے اس پر کوئی تبصرہ سوائے اس کے نہیں کیا جا سکتا کہ اصل تواریخ کی عبارت نقل کر دی جائے۔ قارئین دونوں کا مقابلہ کر کے خود جو چاہیں فیصلہ کر لیں۔

مولانا نے اس واقعے کے لئے چار کتابوں کے حوالے دیئے۔ (الاستیعاب ج ۱ ص ۱۹۶' ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۲۰' ۲۲۱' البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۸ اور ابن خلدون ج ۳ ص ۷' ۸) ان میں سے البدایہ والنہایہ میں تو اس واقعے کے سلسلے میں کل سات ہی سطریں لکھی ہیں' جن سے واقعہ کی کوئی تفصیل ہی نہیں معلوم ہوتی' باقی تین کتابوں میں سے جس کتاب میں یہ واقعہ سب

سے زیادہ مرتب طریقے پر بیان کیا گیا وہ ابن خلدون کی تاریخ ہے جس کا حوالہ مولانا نے سب سے آخر میں دیا ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"سمیہ[1] جو زیاد کی ماں ہے حارث بن کلدہ طبیب کی لونڈی تھی' اسی کے پاس اس سے حضرت ابو بکرہؓ پیدا ہوئے پھر اس نے اس کی شادی اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کردی تھی' اور اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا (واقعہ یہ تھا کہ) ابو سفیان اپنے کسی کام سے طائف گئے ہوئے تھے' وہاں انہوں نے سمیہ سے اس طرح کا نکاح کیا جس طرح کے نکاح جاہلیت میں رائج تھے' اور اس سے مباشرت کی' اسی مباشرت سے زیاد پیدا ہوا اور سمیہ نے زیاد کو ابو سفیان سے منسوب کیا' خود ابو سفیان نے بھی اس نسب کا اقرار کرلیا تھا مگر خفیہ طور پر۔"

آگے لکھتے ہیں :

جب حضرت علیؓ شہید ہو گئے اور زیاد نے حضرت معاویہؓ سے صلح کرلی تو زیاد نے مصقلہ بن ہبیرۃ شیبانی کو مامور کیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کو ابو سفیان کے نسب کے بارے میں بتلائیں' اور حضرت معاویہؓ کی رائے یہ ہوئی کہ اسے استلحاق کے ذریعہ مائل کریں' چنانچہ انہوں نے ایسے گواہ طلب کئے جو اس بات سے واقف ہوں کہ زیاد کا نسب ابو سفیان سے لاحق ہو چکا ہے' چنانچہ بصرہ کے باشندوں میں سے کچھ لوگوں نے اس بات کی گواہی دی اور اکثر شیعان علیؓ اس بات کو برا سمجھتے تھے یہاں تک کہ ان کے بھائی حضرت ابو بکرہؓ بھی"[2]

---

[1] کانت سمیۃ ام زیاد مولاۃ للحارث بن کلدۃ الطبیب' وولدت عندہ ابابکرۃ ثم زوجھا بمولیٰ لہ وولد زیادا وکان ابوسفیان قد ذھب الی الطائف فی بعض حاجاتہ فاصابھا بنوع من انکحۃ الجاھلیۃ وولدت زیاداً ھذا ونسبتہ الی ابی سفیان واقرلھا بہ الا انہ کان بخفیۃ (تاریخ ابن خلدون ص ۱۴ ج ۳ دار الکتاب اللبنانی' بیروت ۱۹۵۷ء)

[2] ولما قتل علیؓ وصالح زیاد معاویۃ' وضع مصقلۃ بن ھبیرۃ الشیبانی علی معاویۃ لیعرض

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے

مولانا کا دوسرا ماخذ کامل ابن اثیر ہے، علامہ ابن اثیر جزریؒ نے شروع میں تو بس یہی لکھا ہے کہ حضرت ابو سفیانؓ نے جاہلیت میں سمیّہ سے مباشرت کی تھی، پھر اس مباشرت کے بارے میں بھی بڑی داستان طرازیاں نقل کی ہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ :

"اس کے علاوہ[۱] بھی بڑے قصّوں نے رواج پایا جن کے ذکر سے کتاب طویل ہو جائے گی اس لئے ہم ان سے اعراض کرتے ہیں، اور جو لوگ حضرت معاویہؓ کو معذور قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا استلحاق اس لئے کیا تھا کہ جاہلیت میں نکاح کی بہت سی قسمیں تھیں ان سب قسموں کو ذکر کرنے کی تو ضرورت نہیں، البتہ ان میں سے ایک قسم یہ تھی کہ کسی کسبی عورت سے بہت سے لوگ مباشرت کرتے تھے، پھر جب وہ حاملہ ہو کر بچہ جنتی تو اس بچے کو جس کی طرف چاہتی منسوب کر دیتی تو وہ اس کا بیٹا قرار پا جاتا، جب اسلام آیا تو نکاح کا یہ طریقہ حرام ہو گیا، لیکن نکاح کے جاہلی طریقوں میں سے جس طریقے سے بھی کوئی بچہ کسی باپ کی طرف منسوب ہوا ہو، اسلام کے بعد بھی اس کو اس نسب پر برقرار رکھا گیا اور ثبوت نسب کے معاملے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔"

ابن خلدونؒ اور ابن اثیرؒ کے ان بیانات سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ حضرت ابو

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

بنسب ابی سفیان ففعل، و رأی معاویۃ ان یستمیلہ باستلحاقہ فالتمس الشھادۃ بذلک ممن علم لحوق نسبہ بابی سفیان فشھد لہ رجال من اھل البصرۃ والحقہ، وکان اکثر شیعۃ علیؓ ینکرون ذلک و ینقمونہ علی معاویۃ حتی اخوہ ابوبکرۃ **(ابن خلدون ص ۱۵ - ج ۳)**

[۱] وجری اقاصیص یطول بذکرھا الکتاب فاضربنا عنھا و من اعتذر لمعاویۃ قال انما استلحق معاویۃ زیاداً لان انکحۃ الجاھلیۃ کانت انواعاً لا حاجۃ الی ذکر جمیعھا وکان منھا ان الجماعۃ یجامعون البغی فاذا حملت وولدت الحقت الولد بمن شاءت منھم فیلحقہ، فلما جاء الاسلام حرم ھذا النکاح الا انہ اقر کل ولد کان ینسب الی اب من ای نکاح کان من انکحتھم علی نسبہ ولم یفرق بین شیئ منھا **(کامل ابن اثیر: ص ۱۷۷ ج ۳ طبع قدیم)** اس کے بعد کی عبارت اور اس پر تبصرہ آگے آ رہا ہے۔

سفیانؓ نے طائف میں سمیہ سے زنا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا نکاح کیا تھا جو جاہلیت میں جائز سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسے ممنوع تو کر دیا مگر اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو غیر ثابت النسب یا ولد الحرام قرار نہیں دیا' لیکن آگے چل کر ابن اثیر جزریؒ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ :

"حضرت معاویہؓ یہ سمجھے کہ یہ استلحاق جائز ہے' اور انہوں نے جاہلیت اور اسلام کے استلحاق میں فرق نہیں کیا۔ اور یہ فعل نا قابل قبول ہے۔ کیوں کہ اس فعل کے منکر ہونے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور اسلام میں اس طرح کا استلحاق کسی نے نہیں کیا کہ اسے حجت قرار دیا جائے۔"

لیکن واقعات کی مجموعی تحقیق کرنے سے ابن اثیر جزریؒ کا یہ اعتراض بھی بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگر حضرت ابو سفیانؓ نے جاہلی نوع کا ایک نکاح کرنے کے بعد زیاد کو اسلام سے قبل اپنا بیٹا قرار نہ دیا ہوتا اور وہ خود اسلام کے بعد اسے اپنا بیٹا بنانا چاہتے تب تو یہ اعتراض درست ہوتا کہ حضرت معاویہؓ نے جاہلیت اور اسلام کے استلحاق میں فرق نہیں کیا' یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو سفیانؓ نے زمانہ جاہلیت ہی میں اپنے ساتھ زیاد کا استلحاق کر لیا تھا۔ البتہ عام لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ابن خلدونؒ صاف لکھتے ہیں کہ :

"وولدت زیاداً ھنا و نسبته الی ابی سفیان واقر لھا به الا انه کان بخفیة"

سمیہ کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس نے اسے ابو سفیانؓ سے منسوب کیا اور ابو سفیانؓ نے بھی اس نسب کا اقرار کیا' مگر خفیہ طور پر"[1]

زیاد چوں کہ حضرت ابو سفیانؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا'[2] اس لئے یہ استلحاق یقیناً اسلام سے پہلے ہوا تھا۔ البتہ اس کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوا تھا۔ جب

---

[1] ابن خلدون : ص ۱۴ ج ۳

[2] کیونکہ حضرت ابو سفیانؓ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور زیاد کی ولادت کے بارے میں چار قول ہیں۔ ہجرت سے پہلے' ہجرت کے سال' غزوہ بدر کے دن' اور ٹھیک فتح مکہ کے سال (استیعاب ص ۵۴۸ ج ۱)

حضرت معاویہؓ کے سامنے دس گواہوں نے (جن میں بعض جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے) اس بات کی گواہی دی کہ حضرت ابو سفیانؓ نے اپنے ساتھ زیاد کے نسب کا اقرار کیا تھا۔ تب حضرت معاویہؓ نے ان کے لئے اس نسب کا اعلان کیا' مشہور محدث حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"حضرت معاویہؓ نے ۴۴ھ میں ان (زیاد) کا استلحاق کیا' اور اس بات پر زیاد[1] بن اسماء الحرمازی' مالک[2] بن ربیعہ سلولیؓ اور منذر[3] بن زبیر نے شہادت دی تھی' یہ بات مدائنیؒ نے اپنی مختلف سندوں سے روایت کی ہے اور گواہوں میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے' جویریہ[4] بنت ابی سفیان' مسور[5] بن قدامہ الباہلی' ابن[6] ابی نصر الثقفی' زید[7] بن نفیل الازدی' شعبتہ[8] بن العلقم المازنی' بنو عمرو[9] بن شیبان کا ایک شخص' اور بنو[10] المصطلق کا ایک شخص' ان سب نے ابو سفیانؓ کے بارے میں گواہی دی کہ زیاد ان کا بیٹا ہے البتہ منذر نے گواہی یہ دی تھی کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ابو سفیانؓ نے یہ بات کہی تھی۔ پھر حضرت معاویہؓ نے خطبہ دیا اور زیاد کا استلحاق کر لیا۔ پھر زیاد بولے' اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ ان گواہوں نے کہا ہے اگر وہ حق ہے تو الحمد للہ! اور اگر یہ غلط ہے تو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان ان لوگوں کو ذمہ دار بنا دیا ہے۔"[1]

حافظ ابن حجرؒ نے دسویں گواہ کا نام نہیں لکھا ہے' بلکہ "بنو المصطلق کا ایک شخص" کہا ہے' ابو حنیفہ الدینوریؒ (متوفی ۲۸۲ھ) نے ان کا نام یزید لکھا ہے' اور ان کی گواہی اس طرح نقل کی ہے۔

"انہ سمع اباسفیان یقول ان زیادا من نطفۃ اقرھا فی رحم امہ سمیۃ' فتم ادعاؤہ ایاہ"[2]

---

[1] الاصابہ ص ۵۶۳ ج ۱' المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ' القاہرہ ۱۳۵۸ھ "زیاد بن ابیہ"

[2] الدینوریؒ: الاخبار الطوال: ص ۲۱۹ تحقیق عبد المنعم عامر' الادارۃ العامۃ للثقافۃ' القاہرہ ۱۹۶۰ء

میں نے ابو سفیانؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ زیاد اس نطفے سے ہے جو میں نے اس کی ماں سمیّہ کے رحم میں ڈالا تھا' لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ ابو سفیانؓ نے زیاد کے حق میں اپنا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔"

جن گواہوں کے نام حافظ ابن حجرؒ نے مدائنیؒ کے حوالے سے لکھے ہیں ان میں حضرت مالک بن ربیعہ سلولیؓ صحابہؓ میں سے ہیں اور بیعت رضوان میں شریک رہے ہیں۔[1] ان حالات میں ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا جو استلحاق دس گواہوں کی گواہی پر مجمع عام میں کیا' اس میں شریعت کے کون سے مسلّمہ قاعدے کی خلاف ورزی ہوئی' جبکہ ابن اثیر جزریؒ کی تصریح کے مطابق جاہلی نکاح سے جاہلیت میں پیدا ہونے والی اولاد کو اسلام میں غیر ثابت النسب قرار نہیں دیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ :

"اما واللہ لقد علمت العرب انی کنت اعزھا فی الجاھلیۃ وان الاسلام لم یزدنی الا عزا وانی لم اتکثر بزیاد من قلۃ ولم اتعزز بہ من ذلۃ ولکن عرفت حقا لہ فوضعتہ موضعہ[2]"

"خدا کی قسم! تمام عرب جانتے ہیں کہ جاہلیت میں مجھے تمام عربوں سے زیادہ عزت حاصل تھی' اور ظاہر ہے کہ اسلام نے بھی میری عزت میں ہی اضافہ کیا ہے' لہٰذا نہ تو ایسا ہے کہ میری نفری قلیل ہو اور میں نے زیاد کے ذریعہ اس میں اضافہ کر لیا ہو' اور نہ کبھی میں ذلیل تھا کہ زیاد کی وجہ سے مجھے عزت مل گئی ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ میں نے اس کا حق سمجھا ہے اور اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا ہے۔"

کیا مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں حضرت معاویہؓ کے اس حلفیہ بیان کے بعد (جسے مولانا مودودی نے یقیناً ابن اثیر اور ابن خلدون کی تواریخ میں دیکھا ہوگا) یہ کہنے کی کوئی

---

[1] الاصابہ ص ۳۲۴ ج ۳'

[2] ابن الاثیر ص ۱۷۶ ج ۳ طبع قدیم' الطبری ص ۱۴۳ ج ۴ مطبعۃ الاستقامہ بالقاہرہ ۱۳۵۸ھ و ابن خلدونؒ ص ۲۶ ج ۳ دار الکتاب اللبنانی' بیروت ۱۹۵۷ء تینوں نے یہ مقولہ نقل کیا ہے البتہ ابن خلدون نے صرف خط کشیدہ جملہ لکھا ہے اور اس میں "حق اللہ" کے الفاظ ہیں۔

گنجائش باقی رہتی ہے کہ :

"زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔(ص : ۱۷۵)

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جو حضرات حضرت معاویہؓ کے اس فعل پر اعتراض کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ زیاد تو زنا سے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کا نسب حضرت ابو سفیانؓ سے لاحق نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بجائے ان کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت ابو سفیانؓ نے سمیہ سے مباشرت ہی نہیں کی، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت کا بڑا شہرہ ہے لیکن کسی بندۂ خدا نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی وجہ اعتراض کیا تھی؟ حافظ ابن عبد البرؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے :

لا واللہ ما علمت سمیۃ رأت ابا سفیان قط

"نہیں، خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ سمیہ نے کبھی ابو سفیانؓ کو دیکھا بھی ہے۔[۱]

اور عبد الرحمان بن الحکم نے اس موقع پر حضرت معاویہؓ کی ہجو میں جو شعر کہے تھے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔

واشھد انھا حملت زیاداً وصخر من سمیۃ غیر دان [۲]

یعنی "میں گواہی دیتا ہوں کہ سمیہ کے بطن میں زیاد کا استقرار حمل اس حالت میں ہوا تھا کہ صخر (ابو سفیانؓ) سمیہ کے قریب بھی نہیں تھا۔"

اور ابن مفرغ نے کہا تھا۔

شھدت بان امک لم تباشر ابا سفیان واضعۃ القناع [۳]

"میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری ماں نے کبھی اوڑھنی اتار کر ابو سفیان کے ساتھ مباشرت ہی نہیں کی۔"

---

[۱] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۵۵۰ ج ۱

[۲] ایضاً ص ۵۵۱ ج ۱ [۳] الاستیعاب ص ۵۵۲ ج ۱

اور وہ ابن عامر جنھیں ایک خاص وجہ سے اس استلحاق کو ناجائز قرار دینے کی سب سے زیادہ خواہش تھی، انہوں نے بھی ایک شخص کے سامنے بس اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ :

"لقد هممت ان آتي بقسامة من قريش يحلفون ان ابا سفيان لم ير سمية"

"میرا ارادہ ہے کہ میں قریش کے بہت سے قسم کھانے والوں کو لاؤں جو اس بات پر قسم کھائیں کہ ابوسفیانؓ نے کبھی سمیّہ کو دیکھا تک نہیں۔"[1]

سوال یہ ہے کہ یہ تمام معترضین اس بات کو ثابت کرنے پر کیوں زور لگا رہے تھے کہ حضرت ابوسفیانؓ کبھی سمیّہ کے قریب تک نہیں گئے، انہوں نے سیدھی بات یہ کیوں نہیں کہی کہ ابوسفیانؓ اگر سمیّہ کے قریب گئے بھی ہوں تو یہ سراسر زنا تھا، اور زنا سے کوئی نسب ثابت نہیں ہوتا، یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ابوسفیانؓ نے سمیّہ سے جاہلیت میں مبینہ مباشرت کی تھی تو پھر ان کو بھی زیاد کے استلحاق میں کوئی اعتراض نہیں تھا، ان کو اعتراض صرف یہ تھا کہ ان کے علم کے مطابق ابوسفیانؓ سمیّہ کے قریب تک نہیں گئے، اس لئے زیاد کا استلحاق درست نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ علم حضرت معاویہؓ پر حجت نہیں ہو سکتا۔ حضرت معاویہؓ کے پاس دس قابل اعتماد شہادتیں اثبات پر گزر چکی تھیں ان کے مقابلے میں یہ حضرات ہزار بار نفی پر شہادت دیں تو شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم پر تو اس واقعہ کی تمام تفصیلات پڑھنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبۂ احترامِ شریعت کا غیر معمولی تاثر قائم ہوا ہے۔ غور فرمائیے کہ حضرت معاویہؓ کی شرافت اور فضیلت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ایک معمولی آدمی کے نفس کے لئے بھی یہ بات کس قدر ناگوار ہوتی ہے کہ جس شخص کو کل تک ساری دنیا ولد الحرام اور غیر ثابت النسب کہتی اور سمجھتی آئی تھی آج اسے اپنا بھائی بنا لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ، سردار اور سردار زادے کیلئے یہ بات کس قدر شاق ہوگی؟ لیکن جب دس گواہوں کے بعد ایسے شخص کو اپنا بھائی قرار دینا "حق اللہ" بن جاتا ہے تو وہ اپنے تمام

---

[1] الطبری ص ۱۶۳ ج ۴

جذبات کو ختم کرکے اور مخالفین کی کھڑی ہوئی صعوبتوں کو جھیل کر پکار اٹھتے ہیں کہ :

عرفت حق اللہ فوضعتہ موضعہ

"میں نے اللہ کے حق کو پہچان لیا۔ اس لئے اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا۔" [۱]

یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے جن معترضین کو اصل واقعے کا علم ہوتا گیا' انہوں نے اپنے اعتراضات سے رجوع کرلیا۔ حافظ ابن عبدالبرؒ ہی نے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمان بن الحکم اور ابن مفرغ جنھوں نے اس واقعہ پر حضرت معاویہؓ کے حق میں ہجویہ اشعار کہے تھے حضرت معاویہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کے بعد انہوں نے بھی اپنے سابقہ رویہ پر شرمندگی ظاہر کی [۲]' نیز وہ ابن عامر جن کے بارے میں حافظ ابن جریرؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس استلحاق کی مخالفت کرنے کے لئے نفی پر گواہیاں جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا' طبری ہی کی تصریح کے مطابق وہ بھی بعد میں حضرت معاویہؓ سے معافی مانگنے آئے تھے اور حضرت معاویہؓ نے انہیں معاف کردیا تھا۔ [۳]

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی شروع میں اس استلحاق کے خلاف تھیں۔ ابن خلدونؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ زیاد نے حضرت عائشہ کو "زیاد بن ابی سفیان" کے نام سے خط لکھا' مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی جواب میں "زیاد بن ابی سفیان" لکھ دیں گی تو اسے اپنے استلحاق نسب کی سند مل جائے گی۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے جواب میں یہ الفاظ لکھے کہ :

"من عائشۃ ام المومنین الی ابنھا زیاد"

"تمام مومنین کی ماں کی طرف سے اپنے بیٹے زیاد کے نام۔" [۴]

لیکن بعد میں جب حقیقت حال سامنے آئی تو خود حضرت عائشہؓ نے زیاد کو "زیاد بن ابی سفیان" کے نام سے خط لکھا۔ حافظ ابن عساکرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مرہ قبیلے کے

---

[۱] ابن خلدون' ص ۱۶ ج ۳

[۲] الاستیعاب ص ۵۵۱ تا ۵۵۵ ج ۱ (تحت الاصابہ)

[۳] الطبری ص ۱۶۳ ج ۴

[۴] ابن خلدونؒ ص ۱۶ ج ۳

لوگ زیاد کے پاس حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سفارشی خط لے جانا چاہتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ زیاد کو "ابن ابی سفیان" لکھتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے حضرت عائشہؓ نے صاف یہ الفاظ لکھے کہ :

"من عائشۃ ام المومنین الی زیاد بن ابی سفیان"

"ام المومنین عائشہؓ کی طرف سے ابوسفیان کے بیٹے زیاد کے نام" [1]

جب زیاد کے پاس یہ خط پہنچا تو اس نے خوش ہو کر یہ خط مجمع عام میں سنایا۔

ان حالات میں ہمیں یہ توقع رکھنا بے محل نہیں کہ مولانا مودودی صاحب بھی مجموعی صورتحال سے واقف ہونے کے بعد اپنے اس اعتراض سے رجوع کرلیں گے' اور انہوں نے اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ جو سخت اور مکروہ اسلوب بیان اختیار فرمایا ہے اس پر ندامت کا اظہار فرمائیں گے.......؟

---

[1] تہذیب ابن عساکر ص ۴۱۱ ج ۵ مطبعۃ الروضہ' الشام ۱۳۳۲ھ

گورنروں کی زیادتیاں

حضرت معاویہؓ پر چھٹا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :

"حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کردیا۔" (ص ۱۷۵)

حضرت معاویہؓ کے بارے میں اس "کلیہ" کا استنباط مولانا نے چھ واقعات سے کیا ہے' پہلا واقعہ وہ یوں نقل فرماتے ہیں :

"ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا' ایک شخص نے دوران خطبہ میں اس کو کنکر مار دیا' اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے' حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کردوں گا مگر میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔" (ص ۱۷۵' ۱۷۶)

مولانا نے یہاں بھی واقعے کے انتہائی اہم جزو کو حذف کرکے قصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جس سے حضرت معاویہؓ کے بارے میں نہایت غلط اور خلاف واقعہ تاثر قائم ہوتا ہے۔ مولانا نے اس واقعے کے لئے ابن کثیرؒ (ص ۷۱ ج ۸) اور ابن اثیرؒ کا حوالہ دیا ہے' یہاں ہم ابن کثیرؒ کی پوری عبارت نقل کردیتے ہیں۔ مولانا کی عبارت کا اس سے مقابلہ کرلیا جائے

"اسی[1] سال میں حضرت معاویہؓ نے عبداللہ بن غیلان کو بصرہ سے معزول کر کے اس کی جگہ عبیداللہ بن زیاد کو مقرر کیا۔ اور حضرت معاویہؓ نے ابن غیلان کو جو معزول فرمایا' اس کا سبب یہ تھا کہ ایک مرتبہ وہ خطبہ دے رہا تھا کہ بنو ضبہ کے کسی شخص نے اس کو کنکر مار دیا' اس نے اس شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا اس کے بعد اس شخص کی قوم کے لوگ ابن غیلان کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر امیر المومنین کو یہ معلوم ہوگیا کہ تم نے اس کا ہاتھ اس وجہ سے کاٹا تھا تو وہ اس کے اور اس کی قوم کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حجر بن عدی کے ساتھ کیا تھا' اس لئے تم ہمیں ایک تحریر لکھ دو جس میں یہ تحریر ہو کہ تم نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی بنا پر کاٹا تھا' ابن غیلان نے ان کو یہ تحریر لکھ دی' ان لوگوں نے کچھ عرصہ تک یہ تحریر اپنے پاس رکھی' پھر حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے' اور شکایت کی کہ آپ کے گورنر نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی وجہ سے کاٹ دیا ہے' لہٰذا اس سے ہمیں قصاص دلوایئے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میرے گورنروں سے قصاص کی تو کوئی سبیل نہیں لیکن دیت لے لو چنانچہ انہیں حضرت معاویہؓ نے دیت دلوائی اور ابن غیلان کو معزول کر دیا۔"

الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ بالکل یہی واقعہ علامہ ابن اثیر جزریؒ نے بھی نقل کیا ہے' ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ جو شخص قصاص اور دیت کے شرعی قوانین سے واقف ہو' وہ اس واقعہ کو پڑھ کر حضرت معاویہؓ کے اس فیصلہ پر کوئی ادنیٰ اعتراض کس طرح

---

[1] ثم دخلت سنة خمس و خمسين فيها عزل معاوية عبدالله بن غيلان عن البصرة وولى عليها عبيدالله بن زياد و كان سبب عزله ... ية ابن غيلان عن البصرة انه كان يخطب الناس فحصبه رجل من بني ضبة فامر بقطع يده فجاء قومه اليه فقالوا له : انه متى بلغ امير المومنين انك قطعت يده في هذا الصنع فعل به و بقومه نظير ما فعل بحجر بن عدى فاكتب لنا كتابا انك قطعت يده في شبهة فكتب لهم فتركوه عندهم حينا ثم جاءوا معاوية فقالوا له ان نائبك قطع يد صاحبنا في شبهة فاقدنا منه قال : لا سبيل الى القود من عمالي ولكن الدية فاعطاهم الدية و عزل ابن غيلان (البدایہ ص ۷۱ ج ۸)

کر سکتا ہے؟

اس واقعہ میں صاف تصریح ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سامنے بنو ضبہ کے لوگوں نے ابن غیلان کے تحریری اقرار کے ساتھ مقدمے کی جو صورت پیش کی وہ یہ تھی کہ ابن غیلان نے ایک شخص کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا ہے۔

"شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا" اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے، قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر سرقہ کا الزام ہو اور اس کے ثبوت میں کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی پیش آجائے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف ہو جاتی ہے اور شبہ کا فائدہ (Benefit of doubt) ملزم کو دیا جاتا ہے، اگر ایسی صورت میں کوئی حاکم غلطی سے ملزم پر سزا جاری کر کے ہاتھ کاٹ دے تو کہا جاتا ہے کہ "اس نے شبہ میں ہاتھ کاٹ دیا ہے"

"شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا" بلاشبہ حاکم کی سنگین غلطی ہے، لیکن اس غلطی کی بناء پر کسی کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں ہے کہ اس حاکم سے قصاص لینے کے لئے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے۔ کیونکہ شبہ کا فائدہ اس کو بھی ملتا ہے۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی حاکم غلطی سے کسی شخص پر شبہ میں سزا جاری کر دے تو حاکم سے قصاص نہیں لیا جاتا۔ اس کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر حاکموں کے ایسے فیصلوں کے وجہ سے ان پر حد جاری کی جایا کرے یا ان سے قصاص لیا جانے لگے تو اس اہم منصب کو کوئی قبول نہیں کریگا۔ کیونکہ انسان سے ہر وقت غلطی کا احتمال ہے۔ اس بات کو حضرت معاویہؓ نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا ہے کہ:

"میرے گورنروں سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں"

پھر چونکہ اس واقعہ سے ایک طرف اس شخص کو نقصان پہنچا تھا جس کا ہاتھ کاٹا گیا، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اسے دیت دلوادی اور دوسری طرف حاکم کی نااہلیت بھی ظاہر ہو گئی تھی، اس لئے اسے معزول کر دیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ محض اس بناء پر ابن غیلان سے قصاص نہیں لے رہے تھے کہ وہ ان کے گورنر ہیں تو انہیں معزول کیوں فرمایا؟ اور معزول کرنے کے بعد تو وہ گورنر نہیں رہے تھے، پھر ان سے قصاص کیوں نہیں لیا؟

اس پر حیرت کا اظہار کیجئے یا افسوس کا، کہ ابن اثیرؒ اور ابن کثیرؒ (جن کے حوالے سے

مولانا مودودی صاحب نے یہ واقعہ نقل کیا ہے) دونوں نے ابتداء ہی معزولی کے بیان سے کی ہے' اور غیر مبہم الفاظ میں بتلایا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سامنے ملزم کے اقرار کے ساتھ مقدمہ کس طرح پیش ہوا تھا؟ مگر مولانا نہ تو معزولی کا ذکر کرتے ہیں اور نہ پیش ہونے والے مقدمے کی صحیح نوعیت کا۔ اور صرف حضرت معاویہؓ کا یہ جملہ نقل کر دیتے ہیں کہ :

"میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔"

اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ :

"حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا"

اس کے بعد دوسرا واقعہ مولانا نے طبری اور ابن اثیر کے حوالے سے یہ بیان فرمایا ہے کہ زیاد نے ایک مرتبہ بہت سے آدمیوں کے ہاتھ صرف اس جرم میں کاٹ دیئے تھے کہ انہوں نے خطبہ کے دوران اس پر سنگ باری کی تھی' یہ واقعہ بلاشبہ اسی طرح طبری اور ابن اثیر میں موجود ہے لیکن اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو یہ زیاد کا ذاتی فعل تھا۔ حضرت معاویہؓ پر اس کا الزام اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ کسی تاریخ میں یہ موجود نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور انہوں نے اس پر زیاد کو کوئی تنبیہہ نہیں کی' ہو سکتا ہے کہ انہیں اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو' اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی طرح اطلاع پہنچی ہو جس طرح ابن غیلان کے مذکورہ بالا واقعے میں پہنچی تھی۔ اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ حضرت معاویہ نے زیاد کو اس حرکت پر مناسب سرزنش کی ہو' لہٰذا قطعیت کے ساتھ یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ :

"دربار خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا" (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۶)

تیسرا واقعہ مولانا نے حضرت بسر بن ارطاۃ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو بچوں کو قتل کر دیا' ہمدان میں بعض مسلمان عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا۔

جہاں تک بچوں کو قتل کرنے کا تعلق ہے اگر یہ روایت درست ہو تو یہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت کا نہیں بلکہ مشاجرات کے زمانہ کا قصہ ہے' جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہما کے لشکر باہم بر سرپیکار تھے۔ اس دور کی جنگوں کے بیان میں اس قدر رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں کہ حقیقت کا پتہ چلانا بہت دشوار ہے' ٹھیک اسی روایت میں جس سے مولانا نے استدلال کیا ہے علامہ طبریؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بسر بن ارطاۃؓ کے مقابلے کے لئے حضرت علیؓ نے حضرت جاریہ بن قدامہؓ کو دو ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا۔ حضرت جاریہؓ نے نجران پہنچ کر پوری بستی کو آگ لگا دی اور حضرت عثمانؓ کے ساتھیوں میں سے بہت سے افراد کو پکڑ کر قتل کر ڈالا' پھر جاریہؓ مدینہ طیبہ پہنچے' اس وقت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے' وہ انہیں دیکھ کر بیچ ہی میں بھاگ کھڑے ہوئے' جاریہؓ نے کہا۔

"واللہ لو اخذت ابا سنور لضربت عنقہ"

"خدا کی قسم اگر بلی والا (حضرت ابوہریرہؓ) مجھے ہاتھ آگیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔"

(الطبری ص ۱۰۷ ج ۴ مطبعۃ الاستقامۃ' القاہرہ ۱۳۵۸ھ)

حضرت علیؓ نے انہیں بصرہ بھیجا' وہاں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے گورنر عبداللہ بن الحضرمی کو گھر میں محصور کر کے زندہ جلا دیا۔[1] لیکن ہم ان زیادتیوں سے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو بری سمجھتے ہیں' اور ان ناقابل اعتماد تاریخی روایات کی بناء پر ان حضرات میں سے کسی کو مورد الزام قرار دینا جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ ان روایات کی صحت کا کچھ پتہ نہیں۔

انہی بسر بن ارطاۃؓ کے بارے میں جنہیں مذکورہ روایات کی بناء پر مولانا مودودی نے "ظالم شخص" کا خطاب دے دیا ہے' خود حضرت علیؓ کی گواہی تو حافظ ابن کثیرؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ:

عن زهير بن الارقم قال خطبنا عليٌّ يوم جمعة فقال نبئت ان بسرا قد طلع اليمن' واني والله لأحسب ان هؤلاء القوم سيظهرون عليكم وما يظهرون عليكم الا بعصيانكم امامكم وطاعتهم امامهم و خيانتكم وامانتهم وافسادكم في ارضكم واصلاحهم"

---

[1] الاستیعاب تحت الاصابہ' ص ۲۴۷ ج اول' ذکر "جاریہ بن قدامہ"

"زہیر بن ارقم" کہتے ہیں کہ ایک جمعہ کو حضرت علیؓ نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ بسر (بن ارطاۃ) یمن پہنچ گئے ہیں' اور خدا کی قسم میرا گمان یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے اور صرف اس بناء پر غالب آئیں گے کہ تم اپنے امام کی نافرمانی کرتے ہو اور یہ لوگ اپنے امام کی اطاعت کرتے ہیں تم لوگ خیانت کرتے ہو' اور یہ لوگ امین ہیں تم اپنی زمین میں فساد مچاتے ہو' اور یہ اصلاح کرتے ہیں"[1]

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ حافظ ابن حبانؒ سے نقل کرتے ہیں کہ :

"ولہ اخبار شھیرۃ فی الفتن لا ینبغی التشاغل بھا"

"فتنہ کے دور میں ان کے (بسرؓ کے) بہت قصے مشہور ہیں جن میں مشغول ہونا نہیں چاہیے۔"[2]

اس کے علاوہ ان جنگوں میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ تاکید فرمائی تھی کہ وہ قتل و قتال میں حد ضرورت سے آگے نہ بڑھیں' حضرت علیؓ کا یہ ارشاد تو متعدد مقامات پر منقول ہے[3] اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں خود انہیں بسر بن ارطاۃ کا یہ مقولہ بہت سی تواریخ نے نقل کیا ہے کہ :

"یا اھل مدینۃ لولا ما عھد الی معاویۃ ماترکت بھا محتلما الا قتلتہ"

"اے اہل مدینہ! اگر مجھ سے معاویہؓ نے عہد نہ لیا ہوتا تو میں اس شہر میں کسی بالغ انسان کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا۔"[4]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے تو انہیں ہر بالغ انسان کو قتل کرنے سے بھی منع کیا تھا' چہ جائیکہ چھوٹے بچوں کو قتل کرنے کی اجازت دیتے۔ لہٰذا حضرت علیؓ کے

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۳۲۵ ج ۷ مطبعۃ السعادۃ

[2] الاصابہ ص ۱۵۲ ج اول

[3] مثال کے طور پر طبری ص ۵۰۶ ج ۳ ملاحظہ فرمائیے۔

[4] الطبری ص ۱۰۶ ج ۴' الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۱۶۶ ج ا' ابن عساکر ص ۲۲۲ ج ۳

گورنر ہوں یا حضرت معاویہؓ کے اگر انہوں نے فی الواقع دوران جنگ کوئی زیادتی کی بھی ہو تو اس کی کوئی ذمہ داری حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ تواریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ فتنہ کا وقت گذر جانے کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان زیادتیوں کی تلافی کر کے بسر بن ارطاۃ کو گورنری سے معزول کر دیا۔[1]

رہ گیا یہ قصہ کہ بسر بن ارطاۃؓ نے ہمدان پر حملہ کر کے وہاں کی مسلمان عورتوں کو کنیز بنا لیا تھا' سو یہ بات الاستیعاب کے سوا کسی بھی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن عساکرؒ جنہوں نے بسر بن اطارۃ کے حالات چھ صفحات میں ذکر کیے ہیں [2] اور ان میں بسر سے متعلق تمام صحیح و سقیم روایات جمع کی ہیں' ہمدان پر ان کے حملے کا بھی ذکر کیا ہے انہوں نے بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے مسلمان عورتوں کو کنیز بنا لیا تھا' یہ روایت صرف حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں نقل کی ہے اور اس کی سند بھی نہایت ضعیف ہے۔ بعض متکلم فیہ راویوں سے قطع نظر اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ہیں' جن کی محدثین نے تضعیف کی ہے امام احمدؒ کا ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ :

لا تحل الرواية عنه عن موسى بن عبيدة

"میرے نزدیک موسیٰ بن عبیدہ سے روایت کرنا حلال نہیں"[3]

آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا کہ "مسلمان عورتوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا گیا"[4] تو کیا اس واقعہ کو کسی ایک ہی شخص نے دیکھا تھا؟ یہ تو تاریخ کا ایسا منفرد سانحہ ہوتا کہ اس کی شہرت حد تواتر تک پہنچ جانی چاہیئے تھی۔ اور حضرت معاویہؓ سے بغض رکھنے والا گروہ جو پر کا کوا بنانے بلکہ بسا اوقات بے پر کی اڑانے پر تلا ہوا تھا وہ تو اس واقعہ کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا؟ اس کے باوجود اس واقعے کی صرف ایک ہی روایت کیوں ہے؟ اور وہ بھی ضعیف اور مجروح جسے کسی مؤرخ نے بھی اپنی تاریخ میں درج کرنا مناسب

---

[1] دیکھئے ابن خلدونؒ ۸، ۹ ج ۳ "بعث معاویہؓ العمال الی الامصار"

[2] ابن عساکر ص ۲۲۰ تا ۲۲۵ ج ۳ "بسر بن ابی ارطاۃ"

[3] ابو حاتم الرازیؒ : الجرح والتعدیل ص ۱۵۲ ج ۴ قسم اول

[4] الاستیعاب ص ۱۴۶ ج ۱

نہیں سمجھا؟ لہٰذا محض اس ضعیف اور منفرد روایت کی بناء پر صحابہ کرامؓ کی تاریخ پر اتنا بڑا داغ نہیں لگایا جا سکتا۔

چوتھا واقعہ مولانا نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی' جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا' اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔

سب سے پہلا سر جو زمانہ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور ابن سعدؒ نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگ صفین میں حضرت عمارؓ کا سر کاٹ کر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا۔ اور دو آدمی اس پر جھگڑ رہے تھے کہ عمارؓ کو میں نے قتل کیا۔"

یہ روایت تو مولانا نے صحیح نقل کی ہے لیکن اگر یہ واقعہ درست ہو تو اس واقعے سے حضرت معاویہؓ پر الزام عائد کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس روایت میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمارؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لے جایا گیا۔ یہ نہیں بتلایا کہ حضرت معاویہؓ نے اس فعل پر کیا اثر لیا؟ بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ امام ابن سعدؒ ہی نے طبقات میں یہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت علیؓ کے ایک شخص عمیر بن جرموز نے قتل کیا اور ان کا سر تن سے جدا کر کے حضرت علیؓ کے پاس لے گیا۔[1]

ہماری گذارش یہ ہے کہ ان دونوں قصوں میں کوئی الزام حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی نے نہ اس بات کا حکم دیا تھا کہ فلاں کا سر کاٹ کر ہمارے پاس لایا جائے' نہ انہوں نے اس فعل کی توثیق کی تھی' بلکہ یقیناً انہوں نے اس فعل کو برا قرار دے کر ایسا کرنے والے کو تنبیہہ کی ہو گی۔ حضرت علیؓ کے بارے میں تو اسی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ انہوں نے حضرت زبیرؓ کی شہادت پر افسوس کا اظہار

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۱۲ ج ۳ جزو ۸ "زبیر بن اعوامؓ"

فرمایا' حضرت معاویہؓ کے قصے میں راوی نے ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی' اگر راوی نے کسی وجہ سے تنبیہہ کا ذکر نہیں کیا تو یہ "عدم ذکر" ہی تو ہے "ذکر عدم" تو نہیں کہ اس سے ان حضرات پر کوئی الزام لگایا جا سکے اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ ان حضرات نے اپنے ماتحتوں کو شرعی حدود پامال کرنے کی چھٹی دی رکھی تھی۔

آگے مولانا لکھتے ہیں۔

> "دوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے' مگر حضرت عثمانؓ کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ زیاد کی ولایت عراق کے زمانے میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے' وہاں ایک سانپ نے ان کو کاٹ لیا اور وہ مر گئے تعاقب کرنے والے ان کی مردہ لاش کا سر کاٹ کر زیاد کے پاس لے گئے اس نے حضرت معاویہ کے پاس دمشق بھیج دیا وہاں اسے بر سر عام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔"

اس واقعے کے لئے مولانا نے چار کتابوں کے حوالے دیئے ہیں (طبقات ابن سعد' استیعاب' البدایہ و النہایہ اور تہذیب التہذیب لیکن اس واقعے کا قابل اعتراض حصہ (یعنی یہ کہ حضرت معاویہؓ نے عمرو بن الحمق کے سر کو گشت کرایا) نہ طبقات میں ہے نہ استیعاب میں' نہ تہذیب میں' یہ صرف البدایہ میں نقل کیا گیا ہے اور وہ بھی بلا سند و حوالہ۔ البدایہ والنہایہ کا ماخذ عموماً طبریؒ کی تاریخ ہوا کرتی ہے اور طبریؒ نے عمرو بن الحمق کے قتل کا جو واقعہ ذکر کیا ہے اس میں اس داستان کا کوئی ذکر نہیں' بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتنے کے عروج کے دور میں بھی حضرت معاویہؓ نے عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انتقام کے جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے۔ امام ابن جریر طبریؒ ابو مخنف کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو بن الحمق کو موصل کے عامل نے گرفتار کر لیا تھا اس کے بعد انہوں نے حضرت معاویہؓ سے خط لکھ کر معلوم کیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت معاویہؓ نے جواب میں لکھا کہ :

"انہوں نے حضرت عثمان بن عفانؓ پر نیزے کے نو وار کئے تھے' ہم ان پر زیادتی کرنا نہیں چاہتے لہٰذا تم بھی ان پر نیزے کے نو وار کرو جس طرح انہوں نے حضرت عثمانؓ پر کئے

تھے"۔[1]

اس روایت میں نہ سر کاٹنے کا ذکر ہے نہ اسے حضرت معاویہؓ کے پاس لے جانے کا بیان ہے نہ اسے گشت کرانے کا قصہ ہے۔ اس کے بجائے حضرت معاویہؓ کا ایک ایسا حکم بیان کیا گیا ہے جو عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی بھی ابو مخنف ہے اور وہ شیعہ ہونے کے باوجود حضرت معاویہؓ کی کسی ایسی بات کا ذکر نہیں کرتا جس سے ان پر الزام عائد ہو سکے۔

اس کے مقابلے میں البدایہ والنہایہ کی روایت نہ سند کے ساتھ ہے، نہ اس کا کوئی حوالہ مذکور ہے نہ وہ حضرت معاویہؓ کے بردبارانہ مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں آخر کس بنا پر طبری کی صاف اور سیدھی روایت کو چھوڑ کر اسے اختیار کیا جائے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے ایک بڑا زرّیں اصول یہ لکھا ہے کہ :

"جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں نہ ترجیح دیں جو ان کے مجموعی طرز عمل سے مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایت کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں؟"

(خلافت و ملوکیت ص ۳۴۸)

سوال یہ ہے کہ کیا اس اصول کا اطلاق حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نہیں ہوتا؟ ان حالات میں مولانا مودودی صاحب کا یہ استنباط بڑا ہی سرسری اور جذباتی استنباط ہے کہ :

"یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے، اور سیاسی معاملات میں

---

[1] انہ طعن عثمان بن عفان تسع طعنات بمشاقص کانت معہ وانا لا نرید ان نعتدی علیہ فاطعنہ تسع طعنات کما طعن عثمان (الطبری ۱۹۷ ج ۴)

شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں" (ص : ۱۷۷)

جن واقعات سے مولانا نے اس بات کا استنباط فرمایا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالا تر قرار دے دیا تھا، ان کی حقیقت تو آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے گورنروں کے جن خلاف شرع امور سے واقف ہو جاتے تھے ان پر انہیں مناسب تنبیہہ فرمایا کرتے تھے' اس کے بھی بہت سے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں' یہاں ایک واقعہ پر اکتفا کیا جاتا ہے : ۔

"حافظ ابن عساکر نقل فرماتے ہیں کہ سعد بن سرح حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے ایک صاحب تھے' جب حضرت معاویہؓ نے زیاد کو کوفہ میں گورنر بنایا تو اس نے سعد بن سرح کو دھمکیاں دیں' اس لئے یہ حضرت حسن بن علیؓ کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گئے' زیاد نے ان کے پیچھے ان کے بھائی اور ان کے بیوی بچوں کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اور ان کے مال و دولت پر قبضہ کر کے ان کا گھر منہدم کرا دیا۔ جب حضرت حسنؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے زیاد کے نام ایک خط لکھا کہ : "تم نے ایک مسلمان کا گھر منہدم کر کے اس کے مال و دولت اور بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو تم فوراً ان کا گھر دوبارہ تعمیر کراؤ اور اس کے بیوی بچے اور مال و اسباب انہیں واپس کر دو۔ میں نے انہیں پناہ دی ہوئی ہے لہٰذا تم ان کے بارے میں میری سفارش قبول کرو۔"

اس خط کے جواب میں زیاد نے حضرت حسنؓ کے نام ایک خط لکھا جس میں حضرت حسنؓ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی' حضرت حسنؓ زیاد کا خط پڑھ کر مسکرائے اور حضرت معاویہؓ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہیں پورے واقعے سے مطلع کیا' اور زیاد کا خط بھی ساتھ بھیج دیا۔ حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ :

"فلما وصل كتاب الحسن الى معاوية وقرأ معاوية الكتاب ضاقت به الشام"

"جب حضرت حسنؓ کا خط حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچا اور انہوں نے

خط پڑھا تو (رنج وملال کی وجہ سے) شام کی زمین انہیں تنگ معلوم ہونے لگی۔"

اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے زیاد کے نام سخت تہدید آمیز خط لکھا جس میں متعدد ملامتوں کے علاوہ یہ الفاظ بھی تھے کہ :

"تم نے حسنؓ کے نام خط میں ان کے والد کو برا بھلا کہا ہے' اور کنایۃً ان پر فسق کا الزام لگایا ہے' میری زندگی کی قسم! تم فسق کے خطاب کے ان سے زیادہ مستحق ہو' جس باپ کی طرف تم پہلے منسوب تھے وہ حسنؓ کے والد سے زیادہ اس خطاب کے مستحق تھے' جونہی میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تم فوراً سعد بن سرح کے عیال کو چھوڑ دو ان کا گھر تعمیر کراؤ' اس کے بعد ان سے کوئی تعرض نہ کرو اور ان کا مال لوٹا دو۔ میں نے حسنؓ کو لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے آدمی کو اختیار دیدیں کہ وہ چاہیں تو انہیں کے پاس رہیں اور چاہیں تو اپنے شہر میں لوٹ آئیں اور تمہارے ہاتھ یا زبان کو ان پر کوئی بالادستی حاصل نہیں ہوگی۔"[1]

---

[1] ابن عساکر ص ۴۱۸ و ۴۱۹ ج ۵ مطبعۃ الروضۃ' شام ۱۳۳۲ھ

حضرت حجر بن عدیؓ کا قتل

یہ تو وہ اعتراضات تھے جو مولانا مودودی نے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت حضرت معاویہؓ پر عائد کئے تھے اس کے علاوہ ایک اعتراض مولانا نے "آزادیٔ اظہار رائے کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت اس طرح کیا ہے :

"دور ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کردی گئیں اب قاعدہ یہ ہوگیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

اس نئی پالیسی کی ابتداء حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں حضرت حجر بن عدی کے قتل (۵۱ھ) سے ہوئی جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے امت میں ایک اونچے مرتبے کے شخص تھے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب وشتم کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے۔ کوفہ میں حجر بن عدیؓ سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمت شروع کردی، حضرت مغیرہ جب تک کوفہ کے گورنر رہے وہ ان کے ساتھ رعایت برتتے رہے۔ ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہوگیا تو اس کے اور ان کے درمیان کشمکش برپا ہوگئی، وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا

تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نماز جمعہ میں تاخیر پر بھی اس کو ٹوکا۔ آخر کار اس نے انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کرلیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فرد جرم پر لیں کہ "انہوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے' خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں' امیرالمومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آل ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست نہیں ہے' انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیرالمومنین کے عامل کو نکال باہر کیا' یہ ابو تراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں' ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہار برأت کرتے ہیں۔" ان گواہیوں میں سے ایک گواہی قاضی شریح کی بھی ثبت کی گئی مگر انہوں نے ایک الگ خط میں حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ "میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس حجر بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی گئی ہیں ان میں سے ایک میری شہادت بھی ہے۔ میری اصل شہادت حجر کے متعلق یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں' دائماً حج اور عمرہ کرتے رہتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے ہیں ان کا خون اور مال حرام ہے' آپ چاہیں تو انہیں قتل کریں ورنہ معاف کردیں۔"

اس طرح یہ ملزم حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دیدیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علیؓ سے برأت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائیگا۔" ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا اور حجر نے کہا! "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو رب کو ناراض کرے۔" آخر وہ اور ان کے ساتھی (سات) قتل کردیئے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمان بن حسان کو حضرت معاویہؓ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا' اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین طریقہ سے قتل کر' چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرادیا۔

اس واقعہ نے امت کے تمام صلحاء کا دل ہلا دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کو یہ خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کو اس فعل سے باز رکھنے کے لئے پہلے ہی خط لکھا تھا۔ بعد میں جب ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ ان سے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا "اے معاویہؓ! تجھے حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا۔" حضرت معاویہؓ کے گورنر خراسان ربیع بن زیاد الحارثی نے جب یہ خبر سنی تو کہا :
"خدایا اگر تیرے علم میں میرے اندر کچھ خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھالے۔"

(خلافت وملوکیت۔ ص ۱۶۳ تا ۱۶۵)

اس واقعے میں بھی مولانا مودودی صاحب نے اول تو بعض باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے۔ دوسرے یہاں بھی مولانا نے واقعے کے ضروری اجزاء کو سرے سے حذف کرکے بڑا ہی خلاف واقعہ تاثر قائم کیا ہے۔ مولانا مودودی صاحب کی پوری عبارت ہم نے من وعن نقل کردی ہے، اب اصل واقعہ سُنیئے!

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت حجر بن عدیؓ کون تھے؟ مولانا نے انہیں علی الاطلاق "زاہد و عابد صحابی" کہہ دیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے۔ اگرچہ بعض حضرات مثلاً ابن سعدؒ اور مصعب زبیریؒ کا کہنا تو یہی ہے کہ یہ صحابی تھے لیکن امام بخاریؒ، ابن ابی حاتمؒ، ابوحاتمؒ، خلیفہ بن خیاطؒ اور ابن حبان رحمہم اللہ نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے[1] علامہ ابن سعد نے بھی ان کو ایک مقام پر صحابہ میں اور ایک مقام پر تابعین میں شمار کیا ہے[2] اور ابواحمد عسکریؒ فرماتے ہیں کہ :

اکثر المحدثین لا یصححون له صحبة [3]

---

[1] الاصابہ ص ۳۱۳ ج اول، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ ۱۳۵۸ھ

[2] طبقات ابن سعد ص ۲۱۷ ج ۶ جزو ۲۲

[3] البدایہ والنہایہ ص ۵۰ ج ۸ مطبعۃ السعادۃ

اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح نہیں قرار دیتے۔

یہ خود شیعان علیؓ میں سے تھے[1]، اور بلا شبہ تمام تاریخی روایات ان کی بزرگی اور عبادت و زہد پر متفق ہیں، لیکن ان کے ساتھ کچھ غالی اور فتنہ پرداز قسم کے روافض لگ گئے تھے جو ان کی بزرگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امت مسلمہ میں انتشار برپا کرنا چاہتے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

"وقد التف علی حجر جماعات من شیعة علی یتولون امرہ و یشدون علی یدہ ویسبون معاویة ویتبراون منه"

"حضرت حجرؒ کو شیعان علیؓ کی کچھ جماعتیں لپٹ گئی تھیں جو ان کے تمام امور کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور حضرت معاویہؓ کو برا بھلا کہتی تھیں"[2]

تقریباً یہی بات علامہ ابن خلدونؒ نے بھی لکھی ہے۔[3]

غالباً ان ہی لوگوں کے کان بھرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس قدر مکدّر تھی کہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ سے صلح فرمائی تو یہ حضرت معاویہؓ کی امارت پر کسی طرح راضی نہیں تھے، تیسری صدی کے مشہور مورخ ابو حنیفہ الدینوریؒ اس صلح کا واقعہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"قالوا: وکان اول من لقی الحسن بن علی رضی اللہ عنه فندمه علی ماصنع ودعاہ الی ردالحرب حجر ابن عدی، فقال له یا ابن رسول اللہ لوددت انی مت قبل ما رایت، اخرجتنا من العدل الی الجور فترکنا الحق الذی کنا علیه ودخلنا فی الباطل الذی نهرب منه، واعطینا الدنیة من انفسنا وقبلنا الخسیسة التی لم تلق بنا"

"مورخین کا کہنا ہے کہ (صلح کے بعد) حضرت حسن بن علیؓ کی ملاقات سب سے پہلے حجر بن عدیؒ سے ہوئی، انہوں نے حضرت حسنؓ کو ان کے

---

[1] الاخبار الطوال للدینوریؒ ص ۲۲۳، القاہرہ ۱۹۶۰ء

[2] البدایۃ والنہایہ ص ۵۰ ج ۸

[3] ابن خلدون ص ۲۳ ج ۳ الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

اس فعل پر شرم دلائی اور دعوت دی کہ حضرت معاویہؓ سے لڑائی دوبارہ شروع کردیں' اور کہا کہ اے رسول اللہ کے بیٹے! کاش کہ میں یہ واقعہ دیکھنے سے پہلے مرجاتا' تم نے ہمیں انصاف سے نکال کر ظلم میں مبتلا کردیا' ہم جس حق پر قائم تھے' ہم نے وہ چھوڑ دیا اور جس باطل سے بھاگ رہے تھے اس میں جا گھسے' ہم نے خود ذلت اختیار کرلی اور اس پستی کو قبول کر لیا جو ہمارے لائق نہیں تھی۔"

اس کے بعد الدینوریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو حجر بن عدیؓ کی یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے جواب میں اس صلح کے فوائد سے آگاہ فرمایا' لیکن حجر بن عدیؓ راضی نہ ہوئے اور حضرت حسینؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ :

ابا عبداللہ شریتم الذل بالعز و قبلتم القلیل و ترکتم الکثیر' اطعنا الیوم واعصنا الدھر' دع الحسن وما رأی من ھذا الصلح واجمع الیک شیعتک من اھل الکوفۃ و غیرھا وولنی و صاحبی ھذہ المقدمۃ فلا یشعر ابن ھند الاونحن نقارعہ بالسیوف

"اے ابو عبداللہ' تم نے عزت کے بدلے ذلت خرید لی' زیادہ کو چھوڑ کر کم کو قبول کرلیا' بس آج ہماری بات مان لو پھر عمر بھر نہ ماننا' حسنؓ کو ان کی صلح پر چھوڑ دو اور کوفہ وغیرہ کے باشندوں میں سے اپنے شیعہ (حامیوں) کو جمع کرلو اور یہ مقدمہ میرے اور میرے دوست کے سپرد کردو' ہند کے بیٹے (حضرت معاویہؓ) کو ہمارا پتہ صرف اس وقت چلے گا جب ہم تلواروں سے اس کے خلاف جنگ کر رہے ہوں گے۔"

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں یہی جواب دیا کہ۔ انا قد بایعنا وعاھدنا' ولا سبیل الی نقض بیعتنا ہم بیعت کرچکے' عہد ہوچکا' اب اسے توڑنے کی کوئی سبیل نہیں۔[1]

---

[1] ابو حنیفہ الدینوریؒ الاخبار الطوال ص ۲۲۰۔ ادارۃ العامۃ للثقافۃ القاھرہ

اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، کوفہ اس وقت فتنہ پرداز قسم کے غالی سبائیوں کا مرکز بنا ہوا تھا جو یوں تو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی محبت و مودت کا دعویٰ کرتے تھے لیکن ان کا اصل مقصد حضرت معاویہؓ کی حکومت کو ناکام بنانا تھا۔ حضرات حسنینؓ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اسے کسی قیمت پر توڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔

دوسری طرف حضرت معاویہؓ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ بقول علامہ ابو حنیفہ الدینوریؒ :

”لم یر حسن ولا الحسین طول حیاۃ معاویۃ منہ سوءًا فی انفسھما ولا مکروھا، ولا قطع عنھما شیئا مما کان شرط لھما ولا تغیر لھما عن بر“

”حضرت معاویہؓ کی پوری زندگی میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ان کی طرف سے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی، نہ انہوں نے ان کی طرف سے اپنے بارے میں کوئی بری بات دیکھی، حضرت معاویہؓ نے ان سے جو عہد کئے تھے ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کی، اور کبھی ان کے ساتھ حسن سلوک کے طرز کو نہ بدلا“[1]

گویا اصل فریقین میں مکمل صلح ہو چکی تھی اور اب کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن ان لوگوں کے دل میں بغض معاویہؓ کی آگ برابر سلگ رہی تھی اور یہ ہر ایسے موقع کی تاک میں رہتے تھے جس میں حضرت معاویہؓ اور ان کی حکومت کے خلاف کوئی شورش کھڑی کی جا سکے اور چونکہ حضرات حسنینؓ اس فتنہ پردازی میں ان کے ساتھ نہیں تھے، اس لئے یہ دل میں ان سے بھی خوش نہ تھے، یہاں تک ان میں سے ایک صاحب نے ایک موقع پر حضرت حسنؓ کو ان الفاظ میں خطاب کیا کہ :

”یا مذل المومنین

”اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے“

چنانچہ جب حضرت حسنؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے کوفہ سے حضرت حسینؓ کو خط لکھا کہ :

---

[1] ایضاً ص ۲۲۵

"فان من قبلنا من شیعتک منطلعة انفسهم الیک' لا یعدلون بک احدا وقد کانوا عرفوارای الحسن اخیک فی دفع الحرب' و عرفوک باللین لاولیائک والغلظة علی اعدائک' والشدة فی امر اللہ فان کنت تحب ان تطلب ھذا الامر فاقدم الینا' فقدوطنا انفسنا علی الموت معک" [1]

"ہمارے یہاں جتنے آپ کے شیعہ (حامی) ہیں ان سب کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں' وہ آپ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے' آپ کے بھائی حسنؓ نے جنگ کو دفع کرنیکی جو پالیسی اختیار کی تھی یہ لوگ اس سے واقف ہیں' اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنے دوستوں کے لئے نرم اور دشمنوں کے لئے سخت ہیں' اور اللہ کے کام میں اٹل ہیں' لہٰذا اگر آپ اس معاملے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس آجایئے' اس لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار کر چکے ہیں۔"

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ بدستور اپنے عہد پر قائم رہے' ان کو اس انتشار انگیزی سے روکا اور جواب میں حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہاں تک لکھا کہ :

"فلن یحدث اللہ بہ حدثا وانا حی" [2]

"جب تک میں زندہ ہوں' اللہ ہرگز ان پر کوئی نئی آفت نہیں بھیجے گا"

اس قماش کے لوگ تھے جو کوفہ میں بقول حافظ ابن کثیرؒ حضرت حجر بن عدیؓ کو چمٹے ہوئے تھے۔ حالات کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اب زیر بحث واقعے کی طرف آیئے۔ مولانا نے اس واقعے کے لئے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ (طبری' استیعاب' ابن اثیر' البدایہ والنہایہ' ابن خلدون) ہم یہاں ٹھیک انہی کتابوں سے نقل کر کے اس سے اصل واقعہ ذکر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ واقعہ کے جو ضروری اجزاء مولانا نے حذف کر دیئے ہیں انہیں ہم بیان کر دیں گے' نیز جو باتیں مولانا نے ان کتابوں کی طرف غلط منسوب فرمائی ہیں

---

[1] الدینوری ص ۲۲۱

[2] ایضاً: ص ۲۲۲

ان پر تنبیہہ کر دیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کا معمول ہی یہ بن گیا تھا کہ بقول ابن جریرؒ و ابن کثیرؒ

"انهم كانوا ينالون من عثمان و يطلقون فيه مقالة الجور وينتقلون على الامراء ويسارعون فى الانكار عليهم و يبالغون فی ذلک و يتولون شيعة على ويتشددون فی الدين"

"یہ لوگ حضرت عثمانؓ کی بدگوئی کرتے تھے' اور ان کے بارے میں ظالمانہ باتیں کرتے تھے' اور امراء پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور ان کی تردید کی تاک میں رہتے تھے۔ اور اس معاملے میں غلو کرتے تھے اور شیعان علیؓ کی حمایت کرتے اور دین میں تشدد کرتے تھے"۔[1]

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنے خطبہ میں حسب معمول حضرت عثمانؓ کے لئے رحم و مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کے قاتلوں کے حق میں بد دعا فرمائی۔[2] اس پر حجر بن عدیؓ کھڑے ہو گئے اور حضرت مغیرہؓ کے خلاف اس زور کا نعرہ لگایا کہ مسجد کے اندر اور باہر سب لوگوں نے سنا اور حضرت مغیرہؓ سے خطاب کر کے کہا۔

"انک لا تدری بمن تولع من هر مک ایها الانسان مولنا بارزاقنا اعطیاتنا فانک قد حبستها عنا ولیس ذلک لک ولم یکن یطمع فی ذلک من کان قبلک و قد اصبحت مولعًا بذم امیر المومنین و تقریظ المجرمین"

"اے انسان تجھے سٹھیا جانے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ تو کس سے عشق کا اظہار کر رہا ہے؟ ہماری تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم جاری کر' کیونکہ وہ تو

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۵۴ ج ۸

[2] یہی وہ بددعا ہے جسے مولانا مودودی نے "منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ" سے تعبیر فرمایا ہے اور جس کے بارے میں طبری کے الفاظ یہ ہیں کہ

ویدعو علی قتلته فقام حجر بن علی فنعر نعرة بالمغیرة الخ (طبری ۱۸۸'۱۸۹ ج ۴)

نے روک رکھی ہیں حالانکہ تجھے اس کا حق نہیں اور تجھ سے پہلے گورنروں نے کبھی ہماری تنخواہوں کی لالچ نہیں کی تھی اور تم امیرالمومنین (حضرت علیؓ) کی مذمت اور مجرموں (حضرت عثمانؓ) کی مدح کرنے کے بڑے شوقین ہو۔"

لیکن اس پر حضرت مغیرہؓ نے انہیں کچھ نہیں کہا اور گھر تشریف لے گئے' لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی کہ ایسے شخص کو تنبیہہ کئے بغیر چھوڑنا مناسب نہیں' مگر حضرت مغیرہؓ نے فرمایا "میں خطاکار سے درگزر کرنے والا ہوں۔"

حضرت مغیرہؓ کے بعد زیاد کوفہ کا بھی گورنر ہو گیا تو اس نے اپنے خطبے میں حضرت عثمانؓ کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔[1] اس پر حجر حسب معمول کھڑے ہو گئے اور

---

[1] اسی کو مولانا مودودی نے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے کہ: "وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے" حالانکہ جتنے حوالے مولانا نے دیئے ہیں ان میں کہیں یہ موجود نہیں ہے کہ زیاد حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا: طبری کے الفاظ یہ ہیں:

ذکر عثمان واصحابہ فقرظهم وذکر قتلته ولعنهم فقام حجر... الخ

اس نے حضرت عثمانؓ اور ان کے اصحاب کا ذکر کرکے ان کی تعریف کی اور ان کے قاتلین کا ذکر کرکے ان پر لعنت بھیجی تو حجر کھڑے ہو گئے" (طبری ص ۱۹۰ ج ۴) اور ابن اثیرؒ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ترحم علی عثمان واثنی علی اصحابہ ولعن قاتلیہ فقام حجر... الخ "اس نے حضرت عثمانؓ پر رحمت بھیجی اور ان کے اصحاب کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔" (ابن اثیر ص ۱۸۷ ج ۳ طبع قدیم)

اور حافظ ابن کثیرؒ کے الفاظ ہیں: وذکر فی اخرھا فضل عثمانؓ وذم قتلہ اواعان علی قتلہ فقام حجر" خطبے کے آخر میں اس نے حضرت عثمانؓ کی فضیلت بیان کی اور ان کے قتل کرنے والوں اور قتل میں اعانت کرنے والوں کی مذمت کی تو حجر کھڑے ہو گئے (البدایۃ ص ۵۰ ج ۸) اور ابن خلدون کے الفاظ یہ ہیں: وترحم علی عثمان ولعن قاتلیہ وقال حجر الخ اس نے حضرت عثمان پر رحمت بھیجی اور ان کے قاتلوں پر لعنت اور حجر نے کہا الخ (ابن خلدون ص ۲۳۔ ج ۳) اور ابن عبدالبرؒ نے تو اس خطبے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے الفاظ سے مولانا مودودی صاحب نے یہ کہاں سے مستنبط کر لیا کہ "وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا۔"

جو باتیں حضرت مغیرہؓ سے کہی تھیں وہی زیاد سے بھی کہیں، زیاد نے اس وقت انہیں کچھ نہ کہا۔[1]

اس کے بعد امام ابن سعد کا بیان ہے کہ زیاد نے حضرت حجر بن عدیؒ کو تنہائی میں بلا کر ان سے کہا کہ :

"اپنی زبان اپنے قابو میں رکھیے اور اپنے گھر کو اپنے لئے کافی سمجھئے، اور یہ میرا تخت حاضر ہے، یہ آپ کی نشست ہے، آپ کی تمام ضروریات میں پوری کروں گا، لہٰذا آپ اپنے معاملے میں مجھے مطمئن کر دیجئے اس لئے کہ آپ کی جلد بازی مجھے معلوم ہے، اے ابو عبدالرحمٰن! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، ان پست فطرت اور بے وقوف لوگوں سے بچئے، یہ لوگ کہیں آپ کو آپ کی رائے سے پھسلا نہ دیں، لہٰذا اب اگر آپ کی قدر میری نگاہ میں کم ہوئی یا میں نے آپ کے حقوق میں کوتاہی کی تو یہ میری طرف سے ہرگز نہیں ہو گی۔"[2]

حجر بن عدیؒ نے یہ بات سن کر کہا کہ "میں سمجھ گیا" پھر وہ اپنے گھر چلے گئے، وہاں ان سے ان کے شیعہ دوست آکر ملے اور پوچھا کہ "امیر نے کیا کہا۔؟" انہوں نے پوری گفتگو بتلا دی اس پر شیعہ ساتھیوں نے کہا کہ "اس نے آپ کی خیر خواہی کی بات نہیں کی۔"[3]

اس کے بعد حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ زیاد حضرت عمرو بن حریثؓ کو کوفہ میں اپنا نائب بنا کر بصرہ جانے لگا تو اس نے حجر بن عدیؒ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، تاکہ پیچھے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو لیکن حجر بن عدیؒ نے یہ عذر کر دیا کہ "میں بیمار ہوں" اس پر زیاد نے جل

---

[1] یہاں تک کا واقعہ طبری، ابن اثیر، ابن کثیر اور ابن خلدون نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے۔

[2] املک علیک لسانک ولیسعک منزلک، وھذا سریری فھو مجلسک، و حوائجک مقضیۃ لدی فاکفنی نفسک فانی اعرف عجلتک، فانشدک اللہ یا ابا عبدالرحمٰن فی نفسک، وایاک وھذہ السفلۃ وھولاء السفھاء ان یستزلوک عن رایک فانک لو ھنت علی او استخففت بحقک لم اخصک بھذا من نفسی (طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ ج ۸ ج ۲۲ دار صادر بیروت)

[3] ایضاً والبدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸ مطبعۃ السعادۃ مصر

کر کہا کہ "تم دین، قلب اور عقل ہر اعتبار سے بیمار ہو، خدا کی قسم! اگر تم نے کوئی ہنگامہ کیا تو میں تمہارے قتل کی کوشش کروں گا۔"[1]

امام ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ جب زیاد بصرہ چلا گیا تو شیعہ صاحبان حجر بن عدیؓ کے پاس بکثرت آتے جاتے تھے، اور ان سے کہتے تھے کہ :

"انک شیخنا واحق الناس بانکار ھذا الامر"

"آپ ہمارے شیخ ہیں، اور تمام لوگوں سے زیادہ اس بات کے حقدار ہیں کہ اس معاملے (خلافت معاویہؓ) کا انکار کریں۔"

حجر بن عدیؓ مسجد میں جاتے تو یہ لوگ بھی ان کے ساتھ جاتے۔ زیاد کے نائب حضرت عمرو بن حریثؓ نے جب یہ دیکھا تو ایک قاصد کے ذریعہ حجرؓ کو پیغام بھیجا کہ "اے ابو عبدالرحمٰنؓ آپ تو امیر سے اپنے بارے میں عہد کر چکے ہیں، پھر یہ جماعت آپ کے ساتھ کیسی ہے؟" حجرؓ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جن چیزوں میں تم مبتلا ہو، تم ان کا انکار کرتے ہو، پیچھے ہٹو، تمہاری خیریت اسی میں ہے۔"[2]

اس پر حضرت عمرو بن حریثؓ نے زیاد کو لکھا کہ "اگر تم کوفہ کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آجاؤ۔"[3]

علامہ ابن جریر طبری وغیرہ فرماتے ہیں کہ زیاد کو یہ اطلاع ملی کہ حجر کے پاس شیعان علی جمع ہوتے ہیں اور حضرت معاویہؓ پر علی الاعلان لعنت کرتے اور ان سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور انہوں نے حضرت عمرو بن حریثؓ پر پتھر بھی برسائے ہیں۔[4]

---

[1] البدایہ والنہایہ، ص ۵۱ ج ۸

[2] پورا جملہ یہ ہے: تنکرون ما انتم علیہ الیک وراءک اوسع لک دوسرے جملہ کا مفہوم یقینی طور سے میں نہیں سمجھ سکا۔

[3] طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ ج ۸ جز ۲۲ والبدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

[4] الطبری ص ۱۹۰ ج ۴۔ ابن اثیر ص ۱۸۷ ج ۳۔ ابن خلدون ص ۲۳ ج ۳، البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸ پہلی تین کتابوں کے الفاظ یہ ہیں۔ فبلغہ ان حجرا یجتمع الیہ شیعۃ علی ویظھرون لعن معاویۃ والبراءۃ منہ وانھم حصبوا عمرو بن حریث "

امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ زیاد یہ اطلاع پا کر بڑی برق رفتاری سے کوفہ پہنچا' یہاں آکر اس نے مشہور صحابہ حضرت عدی بن حاتمؓ' حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ اور حضرت خالد بن عرفطہ الازدی رضی اللہ عنہم اور کوفہ کے بعض دوسرے شرفاء کو بلایا اور ان سے کہا کہ آپ جا کر حجر بن عدیؒ کو اتمام حجت کے طور پر سمجھائیں کہ وہ اس جماعت سے باز رہیں اور جو باتیں وہ کہتے رہتے ہیں ان سے اپنی زبان قابو میں رکھیں۔ یہ حضرات ان کے پاس گئے مگر حجر بن عدیؒ نے نہ کسی سے بات کی' نہ کسی کی بات کا جواب دیا بلکہ ان کا ایک اونٹ گھر کے ایک کونے میں کھڑا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے غلام سے کہا کہ "لڑکے! اونٹ کو چارہ کھلاؤ۔" جب انہوں نے ان حضرات کی بات اس طرح سنی ان سنی کر دی تو حضرت عدی[1] بن حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

"کیا تم دیوانے ہو؟ میں تم سے بات کر رہا ہوں' اور تم کہتے ہو کہ لڑکے! اونٹ کو چارہ کھلاؤ"

اس کے بعد حضرت عدی بن حاتمؓ نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کر کے فرمایا "مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ بے چارہ ضعف کے اس درجے کو پہنچ گیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں۔

اس طرح یہ حضرات واپس آگئے اور زیاد کے پاس آکر حجر کی کچھ باتیں بتائیں اور کچھ چھپالیں' اور زیاد سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے' زیاد نے جواب میں کہا کہ "اگر میں اب ان کے ساتھ نرمی کروں تو میں ابو سفیان کا بیٹا نہیں"[2]

علامہ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کا یہ واقعہ نقل نہیں کیا اس کے بجائے انہوں نے لکھا ہے کہ زیاد نے کوفہ میں ایک خطبہ دیا' غالباً یہ خطبہ حضرت عدی حاتمؓ کی واپسی کے بعد دیا ہو گا۔ بہر حال! ابن جریرؒ وغیرہ کے بیان کے مطابق زیاد جمعہ کے دن منبر پر پہنچا' اس وقت حجر بن عدیؒ اور ان کے ساتھی حلقہ بنائے بیٹھے تھے' زیاد نے کہا :

"حمد و صلوۃ کے بعد' یاد رکھو کہ ظلم اور بغاوت کا انجام بہت برا ہے۔ یہ لوگ (حجر اور ان کے ساتھی) جتھہ بنا کر بہت اترا گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے

۱۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸

۲۔ طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ و ۲۱۹ ج ۸ جز ۲۲ والبدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

اپنے حق میں بے ضرر پایا تو مجھ پر جری ہو گئے اور خدا کی قسم! اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو میں تمہارا علاج اسی دوا سے کر دوں گا جو تمہارے لائق ہے' اور اگر میں کوفہ کی زمین کو حجر سے محفوظ نہ کر دوں اور اس کو آنے والوں کے لئے سامان عبرت نہ بنا دوں تو میں بھی کوئی چیز نہیں''[1]

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس کے بعد زیاد نے خطبہ میں یہ بھی کہا کہ :

''ان من حق امیر المومنین یعنی کذا و کذا''

تم پر امیر المومنین کے فلاں اور فلاں حقوق ہیں۔''

اس پر حجر بن عدیؓ نے کنکریوں سے ایک مٹھی بھری اور زیاد پر دے ماری اور کہا کہ :

''کذبت! علیک لعنة اللہ''

تم پر خدا کی لعنت! تم نے جھوٹ کہا[2]

اس پر زیاد منبر سے اترا اور نماز پڑھی۔

بعض راویوں نے اس خطبہ میں یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ جب زیاد کا خطبہ طویل ہو گیا اور نماز کو دیر ہونے لگی تو حجر بن عدیؓ نے مٹھی بھر کنکریاں زیاد پر دے ماریں تب زیاد منبر سے اترا اور نماز پڑھی۔

بہرکیف! اس خطبے میں حجر بن عدیؓ کے کنکریاں مارنے کی وجہ خواہ کچھ ہو' اسی خطبے کے بعد زیاد نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حجر بن عدیؓ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بھیجے' اس پر حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ ''حجر کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو''[3]

اس مرحلے پر زیاد نے اپنے امیر شرطہ (پولیس سپرنٹنڈنٹ) شداد بن الہیثم کو حکم دیا کہ حجر کو بلا کر لاؤ' حسین بن عبد اللہ ہمدانی کہتے ہیں کہ جس وقت زیاد کا یہ حکم آیا' میں شداد

---

[1] الطبری ص ۱۹۰ ج ۴' ابن اثیر ص ۱۸۷ ج ۳' البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸ الفاظ یہ ہیں:

اما بعد فان غب البغی والغی و خیم ان ھولاء جموا فاشروا وامنونی فاجترء وا علی وایم اللہ لئن لم تستقیموا لاداوینکم بدوائکم و قال ما انا بشیئ ان لم امنع باحة الکوفة من حجر وادعه نکالا لمن بعدہ

[2] البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸

[3] الطبری ص ۱۹۰' ج ۴۔ البدایہ والنہایہ ص ۵۱ ج ۸' الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۵۵ ج ۱

کے پاس بیٹھا تھا۔ شداد نے مجھ سے کہا کہ تم جا کر حجرؓ کو بلا لاؤ، میں نے حجرؓ کے پاس جا کر کہا کہ "امیر آپ کو بلاتے ہیں" اس پر ان کے ساتھیوں نے کہا "یہ اس کے پاس نہیں جائیں گے" میں نے واپس آ کر شداد کو ان کا جواب سنایا تو اس نے میرے ساتھ کچھ اور آدمی بھیج دیئے ہم سب نے جا کر ان سے کہا کہ امیر کے پاس چلئے۔"

فسبونا وشتمونا

تو حجر کے ساتھیوں نے ہمیں گالیاں دیں اور برا بھلا کہا۔[1]

جب صورت حال اس درجہ سنگین ہو گئی تو زیاد نے شرفاء کوفہ کو جمع کر کے ایک جوشیلی تقریر کی اور کہا کہ ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کو حجرؓ کی جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کرے، اس کے بعد پھر امیر شرطہ شداد بن الہیثم کو زیادہ آدمی دے کر بھیجا اور تاکید کی کہ اگر حجرؓ تمہاری بات مان لیں تو انہیں لے آؤ، ورنہ ان سے لڑائی کرو، چنانچہ شداد نے تیسری بار جا کر حجرؓ سے کہا کہ "امیر کے پاس چلو" مگر حجرؓ کے ساتھیوں نے جواب میں کہا کہ "ہم پلک جھپکنے کی دیر کے لئے بھی امیر کا یہ حکم نہیں مانیں گے"[2] اس پر فریقین میں لاٹھیوں اور پتھروں سے سخت لڑائی ہوئی[3] مگر زیاد کی پولیس حجرؓ اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آ سکی اور وہ گرفتار نہ ہوئے۔

اس کے بعد حجرؓ بن عدی جائے واردات سے فرار ہو کر کندہ کے محلے میں پہنچ گئے، کندہ میں سب حجرؓ بن عدی کی قوم کے افراد آباد تھے، حجرؓ کے ساتھیوں نے یہاں کے تمام لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیا، حجرؓ کا ایک ساتھی قیس بن قمدان ایک گدھے پر سوار ہو کر یہ اشعار پڑھتا پھر رہا تھا کہ :

یا قوم حجر دافعوا وصاولوا　　و عن اخیکم ساعة فقا تلوا

لا یلفین منکم لحجر خاذل　　الیس فیکم رامح و نابل

وفارس مستلئم و راجل　　و ضارب بالسیف لا یزائل

---

[1] الطبری ص ۱۹۱ ج ۴

[2] لا ولا نعمة عین لا نجیبه (طبری ص ۱۹۱ ج ۴)

[3] طبری ص ۱۹۱، ۱۹۲ ج ۴، البدایہ ص ۵۱ ج ۸، طبقات ابن سعد ص ۲۱۹ ج ۶، ابن کثیر کے الفاظ ہیں فکان بینهم قتال بالحجارة والعصی فعجزوا عنه اور ابن سعد فرماتے ہیں فقاتلهم بمن معه

"اے حجر کی قوم! دفاع کرو اور آگے بڑھ کر حملے کرو' اور اسی وقت اپنے بھائی کی طرف سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تم میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو حجر کو بے یارو مددگار چھوڑ جائے' کیا تم میں کوئی تیر انداز اور نیزے کا دھنی نہیں؟ کیا تم میں کوئی جم کر بیٹھنے ولا شہسوار نہیں؟ کیا تم میں کوئی ایسا تیغ زن نہیں جو ہٹنا نہ جانتا ہو؟[1]

زیاد نے کوفہ کے مختلف باشندوں کو کندہ پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا' یہاں بھی سخت جنگ ہوئی۔ مگر حجر بن عدیؓ فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔[2] جب ان کو پکڑنے کی کوئی اور صورت نہ رہی تو زیاد نے محمد بن الاشعث کو بلا کر ان سے کہا کہ تم تین دن کے اندر حجرؓ کو تلاش کر کے پہنچا دو' ورنہ تمہاری خیر نہیں' محمد بن الاشعث سواروں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کو تلاش کرتے رہے بالآخر حجرؓ نے خود ہی اپنے آپ کو اس شرط پر حاضر ہونے کے لئے پیش کیا کہ "مجھے امان دی جائے' اور معاویہؓ کے پاس بھیج دیا جائے۔" زیاد نے اس شرط کو منظور کر لیا تو حجرؓ اس کے پاس پہنچے' زیاد نے انہیں دیکھ کر کہا :

"مرحبا! ابو عبدالرحمٰن! تم جنگ کے زمانے میں تو جنگ کرتے ہی تھے' اس وقت بھی جنگ کرتے ہو جب سب لوگ صلح کر چکے ہیں۔"

اس کے جواب میں حجرؓ نے کہا :

"میں نے اطاعت نہیں چھوڑی' اور نہ جماعت سے علیحدگی اختیار کی ہے میں اب بھی اپنی بیعت پر قائم ہوں۔"

زیاد نے کہا :

"حجر : افسوس ہے کہ تم ایک ہاتھ سے زخم لگاتے ہو اور دوسرے سے مرہم' تم یہ چاہتے ہو کہ جب اللہ نے ہمیں تم پر قابو دیا تو ہم تم سے خوش ہو جائیں۔"

حجرؓ نے کہا : "کیا تم نے معاویہؓ کے پاس پہنچنے تک مجھے امن نہیں دیا؟"

زیاد نے کہا : "کیوں نہیں ہم اپنے عہد پر قائم ہیں"

---

[1] الطبری ص ۱۹۳ ج ۴

[2] طبریؒ نے ص ۱۹۴ سے ۱۹۶ تک اس لڑائی اور روپوشی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں

یہ کہہ کر زیاد نے انہیں قید خانہ بھیج دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "اگر مجھے امانت کا خیال نہ ہوتا تو یہ شخص جان بچا کر یہاں سے نہ جا سکتا۔"

اس طرح حجر بن عدیؓ تو گرفتار ہو گئے، لیکن ان کے دوسرے ساتھی جو اصل فتنے کا سبب تھے، بدستور روپوش رہے۔ اس کے بعد زیاد نے کوفہ کے چار سرداروں حضرت عمرو بن حریثؓ، حضرت خالد بن عرفطہؓ، حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰؓ اور قیس بن الولید کو جمع کر کے ان سے کہا:

اشھدوا علی حجر بما رایتم منہ

"حجرؓ کے بارے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی گواہی دو"

ان چاروں حضرات نے جو گواہی دی، اس کے الفاظ طبریؒ نے اس طرح نقل کئے ہیں

"حجرؓ نے اپنے[1] گرد بہت سے جتھے جمع کر لئے ہیں اور خلیفہ کو کھلم کھلا برا بھلا کہا ہے اور امیر المومنین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کا آل ابی طالب کے علاوہ کوئی مستحق نہیں، انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے امیر المؤمنین کے گورنر کو نکال باہر کیا اور یہ ابو تراب ؓ (حضرت علیؓ) کو معذور سمجھتے اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے دشمن اور ان سے جنگ کرنے والوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ ان کے ساتھیوں کے سرگروہ ہیں، اور ان ہی جیسی رائے رکھتے ہیں۔"

پھر زیاد نے چاہا کہ ان چار حضرات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس گواہی میں شریک ہوں، چنانچہ اس نے ان حضرات کی گواہی لکھ کر لوگوں کو جمع کیا، ان کو یہ گواہی پڑھ کر سنائی اور لوگوں کو دعوت دی کہ جو لوگ اس گواہی میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنا نام لکھوا دیں، چنانچہ لوگوں نے نام لکھوانے شروع کئے، یہاں تک کہ ستر افراد نے اپنے نام لکھوائے لیکن

---

[1] ان حجرا اجمع الیہ الجموع واظھر شتم الخلیفۃ و دعا الی حرب امیر المومنین و زعم ان ھذا الامر لا یصلح الا فی آل ابی طالب و وثب بالمصر واخرج عامل امیر المومنین و اظھر عذر ابی تراب والترحم علیہ والبراۃ من عدوہ واھل حربہ وان ھولاء النفر الذین معہ ھم رئوس اصحابہ و علی مثل رایہ وامرہ۔

زیاد نے کہا کہ ان میں سے صرف وہ نام باقی رکھے جائیں جو اپنی دینداری اور حسب و نسب کے اعتبار سے معروف ہوں' چنانچہ چوالیس نام لکھے گئے اور باقی ساقط کر دیئے گئے۔[1]

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چوالیس گواہوں میں سے بعض حضرات کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

جن چار گواہوں نے ابتداءً گواہی دی ان میں سب سے پہلے تو حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ' ہیں یہ باتفاق صحابہ میں سے ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ بعض حضرات نے بارہ سال عمر بتائی ہے مگر ابوداؤد میں ان ہی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک مکان کی جگہ عطا فرمائی تھی۔ اس سے حافظ ابن حجرؒ نے استدلال کیا ہے کہ یہ کبار صحابہ میں سے ہیں' انہوں نے بعض احادیث براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بعض حضرت ابو بکرؓ' حضرت عمرؓ وغیرہ کبار صحابہؓ کے واسطے سے۔[2]

دوسرے حضرت خالد بن عرفطہ ازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں' یہ بھی مشہور صحابی ہیں' انہوں نے بھی براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں' جنگ قادسیہ میں حضرت سعدؓ نے ان کو نائب سپہ سالار بنایا تھا' اور حضرت عمرؓ نے بذات خود حضرت سعدؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ ان کو امیر لشکر بنایا جائے' ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو کوفہ میں اپنا نائب بھی بنایا تھا۔[3]

تیسرے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابو بردہؒ ہیں جو صحابی تو نہیں' مگر جلیل القدر تابعی ہیں' اعلیٰ درجے کے فقہاء میں سے ہیں' اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں' حضرت علیؓ کے شاگردوں میں سے ہیں' ان کے علاوہ بہت سے

---

[1] الطبری ص ۱۹۳ تا ۲۰۱ ج ۴

[2] طبقات ابن سعد ص ۲۳ ج ۶ جزو ۲۱' و تہذیب التہذیب ص ۱۷ ج ۸' دائرۃ المعارف دکن ۱۳۲۶ھ والاصابہ ص ۵۲۴ ج ۲ و تجرید اسماء الصحابۃ لابن اثیر الجزریؒ ص ۴۳۵ ج ۱' دائرۃ المعارف دکن ۱۳۱۵ھ

[3] ابن سعد' ص ۲۱ ج ۶ جزو ۲۱ والاصابہ ص ۴۰۹ ج ا و تہذیب ص ۱۰۶ ج ۳

جلیل القدر صحابہ سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں' کوفہ کے قاضی بھی رہے ہیں' امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ کان ثقة کثیر الحدیث (ثقہ ہیں اور بہت سی احادیث کے راوی ہیں) امام عجلیؒ فرماتے ہیں۔

کوفی تابعی ثقة [۱]

چوتھے صاحب قیس بن الولید ہیں' ان کے حالات ہمیں کہیں نہ مل سکے۔ اس کے بعد جن ستر حضرات نے اپنے نام لکھوائے ان میں سے ایک حضرت وائل ابن حجر حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو معروف صحابہ میں سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔[۲]

دوسرے حضرت کثیر بن شہابؓ ہیں' ابن عساکرؒ نے انہیں صحابی قرار دیا ہے' ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ ان کا صحابی ہونا مشکوک ہے' مگر حافظ ابن حجرؒ نے راجح اسی کو قرار دیا ہے کہ یہ صحابی ہیں' اور حضرت عمرؓ نے انہیں کسی جگہ کا امیر بھی بنایا تھا۔[۳]

ان کے علاوہ ایک بزرگ حضرت موسیٰ بن طلحہؒ ہیں جو مشہور صحابی حضرت طلحہؓ کے صاحبزادے ہیں۔ اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں۔ امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ "تابعی ثقة و کان خیارًا" اور حضرت مرہؒ کا کہنا ہے کہ کوفی ثقة رجل صالح امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ انہیں حضرت طلحہؓ کے تمام صاحبزادوں میں محمد کے بعد سب سے افضل کہا جاتا ہے اور اپنے زمانے میں لوگ انہیں ہدایت یافتہ کہا کرتے تھے' ابن خراش کا کہنا ہے کہ "جلیل القدر مسلمانوں میں سے ہیں"[۴] امام ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ تھے اور بہت سی احادیث کے راوی۔[۵]

اسی طرح حضرت طلحہؓ کے ایک اور صاحبزادے حضرت اسحاق بن طلحہؒ نے بھی گواہوں میں اپنا نام لکھوایا تھا' یہ بھی راویٔ حدیث ہیں۔ اور ابن حبان نے انہیں ثقہ قرار

---

[۱] تہذیب التہذیب ص ۱۸ ج ۱۲ و طبقات ابن سعد ص ۲۶۸ ج ۶ جزو ۲۳

[۲] الاصابہ ص ۵۹۲ ج ۳' الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۶۰۵ ج ۳' ابن سعد ص ۳۶ ج ۶ جزو ۲۱

[۳] الاصابہ ص ۲۷۱ ج ۳' الاستیعاب ص ۳۰۰ ج ۳' ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۶ جزو ۲۲

[۴] تہذیب التہذیب ص ۳۵۰' ۳۵۱ ج ۱۰۔ [۵] ابن سعد ص ۲۱۲ ج ۶ جزو ۲۲

دیا ہے۔[1]

ان کے علاوہ دوسرے گواہوں کے حالات کی تحقیق کی ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔ یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ طبری ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان گواہیوں پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ زیاد نے مختار بن ابی عبید اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کے صاحبزادے عروہ کو بھی گواہی دینے کے لئے بلایا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا چنانچہ ان کا نام گواہوں میں نہ لکھا گیا۔[2]

غرض ان تمام گواہوں کی گواہی قلم بند کی گئی، اور گواہیوں کا یہ صحیفہ شرعی اصول کے مطابق حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت کثیر بن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالے کیا گیا کہ وہ خود جا کر حضرت معاویہؓ کو پہنچائیں، حجر بن عدیؒ اور ان کے بارہ ساتھی بھی ان ہی دو حضرات صحابہ کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

اس کے ساتھ زیاد نے حضرت معاویہؓ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

> "اللہ نے امیرالمومنین سے بڑی بلا دور کر کے احسان فرمایا ہے کہ آپ کے دشمنوں کو زیر کر دیا، ان ترابی اور سبائی سرکشوں نے جن کے سرگروہ حجر بن عدی ہیں، امیرالمومنین کے خلاف بغاوت کی تھی، اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالا تھا، اور ہمارے خلاف جنگ ٹھان لی تھی، اللہ نے ہمیں ان پر غلبہ عطا فرمایا اور ہمیں ان پر قابو دے دیا، میں نے شہر کے چیدہ صلحاء، اشراف، معمر اور بزرگ افراد کو بلایا تھا انہوں نے جو کچھ دیکھا اس کی شہادت دی، اب ان لوگوں کو میں نے امیرالمومنین کے پاس بھیج دیا ہے اور اہل شہر کے صلحاء کی گواہی میں نے اپنے اس خط کے ساتھ بھیج دی ہے۔"[3]

اس طرح یہ مقدمہ حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ نے حضرت معاویہؓ

---

[1] تہذیب التہذیب ص ۲۳۸ ج ۱

[2] الطبری ص ۲۰۱، ج ۴

[3] ایضاً ص ۲۰۲ ج ۴

کی خدمت میں پیش کیا۔

حضرت معاویہؓ کو حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کی شورشوں کا پہلے ہی کافی علم ہو چکا تھا، اب ان کے پاس چوالیس قابل اعتماد گواہیاں ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر پہنچ گئیں، ان گواہوں میں حضرت وائل بن حجرؓ، حضرت کثیر بن شہابؓ، حضرت عمرو بن حریثؓ اور حضرت خالد بن عرفطہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی تھے اور حضرت ابوبردہؒ، حضرت موسیٰ بن طلحہ اور حضرت اسحاق بن طلحہؒ جیسے فقہاء و محدثین اور صلحائے امت بھی، حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کے جرم بغاوت کو ثابت کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ ان کا یہ جرم روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا اور ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا "موت" ہے۔

لیکن حضرت معاویہؓ نے اپنے طبعی حلم اور بردباری کی بناء پر قتل کے فیصلے میں جلدی نہیں کی، چنانچہ زیاد کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :

> "حجرؓ اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو واقعات تم نے لکھے وہ میں نے سمجھ لئے، تم نے جو شہادتیں بھیجیں ان سے بھی باخبر ہو گیا، اب میں اس معاملے میں غور کر رہا ہوں، کبھی سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کو قتل کروا دینا ہی بہتر ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ قتل کی بہ نسبت معاف کر دینا افضل ہے۔ والسلام

زیاد نے اس کے جواب میں لکھا کہ :

> حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی رائے مجھے معلوم ہو گئی، مجھے تعجب ہے کہ آپ کو اس معاملے میں تردّد کیوں ہے، حالانکہ ان لوگوں کے خلاف ان حضرات نے گواہی دی ہے جو ان لوگوں کو زیادہ جانتے ہیں، لہٰذا اگر آپ کو اس شہر (کوفہ) کی ضرورت ہو تو آپ حجر اور ان ساتھیوں کو میرے پاس واپس نہ بھیجیں۔"[1]

اس کے باوجود حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حجر بن عدیؓ کے بارے میں ایک صاحب نے سفارش کی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا :

---

[1] الطبری ۲۰۳ ج ۴

"یہ تو ان سب لوگوں کے سردار ہیں' اور اگر میں نے ان کو چھوڑ دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پھر شہر میں فساد کریں گے۔"[1]

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا۔

حجر بن عدیؒ کے عبادت و زہد کی دور دور شہرت تھی' اس لئے جب حضرت عائشہؓ کو علم ہوا کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے نام پیغام بھیجا کہ حجر بن عدیؒ کو رہا کر دیں' پیغام حضرت معاویہؓ کو اس وقت ملا جب وہ قتل کا حکم صادر فرما چکے تھے لیکن انہوں نے فوراً ایک قاصد جلادوں کے پاس روانہ کیا کہ ابھی حجر بن عدیؒ کو قتل نہ کریں لیکن جب یہ قاصد پہنچا' تو حجرؒ اور ان کے چھ ساتھی قتل کئے جا چکے تھے۔[2]

یہ ہے حجر بن عدیؒ کے قتل کا وہ واقعہ جو خود مولانا مودودی کے حوالوں سے ماخوذ ہے[3] ہم نے یہ واقعہ انہی کتب سے لیا ہے جن کا مولانا مودودی نے حوالہ دیا ہے اور زیادہ تفصیلات طبری سے نقل کی ہیں جو مولانا کا پسندیدہ ماخذ ہے۔ اگرچہ طبریؒ نے اس واقعہ میں تقریباً تمام روایات ابو مخنف کے حوالے سے بیان کی ہیں جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ نہایت نا قابل اعتماد شیعہ راوی ہے۔ اور اس نے یہ روایت اپنے جن استادوں سے لی ہے ان کے بارے میں بھی ہم "حضرت علی پر سبّ وشتم" کے عنوان کے تحت بتلا چکے ہیں کہ وہ شیعہ تھے[4] لیکن خود ان شیعہ راویوں نے حجر بن عدیؒ کا واقعہ جس طرح نقل کیا ہے وہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اب آپ مولانا مودودی صاحب کی عبارت ایک بار پھر پڑھئے۔ مولانا نے اس واقعہ کے اہم ترین اجزاء کو یکسر حذف کر کے جس طرح یہ واقعہ ذکر کیا ہے اس سے یہ تاثر قائم

---

[1] الطبری ص ۲۰۴ ج ۴

[2] البدایہ والنہایہ ص ۵۴ ج ۸ و طبقات ابن سعد ص ۲۱۹ و ۲۲۰ ج ۶ جزو ۲۲ و ابن خلدون ص ۲۹ ج ۳

[3] طبقات ابن سعد کا حوالہ اگرچہ مولانا نے نہیں دیا لیکن ان کی جتنی باتیں ہم نے بیان کی ہیں وہ سب البدایہ والنہایہ میں بھی موجود ہیں جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے۔

[4] لہٰذا جیسا کہ ہم آگے وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے' ان روایات کا وہ حصہ نا قابل اعتماد ہے جن میں بعض صحابہؓ کی طرف حضرت علیؓ کے خلاف سبّ و شتم کو منسوب کیا گیا ہے۔

ہوتا ہے کہ :

۱ ۔ حجر بن عدی قطعی طور پر بے گناہ تھے۔

۲ ۔ اصل گناہ حضرت مغیرہؓ اور زیاد کا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو بر سر منبر گالیاں دیا کرتے تھے۔

۳ ۔ حجر بن عدیؒ نے اس گناہ پر ان دونوں کو ٹوکا۔

۴ ۔ اس ٹوکنے کی پاداش میں زیاد نے انہیں گرفتار کر لیا۔

۵ ۔ شہادتیں لینے کا ذکر بھی مولانا نے اس طرح کیا ہے کہ گویا ساری شہادتیں جھوٹی تھیں اور کرائے کے چند گواہ جمع کر لئے گئے تھے۔

۶ ۔ اور خواہ مخواہ ان پر بغاوت کا الزام عائد کر کے ان کے خلاف شہادتیں لیں۔

۷ ۔ حضرت معاویہؓ نے بے سمجھے بوجھے غصے میں آ کر قتل کا حکم دے دیا۔

واقعے کی مذکورہ تفصیلات کو ذہن میں رکھ کر انصاف فرمایئے کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بات بھی صحیح ہے؟

پھر واقعے کی اس قطعی طور پر غلط اور خلاف واقعہ تصویر سے مولانا نے پورے زور قلم کے ساتھ اس کلیے کا استنباط کر لیا ہے کہ اس دور میں زبانیں بند کر دی گئی تھیں، ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے تھے، اظہار رائے کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اور حق گوئی کی پاداش قتل قرار پا گئی تھی۔

حضرت معاویہؓ کا معاملہ تو بہت ہی بلند و بالا ہے۔ واقعے کی تمام تفصیلات دیکھنے کے بعد ہمیں تو کہیں زیاد کے بارے میں بھی یہ نظر نہ آ سکا کہ اس نے حجر بن عدیؒ کے معاملے میں اصول شرع کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ حجر بن عدیؒ اور ان کے ساتھیوں نے کھلم کھلا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اگر ان کو اس وقت گرفتار نہ کیا جاتا تو نہ جانے کوفہ میں کتنے مسلمانوں کا خون بہہ جاتا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک صاحب کے سوال کے جواب میں بالکل درست فرمایا کہ۔ "قتله احب الی من ان اقتل معه مائة الف" (حجر بن عدی کا قتل کرنا مجھے زیادہ پسند تھا، بہ نسبت اس کے کہ میں ان کے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کروں)۔[1]

آپ نے دیکھ لیا کہ :

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۵۴ ج ۸

○ (۱) حجر بن عدیؒ اور ان کے ساتھی سرے سے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف تھے۔

○ (۲) حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے مکمل طور سے مطمئن ہو جانے کے باوجود یہ انہیں بار بار بغاوت پر اکساتے رہے اور جب وہ بغاوت پر راضی نہ ہوئے تو ان سے بھی ناراضی کا اظہار کیا۔

○ (۳) حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر سے کبھی حضرت علیؓ کی شان میں کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا ثابت نہیں جسے گالی کہا جاسکے۔

○ (۴) اس کے بجائے یہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر کھلم کھلا لعن طعن کرتے تھے۔

○ (۵) امراء کی بات بات پر ان کے خلاف شورش کرنا ان کی عادت بن گئی تھی۔

○ (۶) حضرت مغیرہؓ اور زیاد نے انہیں اولاً نہایت معقولیت اور شرافت کے ساتھ فہمائش کی کہ ان حرکتوں سے باز آجائیں۔

○ (۷) انہوں نے اس فہمائش کے دوران سکوت اختیار کیا' کوئی شکایت پیش نہیں کی لیکن واپس آکر پھر خلافت معاویہؓ کا انکار کیا اور ان پر لعنت بھیجنی شروع کی' اور گورنر کوفہ حضرت عمرو بن حریثؓ پر پتھر برسائے۔

○ (۸) زیاد نے اس موقع پر بھی کوئی سخت کارروائی کرنے کے بجائے حضرت عدی بن حاتمؓ، حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ اور حضرت خالد ابن عرفطہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کو بھیجا کہ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں' مگر انہوں نے ان سے رخ دے کر بات ہی نہ کی۔

○ (۹) اس موقع پر زیاد نے دھمکی دی کہ "اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو تمہارا علاج اس دوا سے کرونگا جو تمہارے لائق ہے۔" اور اس دھمکی کے ساتھ انہیں پھر سمجھایا کہ امیر المومنین کے تم پر کیا حقوق ہیں مگر حجر بن عدیؒ نے اس موقع پر پھر زیاد پر کنکر برسائے اور کہا کہ "تجھ پر خدا کی لعنت' تو نے جھوٹ کہا۔"

○ (۱۰) انہیں زیاد نے بحیثیت گورنر حکم دیا کہ وہ اس کے پاس آئیں' مگر انہوں نے یہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسری بار آدمی بھیجے گئے' انہوں نے بھی سوائے امیر کا پیغام پہنچانے کے انہیں کچھ نہیں کہا' مگر حجرؒ کے ساتھیوں نے انہیں گالیاں دے کر رخصت

کردیا۔

○ (۱۱) تیسری بار کوفہ کے شرفاء اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا گیا کہ انہیں بلا کر لائیں' انہوں نے بھی شروع میں سوائے اس کے کچھ نہ کہا کہ "امیر کے پاس چلو" لیکن انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ حکم نہیں مانیں گے' اس پر پولیس نے زبردستی کی تو یہ لوگ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لاٹھیوں اور پتھروں سے باقاعدہ لڑائی لڑی اور قابو میں نہ آئے۔

○ (۱۲) پھر کندہ پہنچ کر پورے محلے کو بغاوت کا گڑھ بنا دیا۔ اور باقاعدہ جنگ کی تیاریاں ہوئیں اور رزمیہ اشعار پڑھے گئے۔ اور جب زیاد نے یہاں اپنے آدمی بھیجے تو ان لوگوں نے سخت جنگ کی' اور بالآخر روپوش ہو گئے۔

○ (۱۳) اس کے بعد جب انہیں گرفتار کر لیا گیا تو کہنے لگے "ہم اپنی بیعت پر قائم ہیں۔"

○ (۱۴) چوالیس مقتدر ہستیوں نے ان کے خلاف بغاوت کی شہادت دی' جن میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ' فقہاءؒ اور محدثین شامل تھے' اور اس شہادت میں کسی پر جبر کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

○ (۱۵) ان تمام واقعات سے باخبر ہو کر اور مذکورہ شہادتیں دیکھ کر حضرت معاویہؓ نے ان کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شورش حجر بن عدیؒ اور ان کے اصحاب نے کھڑی کر دی تھی' اگر اسی کا نام "حق گوئی" اور "اظہار رائے" ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بغاوت "فتنہ و فساد" اور "شورش" کے الفاظ لغت سے خارج کر دینے چاہئیں۔

مولانا مودودی صاحب نے یہ دیکھنے کے لئے کہ حجر بن عدیؒ کا قتل شرعاً جائز تھا یا ناجائز ان واقعات کی تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی جو خود کوفہ میں پیش آئے تھے' اور جنہیں علامہ طبریؒ نے کم و بیش دس پندرہ صفحات میں بیان کیا ہے۔ اس کے بجائے اس قتل کے ناجائز ہونے پر ایک خراسان کے گورنر ربیع بن زیاد حارثی کے مجمل قول کا حوالہ دیا ہے جو اس وقت کوفہ اور شام سے سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہا کے ایک محرف ارشاد کا جو اس وقت مدینہ طیبہ میں تشریف فرما تھیں' تیسرے ان جلادوں کے قول کا جنہوں نے حجر بن عدیؒ کو قتل کیا۔ اب ان تینوں اقوال کی حقیقت بھی دیکھ لیجئے۔

جہاں تک ربیع بن زیاد حارثی کا تعلق ہے۔ سو وہ خراسان کے گورنر تھے اور وہیں پر انہیں حجر بن عدیؓ کے قتل کی اطلاع ملی۔ انہوں نے فرمایا کہ "خدایا! اگر تیرے علم میں میرے اندر کوئی خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھالے" ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ حجر بن عدیؓ کے عابد و زاہد ہونے کی بڑی شہرت تھی' اور قدرتی بات یہ ہے کہ جو شخص بھی پورے حالات سے ناواقف رہ کر صرف یہ سنے گا کہ انہیں قتل کر دیا گیا تو وہ لامحالہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرے گا۔ لیکن یہ رنج و افسوس اس شخص کے خلاف کیسے حجت بن سکتا ہے جس کے سامنے چوالیس قابل اعتماد گواہیاں گذر چکی ہوں' اور وہ سب اس بات پر متفق ہوں کہ حجر بن عدیؓ نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے' جہاں تک عبادت و زہد کا تعلق ہے تو وہ اس بات کی وجہ جواز نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کیا جائے' نظیر کے طور پر (بلا تشبیہ و مثال) خارجیوں کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ کچھ کم عابد و زاہد نہ تھے' لیکن کیا امت کا کوئی فرد یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ خارجی بہت زیادہ عابد تھے اس لئے انہیں قتل کرنا حضرت علیؓ کا ناجائز فعل تھا؟

رہ گیا حضرت عائشہؓ کا ارشاد' سو اس کے الفاظ مؤرخین نے مختلف طریقے سے نقل کئے ہیں۔ تاریخ طبریؒ میں ایک جگہ تو یہی الفاظ مذکور ہیں جن کا ترجمہ مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :

"اے معاویہ تمہیں حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا۔"

لیکن خود طبریؒ ہی نے دوسرے مقامات پر' نیز دوسرے بیشتر مؤرخین نے واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ اسی سال حج کو تشریف لے گئے' اور حضرت عائشہؓ سے ملاقات ہوئی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ :

"معاویہ! حجر کے معاملے میں تمہاری بردباری کہاں چلی گئی تھی۔"

ابن جریر طبریؒ' ابن اثیر جزری اور ابن خلدونؒ نے تو یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ۔

این کان حلمک عن حجر[1]

اور حافظ ابن کثیر یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں :

---

[1] الطبری ص ۱۹۱ ج ۴' ابن اثیر ص ۱۹۴ ج ۳' ابن خلدون ۲۹ ج ۳

این ذهب عنک حلمک یا معاویۃ حین قتلت حجراً[1]

"جب تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اس وقت تمہاری بردباری کہاں گئی تھی۔"

امام ابن سعدؒ اور امام ابن عبد البرؒ یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

این عزب عنک حلم ابی سفیان فی حجر واصحابہ

"حجر اور ان کے اصحاب کے معاملے میں تم سے ابو سفیانؓ کی بردبادی کہاں چلی گئی تھی۔"

حضرت عائشہؓ نے جو الفاظ استعمال کئے ان میں "بردباری" کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ کا یہ فعل "انصاف" یا شریعت کے خلاف نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اسے بردباری کے خلاف سمجھتی تھیں، اور اب یہ بھی سن لیجئے کہ خود حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے حجرؓ اور ان کے اصحاب کے بارے میں کیا تھی؟ امام ابن عبد البرؒ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے مذکورہ جملے کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ :

الا حسبتھم فی السجون و عرضتھم لطاعون

"تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ انہیں قید خانوں میں بند رکھتے اور انہیں طاعون کا نشانہ بننے دیتے۔"[2]

یہ تھا حضرت عائشہؓ کے نزدیک بردباری کا زیادہ سے زیادہ تقاضا جو حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ روا رکھی جا سکتی تھی۔ اگر حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی بقول مولانا مودودی صاحب "حق گوئی" ہی کے "مجرم" تھے تو اس "حق گوئی" کی کم سے کم سزا حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی "قید خانہ" ہی تھی۔

بہر کیف! حضرت عائشہؓ کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے "بردباری" کا جواب یہ دیا کہ ام المومنین، آپ جیسے حضرات مجھ سے دور ہیں اور میرے پاس کوئی ایسا بردبار آدمی نہیں رہا جو ایسے مشورے دے سکے[3]، اور جہاں تک قانونی بات تھی آپ نے فرمایا کہ :

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

[2] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۵۵ ج ۱ [3] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۵۵ ج ۱

انما قتله الذین شهدوا علیه

قتل تو انہوں نے کیا جنہوں نے ان کے خلاف گواہی دی۔[1]

اور فرمایا کہ :

فما اصنع کتب الی فیهم زیاد یشدد امرهم ویذکر انهم سیفتقون علی فتقا لا یرقع

"میں کیا کرتا؟ زیاد نے مجھے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کا معاملہ بڑا سنگین ہے، اور اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو یہ لوگ میری حکومت کے خلاف ایسی رخنہ اندازی کریں گے جسے بھرا نہ جا سکے گا۔"[2]

اور آخر میں حضرت معاویہ نے یہاں تک فرمایا کہ :

غداً لی ولحجر موقف بین یدی الله عزوجل

"کل مجھے اور حجر دونوں کو اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا ہونا ہے"[3]

اور

فدعینی وحجراً حتی نلتقی عند ربنا

"لہٰذا میرے اور حجر کے معاملے کو اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیجئے جب ہم دونوں اپنے پروردگار سے ملیں۔"

رہ گئی یہ بات کہ حجر بن عدیؓ کے قتل کے وقت جو بات پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ اگر تم حضرت علیؓ پر لعنت کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے، سو یہ بات علامہ طبریؒ نے ابو مخنف کی روایت سے ذکر کی ہے، اور روایۃً و درایۃً قطعی طور پر جھوٹ ہے، سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو حجر بن عدیؓ کی عبادت و زہد کا تو بہت شہرہ ہے، کیا انہیں شریعت کا یہ معمولی مسئلہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت علیؓ پر لعنت کرنا ایک گناہ ہے اور اگر کسی شخص کو گناہ کے ارتکاب پر اس طرح مجبور کیا جائے کہ اس کی جان خطرے میں ہو تو اس وقت اس گناہ کا ارتکاب کر کے جان بچانا واجب ہو جاتا ہے، اور عزیمت کا تقاضا ہی اس وقت یہ ہوتا ہے کہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

[2] الاستیعاب ص ۳۵۶ ج ۱

[3] البدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

اس گناہ کا ارتکاب کر لیا جائے۔ اور پھر اس روایت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا حجر بن عدی سے سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ وہ حضرت علیؓ پر (معاذ اللہ) لعنت نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم پیچھے تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں کہ نہ حضرت معاویہؓ نے خود کبھی اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا نہ اس معاملے میں ان کے کسی ساتھی نے۔ درحقیقت حجر بن عدیؓ کی گرفتاری کا اصل سبب ان کی بغاوت اور شورش انگیزی تھی' اور کیا حضرت معاویہؓ ایسے بچے تھے کہ ایک باغی ان کے سامنے اپنی جان بچانے کے لئے زبان سے حضرت علیؓ کو برا بھلا کہہ دے تو وہ مطمئن ہو جائیں خواہ اس کی ساری عمر حضرت علیؓ کے نام پر جتھے بنانے اور حکومت کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے میں گزری ہو؟ کیا اب حضرت معاویہؓ کے مخالفین (معاذ اللہ) انہیں عقل' تدبر اور سیاسی بصیرت سے بھی بالکل خالی قرار دیں گے؟ ابو مخنف جیسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ کی مذمت اور ان پر سب وشتم کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے گویا حضرت معاویہؓ کے نزدیک دنیا کا سب سے اہم مسئلہ حضرت علیؓ کی مذمت تھی۔ اور ان کی زندگی کا اہم ترین مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت علیؓ کی مذمت پر آمادہ کیا کریں۔ لیکن کیا حضرت معاویہؓ کی مجموعی زندگی' ان کی سوانح' ان کے فہم و تدبر اور حلم و بردباری کے بے شمار واقعات میں اس خسیس ذہنیت کا کوئی ادنیٰ سراغ بھی ملتا ہے؟

یہاں ہم پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے طبری کے حوالے سے حجر بن عدیؓ کے قتل کے سلسلے میں جتنی روایات پیچھے ذکر کی ہیں ان میں سے بیشتر روایات ابو مخنف ہی کی ہیں' پھر کیا وجہ ہے کہ اس مقام پر ہم اس کی روایت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں؟ لیکن اس اعتراض کا جواب بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ ابو مخنف شیعہ اور حجر بن عدیؓ کا حامی ہے' لہٰذا اصول کا تقاضا ہے کہ ان روایات کو قبول کیا جائے جو حجر بن عدیؓ کے خلاف جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حجر بن عدیؓ کی بغاوت کے واقعات اس قدر ناقابل انکار تھے کہ ابو مخنف ان کا پرزور حامی ہونے کے باوجود ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کے برعکس ابو مخنف کی جو روایات حضرت معاویہؓ کی ذات کو مجروح کرتی ہوں' انہیں ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ حضرت معاویہؓ سے اس کی دشمنی بالکل واضح ہے اور ان کے مقدمے کو کمزور کر کے پیش کرنا اس کی عادت میں داخل ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ایک عیسائی مؤرخ خود اپنے ہم مذہب لوگوں کی کوئی برائی

بیان کرے تو آپ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن اگر وہی مؤرخ (معاذاللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے یا آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے خلاف کوئی ایسی بات لکھے جو مسلمانوں کی روایات سے ثابت نہ ہو تو آپ اسے سراسر جھوٹ اور افتراء قرار دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے مطلب کی باتیں چن کر بددیانتی کا ارتکاب کر رہے ہیں بلکہ اسطرح آپ تنقید روایات کے اس اصول پر عمل کرتے ہیں جو سو فیصد معقول، فطری اور دنیا بھر میں مسلّم ہے۔

سب سے آخر میں مولانا مودودی صاحب نے حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب ایک قول اس طرح ذکر کیا ہے کہ :

"حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا.... دوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا.... تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا...... چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا۔"

("خلافت وملوکیت" ص ۱۶۵-۱۶۶)

لیکن مولانا نے حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب اس مقولے کا آخری جملہ نقل نہیں فرمایا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس جملہ سے اس روایت کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ طبریؒ اور ابن اثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حسن بصریؒ نے آخر میں یہ بھی کہا کہ :

ویلاً لہ من حجر و اصحاب حجر ویا ویلالہ من حجر و اصحاب حجر

"حجر اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے معاویہؓ پر دردناک عذاب ہو ہاں حجر اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ان پر دردناک عذاب ہو۔"[۱]

یہ الفاظ لکھتے وقت ہمارا قلم بھی لرز رہا تھا، مگر ہم نے یہ اس لئے

---

[۱] ابن اثیر ص ۱۹۳ ج ۳ طبع قدیم، طبری ص ۲۰۸ ج ۴

نقل کر دیئے کہ ان ہی جملوں سے اس روایت کی حقیقت واضح ہوتی ہے کیا حضرت حسن بصریؒ سے کسی بھی درجہ میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اس بے دردی اور بے باکی کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی شان میں یہ الفاظ استعمال کیے ہوں گے؟ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کی خواہ کتنی بھرمار کی ہو لیکن ان پر لعن طعن کرنے کو انہوں نے خود بھی "ظلم" اور "زیادتی" قرار دیا ہے۔ کیا حضرت حسن بصریؒ سے اس ظلم عظیم کی توقع کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے جو ان سے واقف ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بھی ابو مخنف کی ہے (ملاحظہ ہو طبری) اور یہ بلاشبہ حضرت حسن بصریؒ پر اس کا بہتان و افتراء ہے جسے کسی حال درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ حضرت حسن بصریؒ تو وہ ہیں کہ مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں مشہور اور مستند مفسر علامہ قرطبیؒ نے ان کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ :

"وقد سئل الحسن البصری عن قتالهم فقال :قتال شهده اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم وغبنا' وعلموا وجهلنا' واجتمعوا فاتبعنا' واختلفوا فوقفنا' قال المحاسبی' فنحن نقول کما قال الحسن۔"

اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کی باہمی جنگ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب' وہ سب حالات سے واقف تھے' ہم ناواقف ہیں' جس چیز پر ان کا اتفاق ہے' ہم اس میں ان کی اتباع کرتے ہیں' اور جس میں اختلاف ہو گیا اس میں توقف اور سکوت اختیار کرتے ہیں" حضرت محاسبیؒ نے فرمایا کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے کہی[1]"

---

[1] القرطبیؒ : الجامع لاحکام القرآن ص ۳۲۲ ج ۱۶

غور فرمائیے کہ جو حسن بصریؒ صحابہؓ کی باہمی لڑائیوں میں کسی ایک کی طرف اجتہادی غلطی منسوب کرنے میں بھی تامل کرتے ہوں' وہ حضرت معاویہؓ کو عذاب جہنم کی بد دعا دے کر یہ بات آخر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے چار کام ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ان کی ہلاکت کے لئے کافی ہے؟ نعوذ باللہ منہ!

حضرت معاویہؓ

کے زمانے میں اظہار رائے کی آزادی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ پر یہ اعتراض کہ ان کے دور میں اظہار رائے کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا تھا ان پر اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ ہم یہاں چند واقعات مختصراً ذکر کرتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا۔

(ا) حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ اپنے کسی کام سے حضرت معاویہؓ کے پاس تشرف لے گئے' وہ خود فرماتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا :

"مسور! آپ ائمہ (امراء) پر جو طعن کیا کرتے ہیں اس کا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا : "اس وقت اس بات کو رہنے دیجئے' اور جس کام کے لئے ہم آئے ہیں' اس میں ہمارے ساتھ نیک سلوک کیجئے" مگر حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ :

"نہیں' آپ مجھے اپنے دل کی ساری باتیں بتایئے۔" حضرت مسورؓ فرماتے ہیں کہ اس پر میں جتنے عیب ان پر لگایا کرتا تھا وہ سب بیان کر دیئے' ایک نہیں چھوڑا' حضرت معاویہؓ نے سن کر فرمایا : "گناہوں سے کوئی بری نہیں' کیا آپ اپنے اندر ایسے گناہ محسوس نہیں کرتے جن کے بارے میں آپ کو یہ خوف ہو کہ اگر اللہ نے انہیں معاف نہ فرمایا تو آپ کو ہلاک کر دیں گے؟"

میں نے عرض کیا : "ہاں میرے بھی ایسے گناہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہ فرمائے تو میں ان کے سبب سے ہلاک ہو جاؤں۔" حضرت معاویہؓ نے فرمایا : "پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ مغفرت کا مستحق سمجھتے ہیں؟ خدا کی قسم! میں عوام کی

اصلاح، حدود شرعیہ کی اقامت اور جہاد فی سبیل اللہ کی جن خدمات میں مشغول ہوں، وہ ان عیوب سے زیادہ ہیں جو آپ نے بیان کئے۔ اور میں ایک ایسے دین کا پیرو ہوں جس میں خدا حسنات کو قبول فرماتا اور سیئات سے درگزر فرماتا ہے۔"

اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے فرمایا :

"واللہ علیٰ ذلک ما کنت لاخیر بین اللہ وغیرہ الا اخترت اللہ علیٰ غیرہ مما سواہ"

"اس کے علاوہ وہ خدا کی قسم! جب بھی مجھے اللہ اور غیر اللہ کے درمیان اختیار ملتا ہے، میں اللہ کے سوا اور کسی کو اختیار کرنے والا نہیں ہوں۔"

حضرت مسور بن مخرمہؓ فرماتے ہیں کہ "ان کے ارشادات پر میں غور کرتا رہا تو مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے واقعتہً دلائل میں مجھے مغلوب کردیا۔" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت مسور رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بھی حضرت معاویہؓ کا ذکر کرتے تو ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔[1]

(۲) حافظ ابن کثیرؒ نقل فرماتے ہیں کہ "ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو ان کے منہ پر بہت برا بھلا کہا اور ان کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آیا۔ کسی نے کہا کہ "آپ اس پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟" حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ :

"انی لاستحیی من اللہ ان یضیق حلمی عن ذنب احد من رعیتی[2]"

"مجھے اللہ سے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میری بردباری میری رعایا کے کسی گناہ سے تنگ ہو جائے۔"

(۳) ابن خلدونؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کو چھیڑا، اور مذاق میں انہیں حضرت علیؓ کا ساتھ دینے پر توبیخ کی، اس کے جواب میں حضرت عدیؓ نے فرمایا : "خدا کی قسم! جن دلوں سے ہم نے تمہیں بُرا سمجھا تھا وہ ابھی

---

[1] یہ واقعہ حافظ ابن کثیرؒ نے مصنف ابن عبدالرزاقؒ کے حوالے سے دو سندوں کے ساتھ ذکر فرمایا ہے (البدایہ والنہایہ ص ۱۳۴ ج ۸)

[2] البدایہ ص ۱۳۵ ج ۸

ہمارے سینوں میں ہیں' اور جن تلواروں سے تمہارا مقابلہ کیا تھا' وہ ابھی ہمارے کاندھوں پر لٹکی ہوئی ہیں اور اب اگر تم غدر کی طرف ایک بالشت بڑھے تو ہم جنگ کی طرف دو ہاتھ بڑھ جائیں گے' اور یاد رکھنا کہ ہمیں اپنی شہ رگ کٹنے کی آواز اور سینے سے نکلنے والی موت کی سسکیاں زیادہ محبوب ہیں' بہ نسبت اس کے کہ ہم علیؓ کے بارے میں کوئی بری بات سنیں۔"

حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر لوگوں سے فرمایا : "یہ ساری باتیں حق ہیں' انہیں لکھ لو۔" اس کے بعد وہ دیر تک حضرت عدیؓ سے باتیں کرتے رہے۔[1]

(۴) عبداللہ بن عمیر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو بہت دیر تک سخت سُست کہا' حضرت معاویہؓ خاموش رہے تو لوگوں نے کہا : "کیا آپ اس پر بھی بردباری کا مظاہرہ فرمائیں گے؟" حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ "میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا' الا یہ کہ وہ ہماری حکومت کے درمیان حائل ہونے لگیں[2]" یعنی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔

(۵) ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنر زیاد کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ :

> "لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایک جیسا طرز عمل اختیار کرنا ٹھیک نہیں' نہ اتنی نرمی کرنی چاہئے کہ وہ اترا جائیں اور نہ اتنی سختی کہ وہ لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دے' بلکہ ایسا کرو کہ سختی کے لئے تم کافی ہو جاؤ اور رحمت والفت کے لئے میں' تاکہ اگر کوئی شخص خوف کی حالت میں ہو تو اسے داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ مل جائے۔"[3]

(۶) علامہ ابن اثیرؒ نقل فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن الحکم ایک شاعر تھے' شاعروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ امراء کی مدح میں قصیدے کہا کرتے ہیں' حضرت معاویہؓ نے ان سے فرمایا :

> "مدح سے بچو اس لئے کہ وہ بے حیاؤں کی غذا ہے"[4]

---

[1] ابن خلدونؒ ص ۷ ج ۳
[2] ابن اثیر ص ۵ ج ۴
[3] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۸
[4] ابن اثیر ص ۵ ج ۴

(۷) طبرانیؒ اور حافظ ابن عساکرؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے' خطبے میں "فرار من الطاعون" کی حدیث ذکر فرمائی' اس میں کوئی فروگذاشت ہوگئی تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ کے بیچ ہی میں کھڑے ہو کر فرمایا :

"تمہاری ماں ہندہ تم سے زیادہ عالم تھی۔"

حضرت معاویہؓ نے نماز کے بعد حضرت عبادہؓ کو بلا کر اس طرز کلام پر تو زبانی تنبیہہ فرمائی مگر جب ان سے تحقیق ہوگئی کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح حضرت عبادہؓ بیان فرما رہے تھے تو عصر کی نماز کے بعد منبر سے خود اعلان فرمایا کہ :

"میں نے تم سے منبر پر ایک حدیث ذکر کی تھی' گھر جا کر پتہ چلا کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح عبادہؓ کہتے ہیں' لہٰذا انہی سے استفادہ کرو' کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔"[۱]

حضرت معاویہؓ اور ان کے عہد حکومت کی ایک تصویر یہ ہے جو ان جیسے[۲] بے شمار واقعات سے سامنے آتی ہے مگر مولانا مودودی صاحب ان کے عہد حکومت کی منظر کشی اس طرح فرماتے ہیں کہ :

"ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے' زبانیں بند کر دی گئیں' اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو' ورنہ چپ رہو' اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زور دار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ' چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین

---

[۱] ابن عساکر ص ۲۱۰ و ۲۱۱ ج ۷ "عبادۃ بن الصامت"

[۲] مذکورہ سات واقعات ہم نے بغیر کسی خاص جستجو کے سرسری طور سے لکھ دیئے ہیں' ورنہ اس قسم کے واقعات جو یہ مضمون لکھتے وقت ہماری نظر سے گزرے ہیں' اتنے زیادہ ہیں کہ بلا مبالغہ ان سے ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ :

"واخبارہ فی الحلم کثیرۃ"

(ان کی بردباری کے واقعات بہت ہیں)

سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔" (ص ۱۶۳ و ۱۶۴)

اور اس عمومی منظر کشی کی دلیل کیا ہے؟ صرف ایک حجر بن عدیؓ کا واقعہ جس کی حقیقت پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت معاویہؓ کی قبر کو نور سے بھر دے ان کے درجات کی بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ کیسے کیسے سامان مہیا فرما رہے ہیں؟

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک مشہور اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا' چنانچہ جناب مولانا مودودی صاحب نے بھی یہ اعتراض کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام خالص اپنے مفاد کے لئے کیا تھا' وہ لکھتے ہیں :

> "یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی' بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد کیلئے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کرکے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کرلیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔"
>
> (خلافت وملوکیت ص ۱۵۰)

اس کے بعد انہوں نے ابن اثیرؒ وغیرہ کی مختلف روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کے لئے بیعت لینے میں جبرواکراہ' خوف وطمع اور رشوت کے ذرائع سے کھلم کھلا کام لیا۔

اس موضوع پر اپنی گفتگو شروع کرنے سے قبل ہم ابتداء ہی میں یہ بات صاف کردینا چاہتے ہیں کہ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں :

(۱) حضرت معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے' تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا غلط؟

(۲) دوسرے یہ کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام نیک نیتی کے ساتھ جواز شرعی کی حدود میں

رہ کر کیا تھا یا خالص اپنے ذاتی مفاد کے لئے حدود اللہ کو پامال کرکے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس میں ہمیں مولانا مودودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے۔ جمہور امت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا۔ اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا۔ لہٰذا اگر مولانا مودودی صاحب اپنی بحث کو اس حد تک محدود رکھتے تو ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

البتہ مولانا سے ہمارا اختلاف دوسرے مسئلے میں ہے' مولانا نے حضرت معاویہؓ کے اس اقدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ براہ راست حضرت معاویہؓ کی نیت پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیش نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا۔ اور اس ذاتی مفاد پر انہوں نے پوری امت کو قربان کر دیا۔

جمہور امت کا موقف اس معاملے میں یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بلحاظ تدبیر و رائے تو غلط کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے لہٰذا ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اقدام واقعے کے اعتبار سے سو فیصد درست اور نفس الامر میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بالکل ٹھیک کیا' بلکہ ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے' انہوں نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور خلافت کا مسئلہ ہمارے زمانے میں بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس مسئلے پر بحث و مباحثہ کی گرم بازاری نے مسلمانوں میں دو ایسے گروہ پیدا کر دیئے ہیں جو افراط و تفریط کی بالکل آخری حدود پر کھڑے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو یزید کو کھلا فاسق و فاجر قرار دے کر حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر مفاد پرستی' خود غرضی' رشوت ستانی اور ظلم و عدوان کے الزامات عائد کر رہا ہے' دوسری طرف ایک گروہ ہے جو یزید کو فرشتہ قرار دیکر حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کو ہوس اقتدار' جاہ طلبی اور انتشار پسندی کا مجرم بنا رہا ہے اور جمہور امت نے اعتدال کا جو راستہ اختیار کیا تھا' وہ مناظرے کے جوش و خروش میں دونوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا

ہے۔

اس افراط و تفریط کی ساری وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات کو موجودہ زمانے کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات پر قیاس کرلیا گیا ہے اور چونکہ آج کی مفاد پرست دنیا میں یہ تصور مشکل ہی سے آتا ہے کہ دو مخالف سیاسی جماعتیں بیک وقت نیک نیتی کے ساتھ کسی صحیح' جائز اور نیک مقصد کے لئے ایک دوسرے سے لڑ سکتی ہیں' اس لئے صحابہ کرامؓ کی جماعتوں کے بارے میں بھی یہ تصور کرنا مذکورہ گروہوں کو مشکل نظر آتا ہے' نتیجہ یہ ہے کہ وہ سرسری طور پر کسی ایک جماعت کے برحق اور نیک نیت ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں' اور یہ فیصلہ ذہن میں جما کر اس کی تائید و حمایت کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دوسرے فریق کے صحیح موقف کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اس پر الزامات و اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کردیتے ہیں۔

ہم دونوں فریقوں کو سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو جمعہ کے دن ہر خطبے میں دہرایا جاتا ہے کہ :

اللہ اللہ فی اصحابی' لا تتخذوھم غرضا من بعدی

میرے صحابہ کے معاملے میں خدا سے ڈرو' خدا سے ڈرو' میرے بعد انہیں (اعتراضات) کا نشانہ مت بنانا۔

ہم سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا واسطہ دیکر یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ صحابہ کرامؓ کی عظمت شان کو پیش نظر رکھ کر ان کے صحیح موقف کو ٹھنڈے دل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں' اور دل سے بدگمانیوں کا غبار دھو کر اس مسئلے پر غور فرمائیں۔

اس دردمندانہ گزارش کے بعد ہم اس مسئلے میں اپنے مطالعے کا حاصل پیش کرتے ہیں' یہاں تین چیزیں قابل غور ہیں :۔

(۱) ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) یزید خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟

(۳) ان روایات کی کیا اصلیت ہے جن میں یزید کی بیعت کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے کام لینے کا ذکر کیا گیا ہے؟ ہم مسئلے کے ان تینوں گوشوں پر مختصر گفتگو کرتے ہیں :

ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت

یہاں دو مسئلے قابل تحقیق ہیں، ایک یہ کہ کوئی خلیفہ وقت اپنے بعد کے لئے کسی کو، خاص طور سے اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا ولی عہد بنا دے تو اس کی یہ وصیت امت پر لازم ہو جاتی ہے یا اس کی وفات کے بعد اہل حل و عقد کی منظوری کی پابند رہتی ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے، اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفہ وقت اگر کسی شخص میں نیک نیتی کے ساتھ شرائط خلافت پاتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کو ولی عہد بنا دے، خواہ وہ اس کا باپ بیٹا یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، البتہ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر وہ اس کا باپ یا بیٹا ہو تو اہل حل و عقد کے مشورے کے بغیر ولی عہد بنانا بھی جائز نہیں ہے۔[1]

رہا دوسرا مسئلہ تو اس میں علامہ ماوردیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور ابن خلدونؒ کے بیانات سے تو بڑے توسعات معلوم ہوتے ہیں، ان کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر کوئی خلیفہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنا دے جس میں خلافت کی اہلیت ہو تو اس کی وصیت ساری امت پر لازم ہو جاتی ہے اور اس کا نفاذ اہل حل و عقد کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتا، لیکن علماء محققین کی رائے یہی ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے، اور جب تک امت کے ارباب حل و عقد اسے منظور نہ کرلیں، یہ تجویز امت پر واجب العمل نہیں ہوتی، خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ کی گئی ہو بلکہ امت کے ارباب حل و عقد کو حق ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو باہمی مشورے سے اس تجویز کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کردیں۔ اسلامی سیاست کے مشہور عالم اور مصنف قاضی ابو یعلی الفراء الحنبلیؒ (متوفی ۴۵۸ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ :

> "خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی شخص کو ولی عہد بنائے
> اور اس معاملہ میں اہل حل و عقد کی موجودگی کوئی ضروری نہیں ہے اس

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۵ جلد اول مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ والاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۸، المطبعۃ المحمودیۃ مصر، الاحکام السلطانیہ لابی یعلی الفراء ص ۹ مصطفی البابی مصر ۱۳۵۶ھ، مقدمہ ابن خلدون ص ۳۷۶ و ۳۷۷ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ء

لئے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنایا' اور حضرت عمرؓ نے چھ صحابہ کرام کو یہ فریضہ سپرد کیا' اور سپرد کرتے وقت کسی نے بھی اہل حل و عقد کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ولی عہد بنانا اس کو خلیفہ بنانا نہیں ہے۔ ورنہ ایک ہی زمانے میں دو خلفاء کا اجتماع لازم آجائے گا جو جائز نہیں ہے' اور جب یہ خلافت کا عقد نہیں ہے تو اہل حل و عقد کی موجودگی بھی ضروری نہیں' ہاں ولی عہد بنانے والے کی وفات کے بعد ان کی موجودگی ضروری ہے۔"

چند سطروں کے بعد وہ لکھتے ہیں :

"خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اس کے ساتھ باپ یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو' بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو' اس لئے کہ خلافت محض ولی عہد بنانے سے منعقد نہیں ہو جاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منعقد ہوتی ہے۔ اور اس وقت ہر تہمت دور ہو جاتی ہے۔"[1]

محقق علماء کے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ اگر خلیفہ وقت تنہا اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد بنا دے تو اس کے لئے تو یہ جائز ہے' لیکن اس کا یہ فیصلہ ایک تجویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے امت کے اہل حل و عقد اس کی وفات کے بعد قبول بھی کر سکتے ہیں اور رد بھی۔ دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد تو بلاشبہ بنایا تھا' لیکن بنانے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اہل شوری سے استصواب فرمایا اور جب دیکھا کہ تمام لوگ ان پر متفق ہیں' تب اپنے فیصلے کا اعلان فرمایا۔[2] نیز ان کی وفات کے بعد بھی امت ان پر متفق ہو گئی۔

---

[1] ابو یعلی الفراء: الاحکام السلطانیہ ص ۹' مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۵۶ھ' عبارت یہ ہے'

ویجوز ان یعهد الی من ینتسب الیه بابوة او بنوة اذا کان المعهود له علی صفات الائمة لان الامامة لا تنعقد للمعهود الیه بنفس العهد وانما تنعقد بعهد المسلمین' والتهمة تنتفی عنه

[2] ملاحظہ ہو الطبری ص: ۶۱۸ ج ۲ والامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ ص ۱۹ و ۲۰ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۶ھ

اس تفصیل سے دو باتیں بہرحال واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) اگر کوئی خلیفہ وقت نیک نیتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو خلافت کا اہل سمجھتا ہے تو وہ اسے اپنا ولی عہد مقرر کر سکتا ہے' یہ بات علماء کے ان دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) علماء محققین کے نزدیک بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لئے ارباب حل و عقد سے مشورہ کرنا اور ان کا منظور کرنا ضروری ہے اس کے بغیر اس کی خلافت منعقد نہیں ہوتی' اور یہی قول صحیح و مختار ہے' البتہ ایک جماعت اس بات کی بھی قائل رہی ہے کہ خلیفہ وقت تنہا اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اہل حل و عقد کی منظوری کی بھی ضرورت نہیں ہے' اور اس کی وصیت تمام امت پر لازم ہو جاتی ہے۔

اب یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر غور فرمائیے' مندرجہ بالا احکام کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیانت داری سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے تو اسے ولی عہد بنا دینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا۔ اگر وہ یہ کام پوری امت کے مشورے سے کرتے تب تو باتفاق ان کا یہ فیصلہ ہر فرد کے لئے واجب الاتباع ہوتا' اور اگر تنہا اپنی رائے سے کرتے تو ان کے فعل کی حد تک تو یہ فیصلہ باتفاق جائز تھا اور علماء کے ایک گروہ کے نزدیک امت کے لئے واجب العمل بھی تھا' لیکن علماء کے راجح قول کے مطابق اس سے اہل و حل عقد کی منظوری کے بغیر یزید کی خلافت منعقد نہیں ہو سکتی تھی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا یا محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے؟

کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل ہے۔ متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ کے صاحبزادے حضرت سعید بن عثمانؓ نے آکر حضرت معاویہؓ سے شکایت کی کہ "آپ نے

یزید کو ولی عہد بنا دیا ہے' حالانکہ میرا باپ اس کے باپ سے میری ماں اسکی ماں سے اور خود میں اس سے افضل ہوں۔" حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم! تمہارے والد مجھ سے بہتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے۔ تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے افضل ہے' لیکن جہاں تک یزید کا تعلق ہے' اگر سارا غوطہ تم جیسے آدمیوں سے بھر جائے تو بھی یزید تم سے بہتر اور زیادہ محبوب ہو گا۔" حضرت معاویہؓ کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ کسی ذاتی برتری کے تصور یا رشتے کی بناء پر یزید کو افضل نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ ان کی دیانت دارانہ رائے یہی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک خطبہ میں یہ دعا فرمائی کہ :

اللھم ان کنت تعلم انی ولیتہ لا نہ فیما اراہ اھل لذلک فاتمم لہ ماولیتہ وان کنت ولیتہ لانی احبہ فلا تتمم لہ ماولیتہ[1]

"اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید کو) اس لئے ولی عہد بنا لیا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس کے لئے پورا فرما دے اور اگر میں نے اس لئے اس کو ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما۔"

اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے عطیہ بن قیس کے حوالہ سے اس دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں :

اللھم ان کنت عھدت لیزید لما رایت من فضلہ فبلغہ ما املت واعنہ و ان کنت انما حملنی حب الوالد لولدہ و انہ لیس لما صنعت بہ اھلا فاقبضہ قبل ان یبلغ ذلک[2]

"اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچا دے جس کی میں نے اس کے لئے امید کی ہے'

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۸۰ ج ۸

[2] الذھبیؒ: تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر و الاعلام ص ۲۶۷ ج ۲: مکتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۶۸ھ و السیوطیؒ تاریخ الخلفاء ۱۵۷ اصح المطابع' کراچی ۱۳۷۸ھ

اور اس کی مدد فرما' اور اگر مجھے اس کام پر صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے
جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے تو اس کے مقام خلافت تک پہنچنے سے پہلے
اس کی روح قبض کر لے"

غور کرنے کی بات ہے کہ جس باپ کے دل میں چور ہو' کیا وہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر قبولیت کی گھڑی میں اپنے بیٹے کے لئے ایسی دعا کر سکتا ہے؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس پر خلوص دعا کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انہوں نے یزید کو نا اہل سمجھنے کے باوجود محض بیٹا ہونے کی وجہ سے خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو یہ اتنا بڑا تحکم ہے جس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ کسی شخص کی نیت پر حملہ کرنا زندگی میں بھی شریعت نے جائز قرار نہیں دیا، چہ جائیکہ اس کی وفات کے ساڑھے تیرہ سو برس بعد اس ظلم کا ارتکاب کیا جائے۔

یزید کی جو مکروہ تصویر عموماً ذہنوں میں بسی ہوئی ہے' اس کی بنیادی وجہ کربلا کا المناک حادثہ ہے' ایک مسلمان کے لئے واقعتہً یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ جس شخص پر کسی نہ کسی درجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے کے قتل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' اسے صالح اور خلافت کا اہل قرار دیا جائے۔ لیکن اگر حقیقت حال کی واقعی تحقیق مقصود ہو تو اس معاملے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا جا رہا تھا' اس وقت حادثہ کربلا واقع نہیں ہوا تھا اور کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یزید کی حکومت میں حضرت حسینؓ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس وقت یزید کی شہرت جھوٹوں کو بھی اس حیثیت سے نہیں تھی جس حیثیت سے آج ہے۔ اس وقت تو وہ ایک صحابی اور ایک خلیفۂ وقت کا صاحبزادہ تھا۔ اس کے ظاہری حالات' صوم و صلوٰۃ کی پابندی' اس کی دینوی نجابت' اور اس کی انتظامی صلاحیت کی بناء پر یہ رائے قائم کرنے کی پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے' اور صرف یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے نہیں تھی' بلکہ بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابہؓ اور تابعین بھی یہ رائے رکھتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ بلاذریؒ مورخ مدائنیؒ کے حوالے سے امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں :

"قال عامر بن مسعود الجمحی انا بمکۃ اذمر بنا برید ینعی

معاویۃ فنھضنا الی ابن عباسؓ وھو بمکۃ وعندہ جماعۃ وقد
وضعت المائدۃ ولم یوت بالطعام فقلنا لہ یا ابن عباس جاء
البرید بموت معاویۃ فوجم طویلاً ثم قال اللھم اوسع لمعاویۃ
اما واللہ ما کان مثل من قبلہ ولا یاتی بعدہ مثلہ وان ابنہ یزید لمن
صالحی اھلہ فالزموا مجالسکم واعطوا طاعتکم و بیعتکم"۔ [1]

عامر بن مسعود جمحی کہتے ہیں کہ جب ایک قاصد حضرت معاویہؓ کی وفات کی
خبر لے کر آیا تو ہم مکہ مکرمہ میں تھے۔ ہم اٹھ کر حضرت ابن عباسؓ کے
پاس چلے گئے وہ بھی مکہ ہی میں تھے' ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور
دسترخوان بچھ چکا تھا مگر ابھی کھانا نہیں آیا تھا' ہم نے ان سے کہا کہ اے
ابن عباسؓ! قاصد حضرت معاویہؓ کی موت کی خبر لے کر آیا ہے' اس پر وہ
کافی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا کہ "یا اللہ! حضرت معاویہؓ
کے لئے اپنی رحمت کو وسیع فرما دے' خدا کی قسم! وہ اپنوں سے پہلوں کی
طرح نہیں تھے' اور ان کے بعد ان جیسا نہیں آئے گا' اور بلاشبہ ان کا بیٹا
یزید ان کے صالح اہل خانہ میں سے ہے' لہٰذا تم اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو' اور
اپنی طاعت اور بیعت اسے دے دو۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہؒ کے بارے میں حافظ
ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ فتنہ حرہ کے موقعہ پر عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی حضرت محمد
بن حنفیہؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یزید شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑتا ہے' اور کتاب
اللہ کے احکام سے تجاوز کرتا ہے۔" اس کے جواب میں حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا :

قد حضرتہ واقمت عندہ فرایتہ مواظباً علی الصلاۃ متحریا
للخیر یسال عن الفقہ ملازماً للسنۃ

"میں اس کے پاس گیا ہوں' اور ٹھہرا ہوں' میں نے اس کو نماز کا پابند اور
خیر کا طالب پایا' وہ فقہ کے مسائل پوچھتا ہے' اور سنت کا پابند ہے۔"

انہوں نے کہا کہ یزید نے آپ کے سامنے تصنعاً ایسا کیا ہوگا' حضرت محمد بن حنفیہؒ نے

---

[1] البلاذریؒ: انساب الاشراف ص ۳ و ۴ قسم ۲' یروشلم ۱۹۴۰ء

فرمایا کہ "اسے مجھ سے کون سا خوف یا کون سی امید تھی؟ اور کیا اس نے تمہیں خود بتایا ہے تو تم بھی اس کے شریک ہو گئے' اور اگر اس نے تمہیں نہیں بتایا تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ بغیر علم کے شہادت دو۔" انہوں نے کہا کہ "اگرچہ ہم نے دیکھا نہیں لیکن ہم اس خبر کو سچ سمجھتے ہیں" حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا "اللہ نے شہادت دینے والوں کے لئے ایسی بات کہنے کو جائز قرار نہیں دیا' قرآن کا ارشاد ہے۔ الامن شهد بالحق وهم يعلمون۔ لہٰذا مجھے تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے" انہوں نے کہا "شاید آپ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ اس معاملے (یزید کے خلاف بغاوت) کی سرداری آپ کے سوا کسی اور کو ملے' لہٰذا ہم آپ ہی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں" حضرت محمدؒ نے فرمایا کہ "میں قتال کو نہ تابع ہو کر حلال سمجھتا ہوں نہ قائد بن کر"[1]

ان روایات سے یہ بات واضح ہے کہ یزید کے ظاہری حالات ایسے تھے کہ ان کی موجودگی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابی اس کے صالح اور اہل خلافت ہونے کی رائے رکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف اگر اس ماحول کو پیش نظر رکھا جائے' جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں حضرت حسینؓ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حضرت عبداللہ بن عمرؓ' حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہؓ' صلحائے امت اور مدبّرین موجود ہوں' اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لئے نااہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں ہے' زمانہ صحابہ کرامؓ اور کبار تابعین کا تھا' امت میں خیر و صلاح کا دور دورہ تھا' ایسے حالات میں خلافت کیلئے عدالت و تقویٰ کے جس معیارِ بلند کی ضرورت تھی' ظاہر ہے کہ یزید اس پر پورا نہیں اترتا تھا' اسی لئے بعض صحابہ کرامؓ نے اس نامزدگی کی کھل کر مخالفت کی۔

تیسرے صحابہ کرامؓ کا ایک گروہ وہ تھا جو حضرت حسینؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ جیسے صحابہ کے مقابلے میں یزید کو خلافت کے لئے بہتر تو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس خیال سے اس کی خلافت کو گوارا کر رہا تھا کہ امت میں افتراق و انتشار برپا نہ ہو مثلاً حمید بن عبدالرحمان کہتے ہیں کہ میں یزید کی ولی عہدی کے وقت حضرت بشیرؓ کے پاس گیا جو صحابہ میں

[1] البدایہ والنہایہ' ص ۲۳۳ ج ۸

سے تھے' تو انہوں نے فرمایا :

"یقولون انما یزید لیس بخیر امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وانا اقول ذلک ولکن لان یجمع اللہ امۃ محمد احب الی من ان تفترق" [1]

لوگ کہتے ہیں کہ یزید امت محمد میں سب سے بہتر نہیں ہے' اور میں بھی یہی کہتا ہوں لیکن امت محمدؐ کا جمع ہو جانا مجھے افتراق کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یزید کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا یہ اختلاف بھی در حقیقت رائے اور اجتہاد کا اختلاف تھا' اور اس معاملے میں کسی کو بھی مطعون نہیں کیا جا سکتا' حضرت معاویہؓ یزید کو محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے خلافت کا اہل سمجھنے کی وجہ سے' ولی عہد بنانا چاہتے تھے اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت دیانتداری کے ساتھ ان کی ہمنوا تھی اور وہ پانچ صحابہ کرامؓ جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی' وہ کسی ذاتی خصومت یا حرص اقتدار کی بناء پر مخالفت نہیں کر رہے تھے' بلکہ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں' مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے واقعہ کے لحاظ سے سو فیصد درست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا' بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں بلکہ دیانت داری پر مبنی تھی' اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔ ورنہ جہاں تک رائے کا تعلق ہے' جمہور امت کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضرات صحابہؓ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے' جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں :

(۱) حضرت معاویہؓ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا' لیکن ان کا عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا' انہوں نے اس کی

---

[1] الذہبیؒ تاریخ الاسلام ص ۲۶۷ و ۲۶۸ ج ۲

آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظام شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا۔ اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

(۲) بلاشبہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابل اعتماد روایت سے ثابت نہیں اس لئے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جا سکتا تھا' لیکن امت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت و تقویٰ بلکہ ملکی انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بہ درجہا بلند مقام رکھتے تھے' اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلاشبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے۔

یہ درست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے[۱]' (بشرطیکہ اس میں شرائط خلافت موجود ہوں) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو تمام امت میں اس منصب کا سب سے زیادہ لائق ہو۔

(۳) نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا بھی شرعاً جائز تو ہے' لیکن ایک طرف موضع تہمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے' اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے' اسی لئے تمام خلفاء راشدین نے اس سے پرہیز کیا۔ خاص طور سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل اور لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔[۲]

یزید اور اس کی ولی عہدی کے سلسلہ میں ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے' جمہور امت کے معتدل اور محقق علماء کا یہی مسلک ہے' قاضی ابو بکر بن عربی مالکیؒ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں :

---

[۱] الماوردیؒ: الاحکام السلطانیہ ص ۶' المطبعۃ المحمودیہ مصر و ابو یعلی الفراءؒ: الاحکام السلطانیہ ص ۷ مصطفیٰ البابی ۱۳۵۶ھ و ابن العربیؒ: العواصم من القواصم ص ۲۱۱' السلفیۃ ۱۳۷۱ھ و ابن الہمامؒ: المسایرۃ ص ۱۳۶ و ۱۳۷ دار العلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ

[۲] الطبری ص ۲۹۲ ج ۳ و ص ۱۱۲ و ۱۱۳ ج ۴ مطبعۃ الاستقامۃ' القاہرہ ۱۳۵۸ھ

ان معاویۃ ترک الافضل فی ان یجعلھا شوریٰ' والا یخص بھا احدا من قرابتہ فکیف ولدا' وان یقتدی بما اشار بہ عبداللہ ابن الزبیرؓ فی الترک او الفعل

بلاشبہ افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ خلافت کے معاملے کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے' اور اپنے کسی رشتہ دار' اور خاص طور سے بیٹے کے لئے اس کو مخصوص نہ کرتے' اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کو جو مشورہ دیا تھا' ولی عہد بنانے یا نہ بنانے میں اسی پر عمل کرتے' لیکن انہوں نے اس افضل کام کو چھوڑ دیا۔[1]

اور حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

"کان معاویۃ لما صالح الحسن عھد للحسن بالامر من بعدہ فلما مات الحسن قوی امر یزید عند معاویۃؓ ورای انہ لذالک اھلا وذاک من شدۃ محبۃ الوالد لولدہ ولما کان یتوسم فیہ من النجابۃ الدنیویۃ وسیما اولاد الملوک و معرفتھم بالحروب و ترتیب الملک و القیام بابھتہ و کان ظن ان لا یقوم احد من ابناء الصحابۃ فی ھذا المعنی' ولھذا قال لعبد اللہ بن عمرؓ فیما خاطبہ بہ انی خفت ان اذر الرعیۃ من بعدی کالغنم المطیرۃ لیس لھا راع"[2]

"جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کی تھی تو انہی کو اپنا ولی عہد بھی بنایا تھا' لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو یزید کی طرف حضرت معاویہ کا رجحان قوی ہو گیا' ان کی رائے یہ تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے' اور یہ رائے باپ بیٹے کی شدید محبت کی وجہ سے تھی' نیز اس لئے تھی کہ وہ یزید میں دنیوی نجابت اور شاہزادوں کی سی خصوصیت' فنون جنگ سے واقفیت' انتظام سلطنت اور اس کی ذمہ داری پورا کرنے کے صلاحیت

[1] العواصم من القواصم ص ۲۳۲

[2] البدایہ والنہایہ ص ۸۰ ج ۸

دیکھتے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے صاحبزادوں میں سے کوئی اس اعتبار سے بہتر انتظام نہ کر سکے گا' اسی لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے خوف ہے کہ میں عوام کو بکریوں کے منتشر گلے کی طرح چھوڑ کر نہ چلا جاؤں جس کا کوئی چرواہا نہ ہو"

اور علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

یزید کے بارے میں لوگوں کے دو فریق ہیں' اور کچھ لوگ بیچ کی رائے رکھتے ہیں' بعض لوگوں کا اعتقاد تو یہ ہے کہ وہ صحابہ یا خلفائے راشدین یا انبیاء میں تھا' یہ اعتقاد بالکل باطل ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ اور اس کا اصل مقصد اپنے کافر رشتہ داروں کا بدلہ لینا تھا۔ یہ دونوں قول باطل ہیں' ہر عقلمند انسان ان اقوال کو باطل سمجھے گا۔

اس لئے کہ یہ شخص (یزید) مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور شاہی طرز کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا' نہ وہ ایسا تھا (جیسے پہلے گروہ نے کہا) اور نہ ویسا (جیسا دوسرے گروہ نے کہا)۔[1]

اور علامہ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں :

"حضرت معاویہؓ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی' بنوامیہ کے اہل حل و عقد اس پر متفق ہو گئے تھے' کیونکہ وہ اس وقت اپنے علاوہ کسی اور پر راضی نہ ہوتے۔ اور اس وقت قریش کی سربرآوردہ جماعت وہی تھی' اور اہل ملت کی اکثریت ان ہی میں سے تھی' اس لئے

---

[1] ابن تیمیہؒ: منہاج السنۃ ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ج ۲ بولاق مصر ۱۳۲۱ھ عبارت یہ ہے:

الناس فی یزید طرفان ووسط' قوم یعتقدون انہ من الصحابۃ او من الخلفاء الراشدین المهدیین او من الانبیاء و هذا کلہ باطل و قوم یعتقدون انہ کافر منافق فی الباطن و انہ کان لہ قصد فی اخذ ثار کفار اقاربہ من اهل المدینۃ و بنی هاشم۔ و کلا القولین باطل یعلم بطلانہ کل عاقل فان الرجل ملک من ملوک المسلمین و خلیفۃ من الخلفاء الملوک لا هذا و لا هذا

حضرت معاویہؓ نے اس کو ترجیح دی اور افضل سے غیر افضل کی طرف رجوع کیا... حضرت معاویہؓ کی عدالت اور صحابیت اس کے سوا کچھ اور گمان کرنے سے مانع ہے۔"[1]

اصل میں جمہور امت کا طرز عمل صحابہ کرامؓ کے بارے میں ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر ان کے کسی فعل کی کوئی ایسی توجیہ ہو سکتی ہو جو صحابیت کے مقام بلند اور ان کی مجموعی سیرت کے شایان شان ہو تو ان کے فعل کو اسی توجیہ پر محمول کیا جاتا ہے مولانا مودودی صاحب بھی اصولی طور پر اس طریق کار کو درست قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

تمام بزرگان دین کے معاملے میں عموماً اور صحابہ کرام کے معاملہ میں خصوصاً میرا طرز عمل یہ ہے کہ جہاں تک معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو' اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔"

(خلافت و ملوکیت ص: ۳۰۸)

سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کی "معقول تاویل" ممکن ہے' اور بقول مولانا مودودی صاحب "لیپ پوت" یا "بھونڈی وکالت" کے بغیر ان کے اس عمل کو نیک نیتی پر محمول کیا جا سکتا ہے اور جب صورتحال یہ ہے تو خود مولانا کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں انہیں "بدنیت" اور "مفاد پرست" قرار دینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

---

[1] ابن خلدونؒ: مقدمہ ص ۲۷۷ باب ۳ فصل ۳۰ بیروت ۱۹۵۶ء

خلافت یزید کے بارے میں صحابہؓ کے مختلف نظریات

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ

یزید کو ولی عہد بنانے کی ابتدائی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی تھی، جناب مولانا مودودی صاحب نے اس تحریک کو بھی حضرت مغیرہؓ کے ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> "اس تجویز کی ابتداء حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی حضرت معاویہؓ انہیں کوفہ کو گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں اس کی خبر مل گئی۔ فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ "صحابہ اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیرالمومنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں۔" یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا۔ انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو بلا کو پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ جو تم نے یزید سے کہی، حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا "امیرالمومنین آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمان کے بعد کیسے کیسے خون خرابے ہوئے اب بہتر یہی ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف نہ ہو" حضرت معاویہؓ نے پوچھا "اس کام کو پورا کرنے

کی ذمہ داری کون لیگا؟"

انہوں نے کہا "اہل کوفہ کو میں سنبھال لوں گا اور اہل بصرہ کو زیاد" یہ بات کر کے حضرت مغیرہ کوفہ آئے اور تیس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا ...... الخ" (ص ۱۴۸ و ۱۴۹)

مولانا نے یہ قصہ کامل ابن اثیر سے نقل کیا ہے اور ساتھ البدایہ اور ابن خلدونؒ کا حوالہ دے کر یہ کہا ہے کہ ان میں بھی اس واقعے کے بعض حصوں کا ذکر ہے، واقعہ یہ ہے کہ البدایہ اور ابن خلدون میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بناء پر حضرت مغیرہؓ کی اس تجویز کو ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیا جائے۔ ہم یہاں ابن خلدون کی عبارت نقل کر دیتے ہیں جو انہوں نے طبری کے حوالہ سے لی ہے اور البدایہ والنہایہ میں بھی واقعہ کم وبیش اسی طرح نقل کیا گیا ہے :

"حضرت مغیرہؓ حضرت معاویہؓ کے پاس آئے اور ان سے اپنے ضعف کی شکایت کر کے (گورنری سے) استعفیٰ دے دیا۔ حضرت معاویہؓ نے اسے منظور کر لیا اور حضرت سعید بن العاص کو ان کی جگہ گورنر بنانے کا ارادہ کیا، مغیرہؓ کے ساتھیوں نے ان سے کہا کہ معاویہؓ آپ سے ناراض ہو گئے ہیں، انہوں نے کہا "ذرا ٹھہرو" پھر وہ یزید کے پاس پہنچ گئے اور اسکے سامنے بیعت کا معاملہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکابر صحابہ اور قریش کے بڑے لوگ رخصت ہو چکے ہیں[1]..... الخ"

طبریؒ، حافظ ابن کثیرؒ اور ابن خلدونؒ کے بیانات سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو از خود معزول نہیں کیا تھا، بلکہ خود حضرت مغیرہؓ نے اپنے ضعف کی بناء پر استعفاء پیش کیا تھا۔ تاریخ کے اولین ماخذ میں تو واقعہ صرف اتنا ہی لکھا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مغیرہؓ کو گورنری کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ اسکے لئے امت

---

[1] ابن خلدون ص ۳۳ ج ۳۔ بیروت ۱۹۵۷ء عبارت یہ ہے:

ذکر الطبری بسندہ قال قدم المغیرۃ علی معاویۃ فشکا الیہ الضعف فاستعفاہ فاعفاہ و اراد ان یولی سعید بن العاص و قال اصحاب المغیرۃ للمغیرۃ ان معاویۃ قلاک فقال لھم رویدا و نھض الی یزید و عرض لہ بالبیعۃ و قال ذھب اعیان الصحابۃ و کبراء قریش... الخ

محمدیہ کے مفاد کو قربان کر سکتے تھے تو انہوں نے خود آکر استعفاء کیوں پیش کیا؟ اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو علامہ ابن اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب نے دیا ہے' وہ یہ ہے کہ در حقیقت یہ استعفاء بھی اپنی قیمت بڑھانے کی ایک چال تھی۔ انہیں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ حضرت معاویہؓ کسی وجہ سے ان کو معزول کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے یزید کی ولی عہدی کو آڑ بنا کر حضرت معاویہؓ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی مگر یہ سمجھا کہ اگر بحالات موجودہ یہ رائے پیش کروں گا تو حضرت معاویہؓ سمجھ جائیں گے کہ یہ تجویز محض گورنری بچانے کے لئے پیش کی جارہی ہے' اس لئے انہوں نے پہلے مصنوعی طور پر استعفاء پیش کر دیا تاکہ لوگوں پر اور خود حضرت معاویہؓ پر واضح ہو جائے کہ میں ان کا سچا خیر خواہ ہوں اور پھر وہ زبردستی مجھے گورنر بنادیں گے۔

اور دوسرا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے واقعۃً خلوص کے ساتھ اپنے ضعف کی بناء پر استعفاء پیش کیا تھا لیکن جب حضرت معاویہؓ نے کچھ کہے بغیر استعفاء منظور کر کے دوسرے کو گورنر بنانے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمہارے استعفاء دینے سے امیر المومنین ناراض ہو گئے ہیں (جیسا کہ پرانے ماتحت کے اچانک استعفاء دے دینے سے عموماً افسر بالا کو گرانی ہوا کرتی ہے) اس پر حضرت مغیرہؓ نے حضرت معاویہؓ پر یہ واضح کرنا چاہا کہ میں نے کسی رنجش یا ملت کے امور سے عدم دلچسپی کی بناء پر استعفاء نہیں دیا' بلکہ ضعف کی بناء پر استعفاء دیا ہے۔ ورنہ جہاں تک امت کے اجتماعی امور کا تعلق ہے ان سے میری دلچسپی اب بھی برقرار ہے۔ جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ میں حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کو ولی عہد بنانا چاہتا ہوں' جو میری نظر میں خلافت کا اہل ہے اور اس کی ولی عہدی میرے خیال میں امت کو افتراق سے بچا سکتی ہے۔ اور اگر اس مقصد کے لئے مجھے دوبارہ گورنری کی ضرورت پیش آئی تو میں یہ خدمت دوبارہ انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔

اس واقعہ کی جو عبارت طبریؒ' حافظ ابن کثیرؒ اور ابن خلدونؒ نے نقل کی ہے' اس میں واقعے کی ان دونوں توجیہات کی یکساں گنجائش ہے۔ یہ عبارتیں نہ پہلے مفہوم میں صریح ہیں نہ دوسرے مفہوم میں' بلکہ پہلے مفہوم پر بھی کچھ عقلی اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں' اور دوسرے مفہوم پر بھی اور دونوں ہی صورتوں میں واقعے کے مبہم خلاء کو قیاسات سے پر کرنا

پڑتا ہے۔

اب یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ علامہ ابن اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب کو غلطی سے مبرّا ثابت کرنے کے لئے پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں جو حضرت مغیرہؓ کے ساتھ بدگمانی ہی بدگمانی پر مبنی ہے یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی جلالت شان اور صحابیت کے مقام بلند کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرے مفہوم کو اختیار کرتے ہیں جو ہر طرح ان کے شایان شان ہے۔ خود ہمارا ضمیر تو یہ کہتا ہے کہ جس صحابی کی ساری زندگی اسلام کی خدمت میں گزری ہو' جو غزوۂ حدیبیہ کے ان خوش نصیب مجاہدین میں شامل ہو جن سے خوش ہونے کا اعلان خود اللہ نے کردیا ہے۔[1] جس نے اپنی آنکھ غزوۂ یرموک کے مقدس معرکے میں اللہ کے لئے قربان کردی ہو۔[2] جس نے جنگ قادسیہ کے موقع پر پوری امت مسلمہ کا نمائندہ بن کر اپنی قوت ایمانی سے کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا ہو۔[3] جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سو چھتیس احادیث روایت کی ہوں۔[4] اور جو اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اقتدار کی حالت میں گزار کر جاہ و منصب سے سیر ہو چکا ہو وہ محض اپنے اقتدار کی مدت کو کچھ اور بڑھانے کے لئے جھوٹ' فریب' مکر' رشوت' ضمیر فروشی اور امت محمدیہؐ سے غداری جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کا ارتکاب نہیں کر سکتا' اس لئے اس تاریخی قصے کی وہ تعبیر بالکل غلط ہے جو علامہ ابن اثیر اور مولانا مودودی صاحب نے اختیار کی ہے۔

اس واقعے کی اصل حقیقت اور اس کی تعبیر و تشریح کے دونوں رخ ہم نے آپ کے سامنے پیش کردیئے ہیں۔ اب ہم خود مولانا مودودی صاحب ہی کے الفاظ نقل کئے دیتے ہیں جو حضرت علیؓ کے بارے میں انہوں نے لکھے ہیں :

"کسی کا جی چاہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں' مگر ساتھ ہی پھر یہ ماننا

---

[1] تہذیب التہذیب ص ۲۶۲ ج ۱۰ و ابن سعد ص ۲۰ ج ۶ جزو ۲۱

[2] ابن سعد ص ۲۰ ج ۶ جزو ۲۱

[3] البدایہ والنہایہ ص ۳۹ ج ۷

[4] النوویؒ تہذیب الاسماء واللغات ص ۱۰۹ ج ۱ جزو ۲ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر

پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ڈھونگ تھا' قرآن شاعرانہ الفاظی کے سوا کچھ نہ تھا اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں۔"

اور.....

"ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرہ میں نہیں الجھنا چاہتے ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کر دی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں کون سی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے' اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل رنجیدہ ہوتا ہے تو رنجیدہ ہو' مگر اس کے ساتھ امیدواری و دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائیگا۔"[1]

یزید کی بیعت کے سلسلے میں "بدعنوانیاں"

مولانا مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت کے سلسلے میں خوف و طمع کے ذرائع سے کام لیا' اس لئے مختصراً ان روایات کے بارے میں بھی چند مختصر باتیں ذہن نشین کر لیجئے جن سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے تاریخ میں جو روایات اس سلسلے میں ملتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں' بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بیعت یزید پر جبر واکراہ کیا۔ دوسری وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس معاملے میں مکرو فریب سے کام لیا تیسری وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے لوگوں کو رشوت دی۔

جہاں تک جبرو اکراہ کا تعلق ہے یہ صرف کامل ابن اثیرؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے جو مولانا مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت معاویہؓ نے بیعت یزید کے مخالف صحابہؓ سے کہا کہ "اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اس کے سر پر پہلے پڑ چکی

---

[1] رسائل و مسائل ص ۷۰-۷۶ ج ۱

ہو گی۔" لیکن یہ روایت صرف کامل ابن اثیرؒ کی ہے۔ جو انہوں نے حسب عادت بغیر سند کے ذکر کی ہے۔ طبریؒ میں بھی جو ابن اثیرؒ کا سب سے بڑا ماخذ ہے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے برعکس مشہور مورخ احمد الیعقوبی حضرت معاویہؓ کے اسی سفر کا ذکر کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں۔

وحج معاوية تلک السنة فتالف القوم ولم يکرههم علی البيعة

اور حضرت معاویہؓ نے اس سال حج کیا تو لوگوں کی دلداری کی' اور (یزید کی) بیعت پر انہیں مجبور نہیں کیا"[1]

واضح رہے کہ یعقوبی وہ مورخ ہیں جن کا شیعہ ہونا بہت مشہور ہے' اس کے باوجود وہ حضرت معاویہؓ سے بیعت یزید کے سلسلے میں جبرواکراہ کی صراحۃً تردید کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کون سی معقول وجہ ہے۔ جس کی بناء پر ابن اثیرؒ کی روایت کو قبول کیا جائے اور یعقوبی کی اس روایت کو چھوڑ دیا جائے؟

رہ گئی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ نے اس معاملے میں (معاذ اللہ) مکرو فریب سے کام لیا ہو۔ یہ بات طبریؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ' حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اور دوسرے ان صحابہؓ سے الگ الگ ملے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک سے کہا کہ "یزید کے مخالفین کے لیڈر آپ ہیں' آپ نے بیعت کر لی تو سب کر لیں گے" لیکن اس روایت کا راوی کون ہے؟

طبری فرماتے ہیں۔

رجل بنخلة[2]

مقام نخلہ کا ایک شخص

کچھ پتہ نہیں کہ یہ شخص کون ہے؟ کافر ہے یا مسلمان؟ یا سبائی اور منافق؟ سچا ہے یا جھوٹا؟ آخر اس جیسی روایات کی بنیاد پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیسے اتنا بڑا الزام کر دیا جائے؟

---

[1] تاریخ الیعقوبی ص ۲۲۹ ج ۲ دار صادر بیروت ۷۹ ۱۳ھ

[2] الطبری: ص ۲۲۵ ج ۴

آخری اعتراض یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رشوتیں دے دے کر لوگوں کو اس بیعت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں :

"حضرت مغیرہؓ کوفہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دیکر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہؓ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے کہیں' یہ وفد حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ بن مغیرہ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ بعد میں حضرت معاویہؓ نے موسیٰ کو الگ بلا کر پوچھا "تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے؟" انہوں نے کہا تیس ہزار درہم میں' حضرت معاویہؓ نے کہا "تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے"

رشوت کی یہ روائتیں بھی صرف کامل ابن اثیر میں بغیر کسی سند اور حوالہ کے نقل کی گئی ہیں۔ ابن جریر طبریؒ جو علامہ ابن اثیرؒ کا سب سے بڑا ماخذ ہے' اس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں' اور حافظ ابن کثیرؒ جو ان کے بعد آئے ہیں' اور بقول مولانا مودودی صاحب "وہ اتنے متدین ہیں کہ تاریخ نگاری میں واقعات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے"[1] وہ بھی اس تیس ہزار درہم کے قصے کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں دیتے۔ اگر ایسی غیر مستند اور بے حوالہ روایتوں کی بنیاد پر ایک صحابی کو رشوت دینے کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر ایک حضرت معاویہؓ ہی کا نہیں تمام صحابہ کرام بلکہ انبیاء علیہم السلام تک کا کردار داغدار دکھایا جا سکتا ہے اور پھر ملوکیت کی جو تصویر مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے عہد کے بارے میں دکھائی ہے کوئی اور "محقق" اس کی ابتداء اس سے پہلے بھی خلافت راشدہ کے عہد سے کر سکتا ہے۔ اسی کامل ابن اثیرؒ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار کی خوبصورت بیوی سے نکاح کرنے کے لئے اسے پے در پے کئی خطرناک محاذوں پر صرف اس لئے بھیجا کہ وہ قتل ہو جائے اور جب وہ مارا گیا تو اس کی بیوی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا[2] اور اسی میں کئی مقامات پر حضرت علیؓ کی تصویر اس طرح پیش کی گئی

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۳۱۵

[2] کامل ابن اثیر ص ۷۷ ج ۱

ہے جیسے (معاذ اللہ) ان کی ساری عمر عہدۂ خلافت کی آرزو میں بیتاب ہوئے گذری تھی۔[1]
اس پہلو کو ہم آگے قدرے تفصیل کے ساتھ واضح کریں گے کہ ان تاریخی روایات کی حیثیت کیا ہے؟ اور علمی مباحث میں ان سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت حسینؓ کا موقف

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یزید کی ولی عہدی نیک نیتی کے ساتھ عمل میں آئی تھی اور وہ کھلا فاسق و فاجر نہیں تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف خروج کیوں کیا؟ یہ سوال اگرچہ ہمارے موضوع زیر بحث سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا' لیکن چونکہ اس معاملے میں ایک دوسرے گروہ نے دوسری انتہاء پر پہنچ کر حضرت حسینؓ پر اعتراضات و الزامات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے'[2] اس لئے یہاں تفصیل میں جائے بغیر نہایت اختصار کے ساتھ حضرت حسینؓ کا وہ موقف بھی پیش کر دیتے ہیں جو ہم نے سمجھا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' علماء کا راجح قول یہ ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے اور خلیفہ کی وفات کے بعد امت کے ارباب حل و عقد کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو ولی عہد ہی کو خلیفہ بنائیں اور چاہیں تو باہمی مشورے سے کسی اور کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ لہٰذا حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کی خلافت اس وقت تک منعقد نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ امت کے ارباب حل و عقد اسے منظور نہ کر لیں۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ' بذات خود شروع ہی سے یزید کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے' یہ ان کی دیانتدارانہ رائے تھی۔ جب حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ حجاز کے اکابر اور اہل حل و عقد نے جن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ شامل تھے' ابھی تک یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا' ادھر عراق سے ان کے پاس خطوط کا انبار لگ گیا جس سے واضح ہوتا تھا کہ اہل عراق بھی یزید کی خلافت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں وہاں کے لوگ مسلسل انہیں یہ لکھ رہے تھے کہ

---

[1] مثال کے طور پر دیکھئے ص ۷۲ ج ۳

[2] جناب محمود احمد عباسی: خلافت معاویہ و یزید اور تحقیق مزید

ہمارا کوئی امام نہیں ہے اور ہم نے ابھی تک کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔[1] ان حالات میں ان کا موقف یہ تھا کہ صرف اہل شام کی بیعت پوری امت پر لازم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کی خلافت ابھی منعقد ہی نہیں ہوئی اس کے باوجود وہ پورے عالم اسلام پر بزور متصرف ہونا چاہ رہا ہے تو اس کی حیثیت ایک ایسے سلطان متغلب کی سی ہے جو غلبہ پانا چاہتا ہے مگر ابھی پا نہیں سکا۔ ایسی حالت میں اس کے غلبہ کو روکنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اور اسی لئے انہوں نے پہلے حالات کی تحقیق کے لئے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو روانہ کیا تاکہ صحیح صورتحال معلوم ہو سکے۔ لہٰذا کوفہ کی طرف ان کا کوچ فقہی نقطۂ نظر سے بغاوت کے لئے نہیں تھا بلکہ ایک متغلب کے غلبہ کو روکنے کے لئے تھا۔ اگر ان کی نظر میں صورتحال یہ ہوتی کہ یزید پورے عالم اسلام پر بزور قابض ہو چکا ہے اور اس کا تسلط مکمل ہو گیا ہے' تب بھی وہ بہ حالت مجبوری احکام شریعت کے مطابق یزید کو سلطان متغلب تسلیم کر کے خاموش ہو جاتے' لیکن ان کی نظر میں صورت حال یہ تھی کہ یزید کا تسلط ابھی مکمل نہیں ہوا' اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے اقتدار کو ابھی روکا جا سکتا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ جب کوفہ کے قریب پہنچنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ کوفہ کے لوگوں نے غداری کی ہے اور یزید کا تسلط وہاں پر مکمل ہو گیا ہے تو انہوں نے وہ تین مشہور تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ :

اما ان اضع یدی فی ید یزید[2]

یا پھر میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دوں گا۔

اس کا صاف مطلب ہی یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ یزید کا تسلط پوری طرح قائم ہو چکا ہے تو سلطان متغلب کی حیثیت سے وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کے لئے رضا مند ہو گئے تھے' لیکن عبید اللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کے مشورے پر عمل کر کے ان کی کسی بات کو نہ مانا اور اس بات پر اصرار کیا کہ وہ غیر مشروط طور

---

[1] الطبریؒ: ص ۲۶۳ ج ۴۔ والبدایۃ ص ۱۵۱ و ۱۵۲ ج ۸ و الیعقوبی ص ۲۴۲ ج ۲ والامۃ والسیاسۃ۔

[2] الطبریؒ ص ۳۱۳ ج ۴' البدایۃ والنہایۃ ص ۱۷۵ ج ۸ وغیرہ میں بھی اس تجویز کا ذکر ہے ایک راوی کا کہنا ہے کہ حضرت حسینؓ نے یہ تجویز پیش نہیں کی لیکن اس کے مقابلے میں وہ روایات زیادہ ہیں جن میں اس تجویز کا ذکر کیا گیا ہے۔

پر عبید اللہ بن زیاد کے پاس حاضری دیں۔ ظاہر ہے کہ عبید اللہ بن زیاد کی اس نامعقول بات کو ماننا حضرت حسین پر لازم نہیں تھا اور وہ اس میں اپنی جان کا خطرہ سمجھتے تھے' اس لئے بالآخر انہیں مقابلہ کرنا پڑا۔ اور کربلا کا المیہ پیش آ کر رہا۔

جہاں تک یزید کا تعلق ہے' یہ بالکل درست ہے کہ کسی بھی معتبر روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے خود حضرت حسینؓ کو شہید کیا یا انہیں شہید کرنے کا حکم دیا بلکہ بعض روایات سے یہ ثابت ہے کہ اس نے آپ کی شہادت پر افسوس کا اظہار کیا اور عبید اللہ بن زیاد کو اپنی مجلس میں برا بھلا کہا۔[1] لیکن اس کی یہ غلطی ناقابل انکار ہے کہ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو اس سنگین جرم پر کوئی سزا نہیں دی۔ لہٰذا مولانا مودودی صاحب نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ :

> "ہم یہی روایت صحیح مان لیتے ہیں کہ وہ حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے سر دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا اور اس نے کہا کہ "میں حسینؓ کے قتل کے بغیر بھی تم لوگوں کی طاعت سے راضی تھا' اللہ کی لعنت ہو ابن زیاد پر' خدا کی قسم اگر میں وہاں ہوتا تو حسینؓ کو معاف کر دیتا" اور یہ کہ "خدا کی قسم اے حسین' میں تمہارے مقابلے میں ہوتا تو میں تمہیں قتل نہ کرتا" پھر بھی یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ اس ظلم عظیم پر اس نے اپنے سرپھرے گورنر کو کیا سزا دی؟ حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اس نے ابن زیاد کو نہ کوئی سزا دی' نہ اسے معزول کیا' نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا۔"

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ج ۸

چند اصولی مباحث

اس مقالہ میں ہمیں "خلافت وملوکیت" کی جن جزئیات پر گفتگو کرنی تھی وہ پوری ہو گئیں، اب ہم وعدہ کے مطابق چند اصولی مسائل پر مختصر بحث کریں گے۔

عدالت صحابہؓ کا مسئلہ :

مولانا مودودی صاحب کی کتاب "خلافت وملوکیت" کو جس وجہ سے سب زیادہ تنقید کا نشانہ بننا پڑا ہے اور جس وجہ سے سنجیدہ علمی حلقوں نے بھی اس کی تردید کرنا ضروری سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اس کتاب کے ان مندرجات کو درست مان لیا جائے جو خاص طور سے حضرت معاویہؓ سے متعلق ہیں، تو اس سے عدالت صحابہؓ کا وہ بنیادی عقیدہ مجروح ہوتا ہے جو اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے اور جسے مولانا مودودی صاحب بھی اصولی طور پر درست مانتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتاب کے ضمیمے میں یہ سوال اٹھا کر تقریباً پانچ صفحات میں اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے ان کی اس بحث کو بار بار بنظرِ غائر پڑھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے اصل زیر بحث سوال بالکل حل نہیں ہوتا۔ مولانا نے "الصحابۃ کلھم عدول" (تمام صحابہؓ عادل ہیں) کو اصولی طور پر اپنا عقیدہ قرار دے کر یہ لکھا ہے کہ اس عقیدے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صحابہؓ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ روایت حدیث میں انہوں نے پوری دیانت اور ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :۔

> یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شخص سے کوئی کام عدالت کے منافی سرزد ہونے کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ صفت عدالت اس سے بالکلیہ منتفی ہو جائے اور ہم سرے سے اس کے عادل ہونے ہی کی نفی کر دیں اور وہ روایت حدیث کے معاملے میں ناقابل اعتماد ٹھہرے؟ میرا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے

سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلّی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے درآنحالیکہ اس کی زندگی میں مجموعی طور پر عدالت پائی جاتی ہو۔"

لیکن اس گفتگو میں مولانا نے اس بحث کو صاف نہیں فرمایا، عقلی طور پر عدالت صحابہؓ کے تین مفہوم ہو سکتے ہیں :-

۱۔ صحابہ کرامؓ معصوم اور غلطیوں سے بالکل پاک ہیں۔

۲۔ صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں "معاذاللہ" فاسق ہو سکتے ہیں، لیکن روایت حدیث کے معاملہ میں وہ بالکل عادل ہیں۔

۳۔ صحابہ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق، یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت "دو ایک یا چند" غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں، لیکن تنبّہ کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرما دیا۔ اس لئے وہ ان غلطیوں کی بناء پر فاسق نہیں ہوئے۔ چنانچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی صحابی نے گناہوں کو اپنی "پالیسی" بنا لیا ہو جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جا سکے۔

اصل سوال یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان میں سے کون سے مفہوم کو درست سمجھتے ہیں؟ پہلے مفہوم کو تو انہوں نے صراحۃً غلط کہا ہے، اور جمہور اہل سنت بھی اسے غلط کہتے ہیں۔ اب آخری دو مفہوم رہ جاتے ہیں، مولانا نے یہ بات صاف نہیں کی ان میں سے کونسا مفہوم وہ درست سمجھتے ہیں؟ اگر ان کی مراد دوسرا مفہوم ہے یعنی یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صرف روایت حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ "معاذاللہ" فاسق وفاجر بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بات ناقابل بیان حد تک غلط اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی صحابی کو فاسق وفاجر مان لیا جائے تو آخر روایت حدیث کے معاملے میں اسے فرشتہ تسلیم کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جو شخص اپنے ذاتی مفاد کے لئے جھوٹ، فریب، رشوت، خیانت اور غداری کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ اپنے مفاد کے لئے جھوٹی حدیث کیوں نہیں گھڑ سکتا؟ روایت حدیث کے معاملے میں آپ اس کے اعتماد کو یہ کہہ کر کیسے بحال کر سکتے ہیں کہ :

"کبھی کسی فریق نے کوئی حدیث اپنے مطلب کے لئے اپنی طرف سے گھڑ

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کی، نہ کسی صحیح حدیث کو اس بناء پر جھٹلایا کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے۔"

اسی لئے تمام محدثین اس اصول کو مانتے آئے ہیں کہ جو شخص فاسق و فاجر ہو اس کی روایت صحیح نہیں ہوتی، ورنہ اگر روایات کو مسترد کرنے کے لئے یہ شرط لگادی جائے کہ راوی کا ہر ہر روایت میں جھوٹ بولنا ثابت ہو تو شاید کوئی بھی روایت موضوع ثابت نہیں ہوسکے گی اور حدیث کے تمام راوی معتبر اور مستند ہوجائیں گے، خواہ وہ عملی زندگی میں کتنے ہی فاسق و فاجر ہوں۔

اور اگر مولانا مودودی صاحب عدالتِ صحابہؓ کو تیسرے مفہوم میں درست سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کی اوپر نقل کی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے سو یہ مفہوم جمہور اہل سنت کے نزدیک درست ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر انہوں نے جو اعتراضات اپنی کتاب میں کئے ہیں اگر ان کو درست مان لیا جائے تو عدالت کا یہ مفہوم ان پر صادق نہیں آسکتا۔ مولانا مودودی صاحب کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے:

۱۔ اپنے بیٹے کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لی۔ (ص ۱۴۸)

۲۔ اس غرض کے لئے رشوتیں دیں۔ (ص ۱۴۹، ۱۵۰)

۳۔ مخالفین کو قتل کی دھمکیاں دے کر مجبور کیا۔ (ص ۱۵۳)

۴۔ حجر بن عدیؓ جیسے "زاہد و عابد صحابی" اور ان کے ساتھیوں کو محض ان کی حق گوئی کی وجہ سے قتل کیا۔ (ص ۱۶۴، ۱۶۵)

۵۔ مسلمان کو کافر کا وارث قرار دینے کی بدعت جاری کی۔ (ص ۱۷۳)

۶۔ دیت کے احکام میں بدعت جاری کرکے آدھی دیت خود اپنے ذاتی استعمال کے لئے لینی شروع کردی۔ (ص ۱۷۴)

۷۔ حضرت علیؓ پر خود برسر منبر سب و شتم کرنے کی بدعت جاری کی۔ (ص ۱۷۴)

۸۔ مال غنیمت کی تقسیم میں خیانت کرکے سونا چاندی اپنے استعمال میں لانے کا حکم دے دیا۔ (ص ۱۷۴)

۹۔ "اپنے والد ماجد کی زناکاری پر (جھوٹی) شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی قرار دے دیا۔" (ص ۱۷۵)

۱۰۔ "اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا۔" (ص ۱۷۵)

۱۱۔ ان کے گورنروں نے (ان کی عملی رضا مندی سے) مسلمان عورتوں کو کنیز بنایا اور "یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے' اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔"

بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر یہ "چارج شیٹ" درست ثابت ہو جائے تو اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ "معاذ اللہ" فاسق۔ قرار پاتے ہیں یا نہیں؟ اگر فاسق قرار پاتے ہیں تو عدالت کا یہ تیسرا مفہوم جسے آپ درست مان کر آئے ہیں' ان پر کیسے صادق آ سکتا ہے؟ اور اگر وہ ان "مکروہ بدعتوں" اور "قرآن وسنت کے احکام کی صریح خلاف ورزیوں" کے باجود فاسق نہیں ہیں تو آخر کیوں؟ جو شخص رشوت' جھوٹ' مکروفریب' قتل نفس' اجراء بدعت' غلول (مال غنیمت میں خیانت) جھوٹی گواہی' جھوٹی نسبت' اعانت ظلم اور دیاثت (مسلمان عورتوں کی آبروریزی پر عملاً راضی رہنا) جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کا مجرم ہو اسے آخر کس بناء پر فسق کے الزام سے بری کیا جا سکتا ہے؟ ان تمام جرائم کا الزام اس کے سر تھوپنے کے بعد بات کو یہ کہہ کر کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ :

> "کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گذرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلّی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے" (ص ۳۰۴)

کیا ان جرائم کو "ایک دو یا چند" گناہ "کر گذرنے" سے تعبیر کرنا اس "لیپ پوت" کی تعریف میں نہیں آتا جس سے مولانا مودودی صاحب بچنا چاہتے ہیں؟ جبکہ ان گناہوں میں سے ہر گناہ کبیرہ ہے' اس پر عذاب جہنم کی شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں' اور خود مولانا مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق یہ گناہ اتفاقی طور سے سرزد نہیں ہو گئے تھے' بلکہ باقاعدہ "پالیسی" بنا لیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ حضرت معاویہؓ کے بارے میں لکھا ہے' اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو انہیں "فسق" کے الزام سے بری قرار دینے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں' پھر تو لازماً یہ کہنا پڑے گا کہ "معاذ اللہ" وہ فاسق تھے' اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں "الصحابۃ کلھم عدول" کا عقیدہ سلامت نہیں رہ سکتا۔ اور پھر اس ایک عقیدے

پر کیا موقوف ہے' اسلام کے سارے عقائد اور سارے احکام ہی خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

تاریخی روایات کا مسئلہ :

مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتاب کے ضمیمے میں اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ جن تاریخی کتابوں کے حوالے سے انہوں نے روایات نقل کی ہیں' وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟ انہوں نے حدیث اور تاریخ کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جرح وتعدیل کے معروف طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے مقرر کئے گئے ہیں' اور تاریخی روایت کی اس معیار پر تحقیق شروع کی گئی تو تاریخ اسلام کا کم از کم ۱۰/۹ حصہ ناقابل قبول ہو جائے گا۔

یہاں ہمیں دو گذارشیں کرنی ہیں :

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بات کہتے وقت مولانا نے مسئلے کی صحیح نوعیت کو محسوس نہیں فرمایا' یہ مسئلہ جو اس وقت زیر بحث ہے' محض تاریخ کا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ یہ عقائد وکلام کا مسئلہ ہے' مشاجرات صحابہؓ میں کون حق پر تھا؟ کس سے کس قسم کی غلطی سرزد ہوئی؟ اور اس غلطی کا اثر عدالت صحابہؓ کے عقیدے پر کیا پڑتا ہے؟ یہ تمام مسائل عقائد کے مسائل ہیں' ساری امت ان مسائل کو عقائد کا جزو مانتی آئی ہے۔ علم عقائد وکلام کی کوئی کتاب ان سے خالی نہیں ہے۔ اور ان ہی مسائل کی بنیاد پر اسلام میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے ہیں' اور جب مولانا مودودی صاحب خود یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ احکام شریعت کا استنباط ان مجروح تاریخی روایات سے نہیں ہو سکتا تو عقائد کا معاملہ بہرحال بلند ہے' علماء کی تصریح کے مطابق صحیح بلکہ حسن خبر واحد سے بھی احکام کا استنباط ہو سکتا ہے' لیکن عقائد کے استنباط کے لئے نری خبر واحد بھی کافی نہیں ہوتی' ایسی صورت میں اس مسئلے کا فیصلہ ان مجروح تاریخی روایات کی بنیاد پر کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ کیا کسی صحابیؓ رسولؐ پر گناہ کبیرہ کا الزام عائد کرنا اتنی معمولی بات ہے کہ اس کے کہنے والے کے بارے میں یہ تحقیق کرنے کی اجازت بھی نہ دی جائے کہ وہ کون تھا؟ اس کے عقائد کیسے تھے؟ اور وہ جھوٹا تھا یا سچا تھا؟

یہ بات صرف عقیدت اور محبت کی بنیاد پر نہیں کہی جا رہی' بلکہ یہ عقل کا فطری تقاضا ہے کہ جس شخص کی زندگی میں مجموعی طور سے خیر غالب ہو' اس پر کسی گناہ کبیرہ کا الزام اس

وقت تک درست تسلیم نہیں کیا جائے جب تک وہ مضبوط اور قوی دلائل سے صحیح ثابت نہ ہو چکا ہو۔ صحابہ کرام کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمام معقولیت پسند لوگ عام مسلمانوں کے بارے میں اسی طرز فکر کو ضروری سمجھتے ہیں، آسانی کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں :-

مولانا مودودی صاحب سے بہت سے مسائل میں اختلاف کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ اتنے باکردار ضرور ہیں کہ اپنا ضمیر بیچ کر ملک وملت کی غداری پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اب اگر کوئی شخص آکر یہ اطلاع دے کہ وہ (خدانہ کردہ) ضمیر فروشی اور ملت کی غداری کے مرتکب ہوئے ہیں تو کیا اس خبر کی مکمل تحقیق کئے بغیر اس کی تصدیق کر لینا کسی معقولیت پسند انسان کا کام ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! ہر حقیقت پسند انسان اس خبر کی تصدیق کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنیکی کوشش کریگا کہ یہ خبر دینے والا کون ہے؟ اس نے کس سے یہ بات سنی ہے؟ بلاواسطہ سنی ہے یا بیچ میں کوئی واسطہ ہے؟ یہ واسطے کس حد تک قابل اعتماد ہیں اور ان میں کوئی شخص ایسا تو نہیں جو مولانا سے عناد رکھتا ہو؟ اگر تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو کہ یہ خبر دینے والے ناقابل اعتماد ہیں، یا ان میں سے کوئی ایک شخص افواہ طراز ہے، یا ان کا معاند ہے تو کیا پھر بھی اس خبر کو بنیاد بنا کر مولانا پر یہ تہمت لگانا قرین انصاف ہوگا؟ اور اگر یہ خبر کسی مستند اخبار میں چھپ جائے تو کیا اس کے بعد اس کے راویوں کی تحقیق ممنوع قرار پائیگی؟ اور جو شخص اس مطبوعہ خبر کی تردید کے لئے اس کے راویوں کے حالات کی چھان بین کرے کیا اسے یہ کہہ کر روکا جاسکے گا کہ اس اخبار کا ایڈیٹر ثقہ آدمی ہے، لہٰذا اس کی چھاپی ہوئی ہر خبر قابل تسلیم ہے؟ اور اگر کوئی شخص رپورٹروں کو ناقابل اعتماد قرار دے کر اس خبر کو جھٹلائے تو کیا اسے یہ طعنہ دیا جاسکے گا کہ اگر ان غیر معتبر رپورٹروں کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے تو اخبار کی کوئی خبر تسلیم کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے کیونکہ اخبار کی تمام خبریں انہی رپورٹروں کی دی ہوئی ہیں؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ نفی ہی میں ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اور دوسرے صحابہؓ کے بارے میں یہ تحقیق ممنوع قرار پاجاتی ہے، اور جو شخص ان پر گناہ کبیرہ کا الزام عائد کرنے والے راویوں کی تحقیق کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں، کھولنا چاہتا ہے وہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک گردن زدنی ہوتا ہے؟

مولانا مودودی صاحب نے اس فرق پر بہت زور دیا ہے جو حدیث اور تاریخ کے معیار استناد میں ان کے نزدیک ملحوظ رہنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ واقدی، سیف بن عمر، کلبی اور ابو مخنف جیسے راوی "احکامی احادیث" میں تو واقعی ناقابل اعتماد ہیں، مگر تاریخی واقعات میں ان کے بیانات قابل قبول ہیں۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر تاریخ کے معاملہ میں بھی انہیں ناقابل اعتماد قرار دے دیا گیا تو ہماری تاریخ کا کم از کم ۱۰/۹ حصہ بالکل غیر معتبر قرار پا جائے گا۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، تاریخی واقعات میں ان راویوں کے قابل اعتماد ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے بیان کئے ہوئے وہ واقعات بھی بے چوں وچرا تسلیم کر لئے جائیں جن کی زد عقائد یا احکام پر پڑتی ہے۔ کسی بات کے محض "تاریخی" ہونے کا فیصلہ صرف اس بات سے نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی تاریخ کی کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ اگر تاریخی کتابوں میں عقائد واحکام سے متعلق کوئی چیز آئے گی تو اسے جانچنے کے لئے لازماً وہی اصول استعمال کرنے پڑیں گے جو عقائد واحکام کے استنباط کے لئے مقرر ہیں۔

واقعہ یہ ہے بعض راویوں کے بارے میں علماء نے جو یہ کہا ہے کہ "ان کی روایتیں احکام کے معاملے میں مردود اور سیرو تواریخ میں مقبول ہیں"

اس سے مراد سیرو تواریخ کے وہ واقعات ہیں جن سے عقائد و احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کون سا غزوہ کون سے سن میں ہوا؟ اس میں کتنے افراد شریک تھے؟ اس کی قیادت کس نے کی؟ اس میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی؟ ظاہر ہے کہ یہ اور اس جیسے دوسرے واقعات ایسے ہیں کہ ان سے عقائد و احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان معاملات میں ضعیف راویوں کی روایات کو بھی گوارا کر لیا گیا ہے[1]۔ لیکن مشاجرات صحابہؓ اور صحابہؓ کی عدالت کے وہ مسائل جو خالص عقائد سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اسلام میں کئی کئی فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں ان راویوں کی روایات ہرگز قبول نہیں کی جا سکتیں، مذکورہ بالا مسائل کا فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع کے مضبوط دلائل ہی سے ہو سکتا ہے۔

---

[1] گوارا کرنے کا مفہوم یہاں بھی یہ نہیں ہے کہ ان روایتوں کا مطالعہ کرتے وقت نقد و نظر کے تمام اصولوں پر بالکل ہی تالا ڈال دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف ان راویوں کے ضعف کی بنیاد پر ان روایتوں کو رد نہیں کر دیں گے۔ چنانچہ اگر کچھ دوسرے دلائل ان کے خلاف مل جائیں تو ان روایات کو بھی تسلیم کرنے پر اصرار نہیں کیا جائے گا۔

اس کی صاف اور سادہ سی مثال یہ ہے کہ آپ روزانہ اخبار میں بے شمار خبریں پڑھتے ہیں' اور ان کے رپورٹروں کی تحقیق کو ضروری نہیں سمجھتے' لیکن جن خبروں سے کسی معروف شخصیت پر کوئی سنگین الزام لگتا ہو یا ان سے کوئی شرعی مسئلہ متاثر ہوتا ہو انہیں تسلیم کرنے سے پہلے ہر معقول آدمی اس خبر کی تحقیق کرتا ہے' اور اگر معلوم ہو کہ رپورٹر ناقابل اعتماد ہے تو اس خبر کی تصدیق نہیں کرتا۔ آج فلاں جگہ بس الٹ گئی۔ فلاں شہر میں زلزلہ آگیا' فلاں مقام پر فلاں سیاسی جماعت کا اجلاس منعقد ہوا۔ فلاں فلاں لیڈر نے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اگر یہ خبریں کسی ذمہ دار اخبار میں شائع ہوئی ہوں تو آپ انہیں تسلیم کر لیتے ہیں۔ خواہ آپ کو یہ یقین ہو کہ اس خبر کا رپورٹر کوئی دہریہ ہے' لیکن اگر یہی دہریہ رپورٹر یہ خبر دے کہ فلاں مشہور عالم دین نے چوری کرلی ہے یا فلاں مشہور سیاسی لیڈر نے کسی غیر ملکی سفارت خانے سے جاسوسی کی رقم حاصل کی ہے' تو آپ محض اخبار کی خبر پر اعتماد کرنے کے بجائے لازماً اس خبر کی پوری تحقیق کرتے ہیں اور جب تک مضبوط دلائل سے خبر درست ثابت نہ ہو جائے' آپ اس عالم دین کو چور یا سیاسی لیڈر کو ضمیر فروش قرار نہیں دے سکتے۔

اگر کوئی شخص رپورٹروں کو ناقابل اعتماد اور جھوٹا ثابت کرکے ایسی خبروں کی تردید کرے تو کیا اس سے یہ کہا جاسکے گا کہ یا تو اخبار کا ۹/۱۰ حصہ' جو انہی رپورٹروں نے مرتب کیا ہے' رد کردو' یا ان خبروں کو بھی بے چون چرا درست مانو؟..... اگر یہ کہنا درست نہیں ہے' اور کوئی معقول انسان اس اعتراض کو درست نہیں کر سکتا تو بیچاری تاریخ اسلام ہی اتنی لاوارث کیوں ہے کہ اس کی تحقیق و تنقید کا ہر دروازہ بند ہو گیا ہے' اور اب کوئی شخص اس مقصد کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں بھی نہیں کھول سکتا؟

یہی وہ بات ہے جسے اہل السنۃ والجماعت کے علماء شروع سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ان ضعیف تاریخی روایات کے ذریعے صحابہ کرام پر کسی گناہ کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا' مثال کے طور پر علامہ احمد بن حجر الہیثمیؒ اپنی مشہور کتاب الصواعق المحرقہ میں لکھتے ہیں :

> والواجب ایضا علی کل من سمع شیئا من ذالک ان یتثبت فیه ولا ینسبه الی احد منهم بمجرد رویة فی کتاب اوسماعه من شخص بل لابد ان یبحث عنه حتی یصح عنده نسبة الی

احدھم فحینئذ الواجب ان یلتمس لھم احسن التاویلات [1]

"اور جو شخص (صحابہ کرامؓ کی لغزشوں سے متعلق) کچھ سنے تو اس پر واجب ہے کہ اس معاملے میں تحقیق سے کام لے اور صرف کسی کتاب میں دیکھ لینے یا کسی شخص سے سن لینے کی بناء پر اس غلطی کو ان میں سے کسی کی طرف منسوب نہ کرے، بلکہ یہ ناگزیر ہے کہ اس کی پوری تحقیق کرے، یہاں تک کہ اس کی نسبت ان کی طرف صحیح ثابت ہو جائے [1] اس مرحلے پر یہ واجب ہے کہ ان کے لئے تاویلات تلاش کرے۔"

اور اپنی ایک دوسری کتاب تطہیر الجنان میں رقم طراز ہیں :

لا یجوز لاحد ان یذکر شیئا مما وقع بینھم یستدل بہ علی بعض نقص من وقع لہ ذلک والطعن فی ولایتہ الصحیحۃ اولیغری العوام علی سبھم و ثلبھم و نحو ذلک من المفاسد، ولم یقع ذلک الا للمبتدعۃ وبعض جھلۃ النقلۃ الذین ینقلون کلما راوہ ویترکونہ علی ظاھرہ غیر طاعنین فی سندہ ولامشیرین لتاویلہ وھذا شدید التحریم لما فیہ من الفساد العظیم وھو اغراء للعامۃ ومن فی حکمھم علی تنقیص اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذین لم یقم الدین الا بنقلھم الینا کتاب اللہ وما سمعوہ و شاھدوہ من نبیہ من سنتہ الغراء الواضحۃ البیضاء [2]

صحابہ کرام کے درمیان جو واقعات ہوئے ہیں، کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ انہیں ذکر کر کے ان کے نقص پر استدلال کرے اور اسکے ذریعہ کسی صحابی کی ولایت صحیحہ پر معترض ہو یا عوام کو انہیں برا بھلا کہنے پر

---

[1] الہیثمیؒ: الصواعق المحرقۃ فی الرد علی اھل البدع والزندقۃ ص ۱۲۹ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۲۴ھ:
[اس] حوالے کے لئے ہم محترم جناب مولانا محمد یوسف صاحب خطیب جامع اہل حدیث مصطفیٰ آباد [کے] شکر گزار ہیں۔

[2] تطہیر الجنان واللسان بہامش الصواعق المحرقۃ: ص ۶۵

اکسائے۔ یہ کام صرف اہل بدعت کا ہے اور بعض ان جاہل ناقلوں کا جو ہر اس چیز کو نقل کردیتے ہیں جو انھوں نے کہیں دیکھ لی ہو اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم مراد لیتے ہیں' نہ اس روایت کی سند پر کوئی طعن کرتے ہیں' اور نہ اسکی تاویل کی طرف اشارہ کرتے ہیں' یہ بات سخت حرام وناجائز ہے کیوں کہ اس سے فساد عظیم رونما ہو سکتا ہے' اور یہ عام لوگوں کو صحابہؓ کے خلاف اکسانے کے مترادف ہے' حالانکہ ہم تک دین کے پہنچنے کا واسطہ یہی صحابہؓ ہیں جنھوں نے قرآن وسنت کو ہم تک نقل کیا ہے۔"

اور علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب "العقیدۃ الواسطیہ" میں اہل سنت کے امتیازی عقائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ان ھذہ الآثار المرویۃ فی مساویھم منھا ما ھو کذب و منھا ما قد زید فیہ و نقص و غیر وجھہ' والصحیح منہ ھم فیہ معذورون' اما مجتھدون مصیبون واما مجتھدون مخطئون' وھم مع ذلک لا یعتقدون ان کل واحد من الصحابۃ معصوم من کبائر الاثم و صغائرہ بل یجوز علیھم الذنوب فی الجملۃ' ولھم من الفضائل والسوابق مایوجب مغفرتہ مایصدر منھم ان صدر

"(اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ) جن روایات سے صحابہ کرامؓ کی برائیاں معلوم ہوتی ہیں ان میں سے کچھ تو جھوٹ ہی جھوٹ ہیں اور کچھ ایسی ہیں کہ اس میں کمی بیشی کردی گئی ہے' اور ان کا اصل مفہوم بدل دیا گیا ہے' اور ان میں سے جو روایتیں صحیح ہیں' ان میں صحابہؓ معذور ہیں' یا تو مجتہد برحق ہیں' یا اجتہادی غلطی کے مرتکب' لیکن اس کے باوجود اہل سنت کا عقیدہ یہ بھی نہیں ہے کہ صحابہؓ کا ہر ہر فرد چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے معصوم تھا' بلکہ فی الجملہ ان سے گناہ صادر ہو سکتے ہیں' مگر ان کی فضیلتیں اتنی ہیں کہ اگر کوئی گناہ صادر ہوا بھی ہو تو یہ فضائل ان کی

مغفرت کا موجب ہیں۔"[1]

اہل سنت کی لکھی ہوئی عقائد وکلام کی تمام کتابیں پڑھ جائیے' وہ اول سے آخر تک اس معاملے میں یک زبان نظر آئیں گی کہ صحابہ کرامؓ سے کسی گناہ کا صدور خالصۃً عقائد کا مسئلہ ہے اور اس کا اثبات ضعیف' مجروح' منقطع یا بلاسند تاریخی روایتوں سے نہیں ہو سکتا' خاص طور سے مشاجرات صحابہؓ کے معاملے میں اس اصول کی بڑی شدت کے ساتھ پابندی کی ضرورت ہے کیوں کہ بقول علامہ ابن تیمیہ "حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سبائی پروپیگنڈہ کے اثر سے صحابہ کرامؓ پر بے بنیاد تہمت طرازیوں کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تھا' اور اس پروپیگنڈے کے اثرات سے مشاجرات کے زمانے کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہ سکی' یہی وجہ ہے کہ تمام اہل سنت نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف اور حضرت معاویہؓ کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دیا ہے' ورنہ ظاہر ہے کہ جن روایات کی بنیاد پر آج مولانا مودودی صاحب حضرت معاویہؓ کو "حقیقی غلطی" اور سیاسی اغراض کیلئے قرآن وسنت کی صریح خلاف ورزی کا مجرم قرار دے رہے ہیں' وہ روایات آج چودھویں صدی میں کوئی نئی دریافت نہیں ہو گئی ہیں' بلکہ یہ تیرہ صدیوں سے مسلمانوں کی تواریخ میں نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں' اس کے باوجود اہل سنت کے کسی ایک فرد نے بھی ان کی بناء پر حضرت معاویہؓ پر یہ الزام نہیں لگایا بلکہ عقائد کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیے اس میں یہی لکھا ہوا ملے گا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ سے اجتہادی غلطی ہوئی تھی'[2] سوال یہ ہے کہ کیا عقائد کے

---

[1] الروضۃ الندیہ شرح العقیدۃ الواسطیہ لزید بن عبد العزیز: ص ۴۴۹ مطابع الریاض ۱۳۷۷ھ

[2] دیکھیے شرح الفقہ الاکبر: ص ۸۲: والنبراس علی شرح العقائد ص ۵۴۹' امرتسر: والصواعق المحرقۃ: ص ۱۲۹ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۲۴ھ و شرح العقیدۃ الواسطیۃ ص ۴۴۹ تا ۴۵۱ الریاض ۱۳۷۷ھ والعواصم من القواصم ص ۱۶۸ المکتبۃ السلفیۃ قاہرہ ۱۳۷۱ھ و مکتوبات مجدد الف ثانیؒ: دفتر اول' بریلی ۱۲۸۶ھ' ولوامع الانوار البہیہ للسفارینی ص ۳۸۶ ج ۲: دار الاصفہانی جدہ ۱۳۸۰ھ والمسامرۃ بشرح المسایرۃ ص ۱۳۲ دار العلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ و مرقاۃ المفاتیح: ص ۱۴۸ ج ۵ المیمنیہ مصر ۱۳۹۰ھ۔ یہ چند حوالے سرسری طور سے لکھ دیئے گئے ہیں ورنہ اہل سنت کا کوئی عالم ہماری نظر میں نہیں ہے جس نے حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو اجتہادی غلطی سے زیادہ کچھ کہا ہو۔ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ جن لوگوں

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

یہ علماء وائمہ سب کے سب تاریخی روایتوں سے بے خبر تھے؟ یا انہیں ان روایتوں کا علم تو تھا مگر اتنی فہم نہیں تھی کہ وہ اجتہادی غلطی اور حقیقی غلطی میں تمیز کر سکتے؟ یا انہیں روایات کا علم بھی تھا اور وہ ان کا مطلب بھی سمجھتے تھے' مگر عقائد کی کتابیں مرتب کرتے وقت انہوں نے خیانت سے کام لیا اور اصلی واقعات کو چھپا کر محض جذباتی جوش عقیدت پر عقائد کی تعمیر کھڑی کر دی؟ اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی بات اہل سنت کے تمام علماء' تمام ائمہ اور تمام متکلمین کے بارے میں کہہ سکتا ہے تو صاف صاف کہے اور واضح الفاظ میں اعلان کرے کہ وہ اہل سنت کے عقائد کا پابند نہیں ہے' لیکن اگر ان حضرات کے بارے میں ان میں سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تو ان کے اس طرز عمل کا اس کے سوا مطلب کیا ہے کہ انہوں نے ان مجروح تاریخی روایات کو درخواعتنا ہی نہیں سمجھا اور ان کو اس لائق قرار نہیں دیا کہ ان کی بناء پر صحابہؓ میں سے کسی کو گناہ کا ملزم قرار دیا جائے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ جنہوں نے خود اس قسم کی روایات اپنی تاریخ میں نقل کی ہیں' وہ جنگ صفین کے بیان کے بعد لکھتے ہیں :

وھذا ھو مذھب اھل السنۃ والجماعۃ ان علیا ؓ ھو المصیب وان کان معاویۃ مجتھدا' وھو ماجور ان شاء اللہ [۲]

"یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے کہ حضرت علیؓ حق پر تھے' اگرچہ حضرت معاویہؓ بھی مجتہد ہونے کی وجہ سے انشاء اللہ ماجور ہیں۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ ان روشن دلائل کی موجودگی میں کوئی انصاف پسند انسان مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کو درست تسلیم نہیں کر سکتا کہ صحابہ کرامؓ پر نفسانیت پرستی

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ
نے حضرت معاویہؓ کے لئے "باغی" یا "امام جائر" کا لفظ استعمال کیا ہے ان کی مراد بھی خود ان کی تصریح کے مطابق صرف یہی ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کی صلح سے قبل نفس الامر کے اعتبار سے برسر حق نہ تھے' ورنہ چوں کہ ان کی یہ "بغاوت" تاویل کے ساتھ تھی اس لئے وہ مجتہد مخطی تھے' ملاحظہ فرمایئے: فتح القدیر' ص ۴۶۱' ج ۵ و ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۷' ج ۱' و تطہیر الجنان بہامش الصواعق' ص ۴۰

[۲] البدایہ والنہایہ ص ۲۷۹ ج ۷

اور ارتکاب کبائر کا الزام عائد کرنے والی روایات کو انکے ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود قبول کرلیا جائے۔ اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جرح و تنقید کو ممنوع قرار دے دیا جائے' واقعہ یہ ہے کہ اگر اس معاملے میں مولانا مودودی صاحب کا یہ عجیب و غریب طرز عمل اختیار کرلیا جائے تو کسی صحابی کی آبرو محفوظ نہیں رہ سکتی اور کل کوئی نیا محقق اسی قسم کی روایات کے بل پر خود حضرات شیخینؓ پر بڑی آسانی سے دست درازی کرکے ان کے عہد خلافت ہی میں ملوکیت کے جراثیم دکھلا سکتا ہے۔ آج سے سالہاسال پہلے خود مولانا مودودی صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ اگر اس قسم کی روایات کو مان لیا جائے تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کیے ہوئے معاشرے کی کیا تصویر سامنے آتی ہے' وہ تحریر فرماتے ہیں :۔

> "اگر آپ اس تاریخ کو باور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمد رسول اللہ مبلغ قرآن' داعی اسلام' مزکی نفوس۔ کی شخصیت پر اور انکی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر خط نسخ کھینچ دینا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ وہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی' اور اس کی قیادت میں جس جماعت نے بدر واحد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کرکے اسلام کا جھنڈا دنیا میں بلند کیا تھا' اس کے اخلاق' اس کے خیالات' اس کے مقاصد' اس کے ارادے' اس کی خواہشات اور اس کے طور طریق عام دنیا پرستوں سے ذرہ برابر مختلف نہ تھے"۔[1]

---

[1] رسائل و مسائل ' ص ۷۲ ج ۱' اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۵۱ء

حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت

آخر میں ہم اس سوال کا مختصر جواب دینا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت معاویہؓ پر عائد کردہ یہ الزامات غلط ہیں تو پھر ان کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ ٹھیک اسی معیار اور مرتبہ کے خلیفہ تھے جو معیار اور مرتبہ خلفائے راشدین کو حاصل تھا یا نہیں؟ اگر تھے تو انہیں خلیفۂ راشد کیوں قرار نہیں دیا گیا؟ اور اگر نہیں تھے تو ان میں اور خلفائے راشدین میں فرق کیا تھا؟

یہ سوال ایک معقول سوال ہے' ہمارے نزدیک اور صرف ہمارے نزدیک ہی نہیں' جمہور اہل سنت کے نزدیک بلاشبہ انکی خلافت اور خلفائے راشدین کی خلافت دونوں ایک معیار کی نہیں تھیں' بلکہ دونوں میں فرق تھا' لیکن اس فرق کی جو تشریح مولانا مودودی صاحب نے فرمائی ہے' وہ نہ معقول ہے نہ مستند طریقے سے ثابت ہے اور نہ اہل سنت کے عقائد سے میل کھاتی ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے حالات کے اس تغیر کی جو تشریح کی ہے' اس سے ذہن میں نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد یک بیک حالات بالکل پلٹ گئے' خلافت راشدہ تمام مثالی خوبیوں کا مجموعہ تھی' مگر حضرت معاویہؓ کے خلافت سنبھالتے ہی اس میں ملوکیت کی تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں' تقویٰ کے فوراً بعد فسق حکمراں ہو گیا' اور جو معاشرہ خلافت راشدہ کے عہد میں تاریخ کا پاکیزہ ترین معاشرہ تھا' اسی معاشرہ میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں نفسانیت کی تمام پستیاں جمع ہو گئیں۔ ۴۰ھ تک خلافت کی طرف سے علانیہ قانون شکنی کا تصور نہ ہو سکتا تھا' اور ۴۱ھ میں قانون شکنی "بدعت" اور "تحریف دین" کی حد تک پہنچ گئی۔ ۴۰ھ میں رشوت ستانی کا خیال کسی کو نہ آتا تھا' ۴۱ھ میں اسے شیر مادر سمجھ لیا گیا' ۴۰ھ تک کافروں کو بھی سب وشتم

نہ کیا جاتا تھا' اور یہاں جلیل القدر صحابہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پہلے مال غنیمت میں خورد برد کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور ایک ہی دو سال میں اب باقاعدہ اس خیانت کے لئے احکام جاری ہونے لگے' پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنے اقتدار کے سہارے لوگوں پر ظلم وستم کر سکے' اور اب یہ ظلم وستم خود مرکز کی پالیسی قرار پاگئی' پہلے عوام کی غیرت اور حکام کی خدا ترسی کا عالم یہ تھا کہ معمولی سے معمولی آدمی خلیفہ کا گریبان تھام سکتا تھا' اور اب ایک ہی سال کے فرق سے لوگوں کی بے غیرتی اور حاکم کے جبر وتشدد کا یہ حال ہو گیا کہ ضمیروں پر قفل چڑھ گئے اور کوڑے حق گوئی کا انعام بن گئے۔ غرض یہ کہ ۴۰ھ کے ختم ہوتے ہی شخصی مفادات پر مبنی سیاست کا وہ بازار گرم ہو گیا جو آج بیسویں صدی میں ہمیں نظر آتا ہے۔

یہ صورتحال نہ صرف یہ کہ حالات کی اس تدریج کے خلاف ہے جو عموماً تاریخ میں کار فرما ہوا کرتی ہے بلکہ اگر اس صورت حال کو تسلیم کر لیا جائے تو ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کے ارشاد نبوی ؐ کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔

لہٰذا خلافت راشدہ اور حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں فرق تو بیشک تھا' لیکن وہ تقویٰ اور فسق کا فرق نہ تھا' بلکہ اس فرق کی بہترین تشریح وہ ہے جو مشہور صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی ہے :

حضرت عدی بن حاتمؓ حضرت علیؓ کے سرگرم حامیوں میں سے تھے' صفین وغیرہ کی جنگوں میں انہوں نے کھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بھی وہ اپنے اس موقف پر مضبوطی سے قائم رہے' ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ ہمارے عہد حکومت کے بارے میں تمہارا خیال ہے' وہ کیسا ہے؟ حضرت عدیؓ نے فرمایا کہ اگر سچ کہیں تو تمہارا خوف ہے اور جھوٹ کہیں تو اللہ کا۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا میں تمہیں قسم دیتا ہوں' سچ سچ بیان کرو۔

اس پر حضرت عدیؓ نے ارشاد فرمایا :

عدل زمانکم ھذا جور زمان قد مضیٰ' وجور زمانکم ھذا عدل زمان ما یاتی [1]

---

[1] الیعقوبی ص ۲۳۲ ج ۲' دار صادر بیروت ۱۳۷۹ھ

"تمہارے زمانے کا انصاف پہلے زمانے کا ظلم تھا اور تمہارے زمانے کا
ظلم آئندہ زمانے کا انصاف ہو گا۔"

حضرت عدیؓ کے اس جامع جملے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حضرات خلفائے راشدین
احتیاط تقویٰ اور احساس ذمہ داری کے جس معیار بلند پر فائز تھے بعد میں وہ معیار باقی نہیں
رہا۔ خلفائے راشدینؓ عزیمت پر عامل تھے اور حضرت معاویہؓ نے رخصتوں میں توسّع سے کا
لیا۔ وہ حضرات اپنی عمومی زندگی میں تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرتے تھے' اور حضرت معاو
مباحات کی حد تک خلاف احتیاط باتوں کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔ مثلاً خلفائے راشدینؓ
عزیمت اور احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا' باوجودیکہ ان
صاحبزادوں میں خلافت کی شرائط پائی جاتی تھیں' اس کے برخلاف حضرت معاویہ رضی اللہ
عنہ نے رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹے کو ولی عہد بنا دیا۔ خلفائے راشدینؓ نے عزیمت او
اور احتیاط کے تحت اپنا طرز معیشت نہایت فقیرانہ بنایا ہوا تھا مگر حضرت معاویہؓ نے رخصت
و اباحت پر عمل کیا۔ اور ان کے مقابلے میں نسبتاً فراخی عیش اختیار فرمائی۔[1] خلفائے
راشدین کے احساس ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ وہ عوام کے ایک ایک فرد کی خبر گیری اس کے
گھر جا جا کر کیا کرتے تھے' اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ایسی کوئی بات
مروی نہیں ہے' خلفائے راشدینؓ کی اصابت رائے اور صحت اجتہاد کا عالم یہ تھا کہ خو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اتباع کے ساتھ ان کے اتباع کا حکم فرمایا' لیکن حضرت
معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جمہور امت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سے متعد
اجتہادی غلطیاں سرزد ہوئیں۔

اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کے بارے میں حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرما
ہیں کہ :

تمہارے زمانے کا انصاف پہلے زمانے کا ظلم تھا۔

---

[1] مگر یہ فراخی عیش بھی آج کل کے حکمرانوں کی سی عیش کوشی نہ تھی' یونس بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ
میں نے حضرت معاویہؓ کو دمشق کے بازاروں میں اس حالت میں چلتے دیکھا ہے کہ انہوں نے پیوند لگی
ہوئی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ' ص ۱۳۴ ج ۸)

عقائد کے علماء وائمہ نے بھی خلفائے راشدینؓ اور حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں یہی فرق بیان فرمایا ہے۔ علامہ عبدالعزیز فرہاری رحمتہ اللہ علیہ جو علم عقائد کے مشہور محقق عالم ہیں، تحریر فرماتے ہیں :

قلت لاهل الخير مراتب بعضها فوق بعض و كل مرتبة منها يكون محل قدح بالنسبة الى التى فوقها.... ولذ اقيل حسنات الابرار سيئات المقربين و فسر بعض الكبراء قوله عليه السلام انى لاستغفر الله فى اليوم اكثر من سبعين مرة بانه كان دائم الترقى و كلما كان يترقى الى مرتبة استغفر عن المرتبة التى قبلها واذا تقرر ذلك فنقول كان الخلفاء الراشدون لم يتوسعوا فى المباحات وكان سيرتهم سيرة النبى صلى الله عليه وسلم فى الصبر على ضيق العيش والجهد... واما معاويةؓ فهو ان لم يرتكب منكرا لكنه توسع فى المباحات ولم يكن فى درجة الخلفاء الراشدين فى اداء حقوق الخلافة لكن عدم المساواة بهم لا يوجب قدحا فيه

"اہل خیر کے مختلف مراتب ہوتے ہیں، جن میں سے بعض دوسرے بعض سے بلند ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر مرتبہ اپنے سے بلند مرتبے کے اعتبار سے قابل اعتراض ہوتا ہے... اسی لئے مقولہ مشہور ہے کہ "نیک لوگوں کے حسنات مقرب لوگوں کی برائیاں ہوتی ہیں" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو یہ ارشاد مروی ہے کہ "میں دن میں ستر سے زیادہ دفعہ اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں" اس کی تشریح بعض اکابر نے اس طرح فرمائی ہے کہ آپ کے درجات میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی تھی، اور آپ جب بھی ترقی کا کوئی اگلا درجہ حاصل کرتے تو پچھلے درجہ سے استغفار فرماتے تھے، جب یہ بات طے ہوگئی تو ہم یہ کہتے ہیں کہ خلفاء راشدینؓ نے مباحات میں توسع سے کام نہیں لیا تھا، اور تنگی عیش پر صبر اور جدوجہد کے معاملے میں ان کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھی.... رہے حضرت معاویہؓ سو انہوں نے اگرچہ کسی منکر (کھلے گناہ) کا ارتکاب تو

نہیں کیا لیکن انہوں نے مباحات میں توسع اختیار کیا، اور حقوق خلافت کی ادائیگی میں وہ خلفاء راشدینؓ کے درجے میں نہیں تھے، لیکن ان کی برابری نہ کر سکنا ان کے لئے کسی قدح کا موجب نہیں ہے"۔[۱]

غرض یہ کہ اگر اکابر صحابہ کرام کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں کچھ خرابیاں نظر آتی تھیں تو وہ خلفائے راشدین کی نسبت سے تھیں، ظاہر ہے کہ جو حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کا انداز حکومت دیکھ چکے تھے انہیں حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں خامیاں نظر آئیں تو کچھ بعید نہیں ہے، لیکن اس سے اس بات کا کوئی جواز نہیں نکلتا کہ ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص بعض صحابہ کرامؓ کے اس تاثر کو بنیاد بنا کر حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں آج کی گندی سیاست کے تمام مظاہرے تلاش کرنے شروع کر دے اور تحقیق کے بغیر ان پر جھوٹ، خیانت، رشوت، اخلاقی پستی، ظلم و جور، بے حمیتی اور سیاسی بازی گری کے وہ تمام الزامات عائد کر ڈالے جو آج سیاست دانوں میں نظر آتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کی نسبت سے ان کے عہد حکومت میں فرق ضرور تھا۔ لیکن یہ فرق فسق و معصیت اور ظلم و جور کی حد تک نہیں پہنچا تھا، ان کی حکومت، حکومت عادلہ ہی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی ارشاد فرماتے ہیں[۲]:

ما رایت احدًا بعد عثمانؓ اقضٰی بحق من صاحب ھذا الباب یعنی معاویۃ

"میں نے عثمانؓ کے بعد کوئی شخص اس صاحب مکان یعنی معاویہؓ سے زیادہ حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا"

امام ابو بکر اثرمؒ نے اپنی سند سے ابو ہریرہ **المکتب** کا قول نقل کیا ہے کہ ہم مشہور محدث امام اعمشؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عدل و انصاف کا ذکر چل نکلا تو امام اعمشؒ نے فرمایا کہ (تم عمر بن عبدالعزیز کے انصاف پر حیران ہو) اگر معاویہؓ کا

---

[۱] النبراس علی شرح العقائد ص ۵۱۰ مطبع روز بازار امرتسر ۱۳۱۸ھ

[۲] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

عہد حکومت پالیتے تو تمہارا کیا حال ہوتا؟" لوگوں نے پوچھا کیا ان کے حلم کے اعتبار سے؟" امام اعمشؒ نے جواب دیا "نہیں، خدا کی قسم ان کے عدل و انصاف کے اعتبار سے۔[1] اور حضرت قتادہؒ، حضرت مجاہدؒ اور حضرت ابو اسحاق سبیعیؒ جیسے جلیل القدر تابعین اپنے زمانے کے لوگوں سے خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ "اگر تم حضرت معاویہؓ کا عہد پالیتے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ یہ مہدی (ہدایت یافتہ) ہیں"[2] اور کیوں نہ ہو؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ :

اللھم اجعلہ ھادیًا مھدیًا واھد بہ

"اے اللہ ان کو ہادی اور ہدایت یافتہ بنا اور ان کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دے"[3]

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی اور اس کے بعد کاٹ کھانے والی ملوکیت آجائے گی۔" یہ تیس سال حضرت حسنؓ کے عہد خلافت پر ختم ہو جاتے ہیں، اور اس کے بعد حضرت معاویہؓ کا عہد حکومت شروع ہوتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں بعض علماء نے اس حدیث کی سند پر تنقید کر کے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ "ھذا حدیث لا یصح" (یہ حدیث صحیح نہیں ہے)۔

اور بعض دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مجمل ہے اور اس میں تیس سال کے بعد ایک عمومی حکم بیان فرمایا گیا ہے، ہر ہر فرد کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد حکومت اس سے باتفاق مستثنیٰ ہے، علامہ ابن حجر ہیتمیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دوسری حدیث میں اس کی تفصیل آئی ہے اور اس سے حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی صحیح حیثیت واضح ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

---

[1] منہاج السنہ ص ۱۸۵ ج ۳ بولاق مصر ۱۳۲۲ھ [2] ایضا

[3] تبویب مسند احمدؒ (الفتح الربانی) ص ۳۵۶ ج ۲۲ [4] العواصم من القواصم، ص ۲۰۱

اول ھذا الامر نبوۃ ورحمۃ ثم یکون خلافۃ ورحمۃ ثم یکون ملکا ورحمۃ ثم یکون امارۃ ورحمۃ ثم یتکادمون علیھا تکادم الحمیر

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ "رجالہ ثقات" [۱] (اس کے تمام راوی ثقہ ہیں) اس حدیث میں واضح کر دیا گیا ہے کہ خلافت راشدہ ختم ہونے کے بعد جو حکومت آئے گی وہ بھی "ملوکیت اور رحمت" ہوگی۔ علامہ ابن حجر ہیتمیؒ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"بلاشبہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں بہت سے ایسے امور واقع ہوئے جو خلفائے راشدین کے عہد میں مانوس نہیں تھے اور ان ہی امور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ان کی خلافت کو "ملک عاض" (کاٹنے والی ملوکیت) سے تعبیر کیا گیا' اگرچہ حضرت معاویہؓ اپنے اجتہاد کی وجہ سے ماجور ہی ہیں' اس لئے کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مجتہد اگر حق پر ہو تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر غلطی پر ہو تو اسے ایک اجر ملتا ہے اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ مجتہد تھے لہٰذا اگر ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی تب بھی انہیں ثواب ملا' اور یہ بات ان کے حق میں قابل اعتراض نہیں ہے' لیکن ان کی حکومت کو جو ان اجتہادی غلطیوں پر مشتمل تھی "عاض" ہی کہا گیا ....(پھر معجم طبرانی کی مذکورہ روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں)....
خلافت کے بعد جس ملوکیت کا ذکر "طبرانی کی" حدیث میں کیا گیا ہے' اس سے مراد حضرت معاویہؓ کی حکومت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "رحمت" قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان کی حکومت میں ایک اعتبار سے ملک عضوض کی شان ہے اور ایک اعتبار سے رحمت کی' لیکن خارجی واقعات کے اعتبار سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں رحمت کی شان زیادہ ظاہر ہے اور ان کے بعد والے لوگوں میں ملک عضوض کی۔" [۲]

---

[۱] تطہیر الجنان علی ہامش الصواعق المحرقۃ ص ۳۱

[۲] تطہیر الجنان علی ہامش الصواعق: ص ۳۱

اپنی ایک اور کتاب میں علامہ ابن حجر ہیتمیؒ رقم طراز ہیں :

حضرت سفینہؓ سے جو مروی ہے کہ حضرت معاویہؓ پہلے بادشاہ ہیں' اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت صحیح نہ تھی۔ اس لئے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ ان کی خلافت صحیح تھی لیکن اس پر ملوکیت کی مشابہت غالب آگئی تھی' اس لئے کہ وہ بہت سے معاملات میں خلفائے راشدینؓ کے طریقوں سے نکل گئی تھی۔ لہذا خلافت کی بات اس لئے صحیح ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری اور اہل حل وعقد کے اتفاق کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت حق اور صحیح تھی اور ملوکیت کی بات اس لئے درست ہے کہ ان کے عہد حکومت میں کچھ ایسے امور واقع ہوئے جن کا منشاء غلط اجتہاد تھا جس کی بنیاد پر مجتہد گناہ گار تو نہیں ہوتا لیکن اس کا رتبہ ان لوگوں سے بہر حال گھٹ جاتا ہے جن کے اجتہادات صحیح اور واقعہ کے مطابق ہوں اور یہ حضرات خلفائے راشدین اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم تھے۔ لہذا جو شخص حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت پر ملوکیت کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی حکومت میں مذکورہ اجتہادات واقع ہوئے اور جو شخص اسے خلافت قرار دیتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری اور اہل حل وعقد کے اتفاق کے بعد وہ خلیفہ برحق اور واجب الاطاعت تھے اور اطاعت کے لحاظ سے لوگوں پر ان کے وہی حقوق تھے جو ان سے پہلے خلفائے راشدینؓ کو حاصل تھے۔ لیکن یہ بات ان کے بعد آنے والے لوگوں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی اس لئے کہ وہ اجتہاد کے اہل نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض تو کھلے عاصی اور فاسق تھے اور انہیں کسی بھی اعتبار سے خلفاء میں شمار نہیں کیا جاسکتا' بلکہ وہ ملوک کی فہرست ہی میں آتے ہیں۔"[1]

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد حکومت میں فرق تو بیشک تھا' حضرت معاویہؓ کی حکومت اس معیار کی نہیں تھی جو

---

[1] الصواعق المحرقہ' ص ۱۳۱ میمنیہ مصر ۱۳۲۴ھ

خلفائے راشدین کو حاصل تھا' لیکن جمہور امت کے نزدیک یہ فرق اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایک طرف تقویٰ ہو اور دوسری طرف فسق وفجور یا ایک طرف عدل ہو اور دوسری طرف ظلم وجور' بلکہ یہ فرق عزیمت و رخصت کا' تقویٰ اور مباحات کا' احتیاط اور توسع کا اور اصابت رائے اور قصور اجتہاد کا فرق تھا۔ جن لوگوں نے اس فرق کا لحاظ کیا' انہوں نے ان کی حکومت کو "ملوکیت" کا نام دے دیا اور جن لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ فرق فسق و فجور کی حد تک نہیں پہنچا تھا' انہوں نے اسے "خلافت" ہی قرار دیا۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے بالکل صحیح فرمایا کہ :

فلم یکن من ملوک المسلمین ملک خیر من معاویۃ ولا کان الناس فی زمان ملک من الملوک خیر امنهم فی زمن معاویۃؓ اذا نسب ایامه الی ایام من بعده واما اذا نسبت الی ایام ابی بکرؓ و عمرؓ ظهر التفاضل

"مسلمان بادشاہوں میں سے کوئی حضرت معاویہؓ سے بہتر نہیں ہوا اور اگر ان کے زمانے کا مقابلہ بعد کے زمانوں سے کیا جائے تو عوام کسی بادشاہ کے زمانے میں اتنے بہتر نہیں رہے جتنے حضرت معاویہؓ کے زمانے میں' ہاں اگر ان کے زمانے کا مقابلہ ابوبکرؓ و عمرؓ سے کیا جائے تو فضیلت کا فرق ظاہر ہو جائیگا۔"[1]

یہ فرق جو عقائد و کلام کے ان بزرگوں نے بیان فرمایا ہے' تاریخی تدریج کے مطابق بھی ہے' اہل سنت کے عقائد کو بھی اس سے ٹھیس نہیں لگتی تاریخ سے ثابت بھی ہے اور صحابہ کرامؓ کے شایان شان بھی۔ اس کے برخلاف مولانا مودودی صاحب نے جو فرق بیان فرمایا ہے وہ کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں ہے۔

خلافت راشدہ اور ملوکیت کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور کیا کسی ایسی حکومت عادلہ کا وجود ممکن ہے جو خلافت راشدہ تو نہ ہو لیکن اسے شریعت اسلام کے دائرہ سے باہر بھی نہ کہا جا سکے؟ اس موضوع پر شاہ اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "منصب امامت" میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے' اس بحث سے مختلف حکومتوں کے مدارج بھی

---

[1] منہاج السنۃ' ص ۱۸۵' ج ۳

معلوم ہو جاتے ہیں' ان کا شرعی حکم بھی واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اور اس میں اور خلافت راشدہ میں کیا فرق تھا؟ یہ بحث ہم حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ میں بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

> جس وقت ایسا شخص "یعنی خلیفہ راشد" منصب خلافت کو پہنچتا ہے تو ابواب سیاست میں محض خدا کے بندوں کی اصلاح اور نیابت رسول اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں مشغول رہتا ہے اپنے نفع کے حصول کی آرزو اس کے دل میں نہیں گذرتی اور نہ کسی کے ضرر کا غبار اس کے دامن تک پہنچتا ہے' اور اطاعت ربانی میں ہوائے نفس کی مشارکت کو شرک جانتا ہے اور کسی مقصد کا حصول سوائے رضائے حق کے اپنے دل کی خالص منزل کیلئے جنس کثافت خیال کرتا ہے۔ اسے بندگان خدا کی تربیت کے سوا نہ کچھ ظاہر میں مطلوب ہے اور نہ باطن میں مرغوب ہے۔ جو بات قوانین سیاست ایمانی سے انحراف کا باعث اور آئین سیاست سلطانی کی طرف میلان کا سبب ہوگی اس سے ہرگز وقوع پذیر نہ ہوگی .... لیکن امام حکمی بہت سے مقتضیات نفسانیہ سے بالکل پاک نہیں رہ سکتا اور نہ ہی علائق ماسوی اللہ سے بری ہو سکتا ہے' اسی بناء پر مال و منال اور جاہ و جلال کے حصول اور اخوان و اقران پر فوقیت' امصار و بلدان پر تسلط کی آرزو اور دوستوں اور قرابت داروں کی پاسداری' مخالفین و اعداء کی بدخواہی اور لذات جسمانیہ اور مرغوبات نفسانیہ کے حصول کا خیال اس کے دل میں جاگزین ہوتا ہے' بلکہ امور مذکورہ کو طلب کرتا اور سیاست کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے اور طریق حکومت کو حکمت عملی کے ذریعہ اپنی دلی آرزو تک پہنچاتا ہے' پس یہی سیاست سلطانی ہے..... اور یہی مذکورہ لذات جسمانیہ کا حصول جس وقت سیاست ایمانی سے مخلوط ہو جاتا ہے' اسی وقت خلافت راشدہ مخفی اور سیاست سلطانی برملا ہو جاتی ہے اور لذات نفسانیہ کی طلب بحسب اختلاف اشخاص متفاوت ہوتی ہے' یہ ہوا وہوس بعض اشخاص پر اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ انہیں دین و ایمان

کے دائرہ سے خارج کردیتی ہے۔ اور بعض پر اس قدر کہ فسق و فجور کی حد تک پہنچا دیتی ہے اور بعض کو یہاں تک نقصان دیتی ہے کہ بوالہوسان آرام طلب کی لڑی میں منسلک کردیتی ہے۔

اس ہوا و ہوس کا اختلاط بھی سیاست ایمانی کے ساتھ چار مراتب پر خیال کرنا چاہیے۔

اول۔ باوجود ظواہر شریعت کی پاسداری کے طالب لذات نفسانی ہوتا ہے، یعنی ظاہر شریعت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور نہ ہی فسق و فجور اور جورو تعدی کی راہ لیتا ہے، لیکن اپنے نفس کی راحت رسانی میں اس قدر کوشاں رہتا ہے کہ ظاہراً شریعت اسے مباحات سے شمار کرے، ہم اسے سلطنت عادلہ کہتے ہیں۔

دوسرا۔ نفسانی لذات کی طلب اور جسمانی راحت کی خواہش اس قدر غلبہ کرتی ہے کہ کبھی کبھی لذات کے حصول میں دائرہ شرع سے باہر ہوجاتا ہے اور ظالمان بے باک اور فاسقان سفاک کی راہ تک جاپہنچتا ہے اور پھر اس پر پشیمان نہیں ہوتا اور نہ اس سے توبہ کرتا ہے۔ اسے سلطنت جابرہ کہا جائے گا۔

تیسرا۔ نفس کی پیروی اس قدر غالب آجاتی ہے کہ زمانہ بھر کا فاسق وعیاش ہوجاتا ہے، جبرو تکبر کی داد دیتا، ظلم و تعدی کی بنیاد ڈالتا اور عیش کے فکر میں ہمت صرف کرتا اور مراتب تفرج کو کمال تک پہنچاتا اور فسق وفجور، تعدی وجور کے طریقوں کو ملت وسنت کے شواہد کے مقابلہ میں فراہم کرتا ہے اور اسے اپنے ہنر وکمال سے سمجھتا ہے، ہم اسے سلطنت ضالہ کہتے ہیں۔

چہارم۔ اپنے ساختہ و پرداختہ قوانین کو شرع متین پر ترجیح دے اور سنت وملت کے طریقہ کی اہانت کرے، اور ردو قدح اور اعتراض واستہزاء کے ساتھ اس سے پیش آئے، اور اپنے آئین کے محاسن ومنافع شمار کرتا رہے اور شریعت کو عوام فریب باتوں کی مانند محض ہرزہ گردی اور بیہودہ

سرائی میں سے سمجھے اور ملک العلام کے احکام اور سنت سید الانام علیہ الصلوۃ والسلام کو مزخرفات احمق فریب وناداں پسند سے قرار دے اور الحاد و زندقہ کی بنیاد رکھے اسے ہم سلطنت کفر کہیں گے۔"[1]

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے "سلطنت عادلہ" کی بھی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں ایک "سلطنت کاملہ" اور دوسرے "سلطنت ناقصہ" جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو سلطان عادل اللہ کے خوف سے ظاہر شریعت کی پاس داری کرے وہ سلطان کامل ہے' اور جو مخلوق کے خوف سے کرے وہ سلطان ناقص' اس کے بعد شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

"سلطان کامل حکمی خلیفہ راشد ہے' یعنی اگرچہ خلافت راشدہ تک نہیں پہنچا' لیکن خلافت راشدہ کے عمدہ آثار بعض ظواہر شریعت کی خدمت صدق واخلاص سے اس سے صادر ہوں' پس اگر کسی وقت سلطان کامل تخت سلطنت پر متمکن ہو اور اس وقت امام حق کا بھی وجود ہو جو خلافت کی لیاقت رکھتا ہے تو مناسب یہ ہے کہ امام حق منصب امامت پر قناعت کرے اور اپنی کوشش ہدایت وارشاد کی طرف مبذول کرے اور سلطان کے ساتھ امور سیاست میں دست وگریباں نہ ہو اور رعایا اور لشکر کو جنگ وجدال کے بپا کرنے میں بے سروسامان نہ کرے' اگرچہ خلافت راشدہ کا منصب اعلیٰ اس کے ہاتھ سے جا رہا ہے' لیکن عباد اللہ کی خیر خواہی کے مد نظر اس امر کو گوارا کرلے اور راضی بقضا ہو رہے اور تمام مسلمانوں پر اس کو تصدق کردے' جیسا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے سلطان شام "امیر معاویہؓ" سے یہی طریقہ اختیار کیا اور مخالفت کا دروازہ نہ کھولا' اسی مصالحت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کی اور فرمایا :

ان ابنی هذا سید لعل اللہ ان یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین

---

[1] منصب امامت مترجمہ حکیم محمد حسین علوی ص ۹۷ تا ص ۹۹ گیلانی پریس لاہور ۱۹۴۹ء

(میرا یہ بیٹا سید ہے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں اس کے باعث اللہ تعالیٰ صلح کرا دے)۔

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ سلطان کامل پر امت کا اجماع کرنا خدا اور رسولؐ کے منشاء کے مطابق ہے اور اس کی اطاعت درگاہ خداوندی میں مقبول ہے۔

نکتہ دوم

سلطان کامل سلاطین اور خلفائے راشدین کے درمیان ایک برزخ کی طرح ہے، اگر لوگ دیگر سلاطین کو دیکھیں تو اس سلطان کامل کو خلیفہ راشد تصور کریں، اور اگر خلفائے راشدین کا حال معلوم کریں تو اسے سلطان کامل سمجھیں، چنانچہ سلطان شام (حضرت معاویہؓ) نے فرمایا۔

لست فیکم مثل ابی بکرؓ و عمرؓ ولکن سترون امراء من بعدی

"میں تم میں ابو بکرؓ و عمرؓ جیسا حکمران تو نہیں ہوں لیکن میرے بعد عنقریب امیر دیکھو گے۔"

بناء بریں اس کی سلطنت کا زمانہ نبوت اور خلافت راشدہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ پس اس وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے زمانہ کی ابتداء سے اس سلطنت کاملہ کا زمانہ گذر جانے تک ترقی اسلام کا زمانہ ہے۔"[1]

ہمارے نزدیک خلافت اور ملوکیت کے باہمی فرق، ان کے مختلف مدارج، اور حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کی اس سے بہتر تشریح و توجیہ نہیں ہو سکتی۔

---

[1] منصب امامت: ترجمہ ماخوذ از حکیم محمد حسین علوی اردو ترجمہ منصب امامت: گیلانی پریس لاہور ۱۹۴۹ء

ایک ضروری بات

حضرت معاویہؓ کے بارے میں کوئی گفتگو کرتے وقت دو باتیں ضرور یاد رکھنی چاہئیں' ایک تو یہ کہ ان کے خلاف ان کے زمانے ہی میں پروپیگنڈہ بہت زیادہ کیا گیا' خود حضرت معاویہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بڑھاپا بہت جلد آگیا' اس کی کیا وجہ ہے؟
تو آپ نے جواب دیا کہ :

کیف لا ولا ازال اری رجلا من العرب قائما علی راسی یلقح لی کلا ما یلزمنی جوابہ' فان اصبت لم احمد' وان اخطات سارت بہا البرود

"کیوں نہ ہو؟ ہر وقت عرب کا کوئی شخص میرے سر پر کھڑا رہتا ہے جو ایسی باتیں گھڑتا ہے جن کا جواب دینا لازم ہو جاتا ہے' اگر میں کوئی صحیح کام کروں تو کوئی تعریف نہیں کرتا' اور اگر مجھ سے غلطی ہو جائے تو اسے اونٹنیاں' (ساری دنیا) میں لے اڑتی ہیں"[1]

لہٰذا ان کے بارے میں تحقیق روایات کی ضرورت اوروں سے زیادہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو پروپیگنڈہ کیا گیا ہے اسے بلا تحقیق درست مان لیا جائے تو صرف حضرت معاویہؓ ہی کی ذات مجروح نہیں ہوتی' بلکہ دوسرے صحابہؓ پر طعن و تشنیع کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جو لوگ حضرت معاویہؓ پر الزام عائد کرنے میں جری ہو جاتے ہیں ان کی زبان دوسرے صحابہ کے خلاف اور زیادہ دراز ہو جاتی ہے۔ حضرت ربیع بن نافع نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ :

معاویۃ ستر لاصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فاذا کشف الرجل الستر اجترأ علی ماوراءہ[2]

"معاویہؓ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پردہ ہیں' جب کوئی شخص

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۴۰ ج ۸   [2] الخطیب: تاریخ بغداد ص ۲۰۹ ج ۱

اس پردے کو کھول دے گا تو اس کے پیچھے کے لوگوں پر اس کی جرأتیں بڑھ جائیں گی۔"

اور اسی لئے جب حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ؟ تو حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا :

تراب فی انف معاویۃ افضل من عمر بن عبد العزیز[1]

"معاویہؓ کی ناک کی مٹی بھی عمر بن عبدالعزیز سے بہتر ہے۔"

اور اسی لئے حضرت ابراہیم بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ "میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کسی شخص کو مارا ہو' البتہ ایک ایسے شخص کو کوڑوں سے مارا جس نے حضرت معاویہؓ کو برا بھلا کہا تھا" [2]

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸

[2] ایضاً

حصہ دوم

حضرت معاویہ رضؓ

اور

خلافت وملوکیت

حضرت معاویہؓ کے بارے میں احقر کے سابقہ مقالہ پر ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں ایک مفصل تنقید شائع ہوئی تھی جو تیرہ ماہ تک جاری رہی، اس کے جواب میں احقر کا جو مضمون ماہ نامہ البلاغ ذی الحجہ ۹۱ ۱۳ھ کے شمارے میں شائع ہوا وہ اس حصے میں پیش خدمت ہے ——————— محمد تقی عثمانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

★

اللھم فاطر السموٰت والارض انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ یختلفون

حضرت معاویہؓ
اور
خلافت وملوکیت

پچھلے سال ہم نے جناب مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے ایک حصے پر تبصرہ شائع کیا تھا۔ جو آٹھ قسطوں میں مکمل ہوا۔ ہم نے اپنے مقالے کے شروع ہی میں یہ بات واضح کردی تھی کہ ان موضوعات پر بحث و مناظرہ کو ہم پسند نہیں کرتے۔ لیکن چونکہ ہماری شامت اعمال سے یہ بحث ہمارے ملک میں چھڑ گئی' افراط و تفریط کے نظریوں نے ذہنوں کو بری طرح الجھا دیا' اور اس سلسلے میں ہم پر بھی سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوئی' اس لئے ہم نے چاہاکہ خالص علمی انداز میں جمہور اہلسنّت کا معتدل موقف دلائل کے ساتھ بیان کردیا جائے تاکہ جو حضرات مسئلے کی علمی حقیقت سمجھنا چاہیں' وہ ذہنی طور پر مطمئن ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ ہمارے اس مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی' ملک و بیرون ملک سے ہمارے پاس خطوط اور پیغامات کا تانتا بندھا رہا' بیسیوں غیر جانبدار حضرات نے بتایا کہ اس مقالے نے ان کے دلوں کو مطمئن کیا اور شکوک و شبہات کے بہت سے کانٹے نکال دیئے۔ اس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔

"داد" کے ساتھ "بیداد" بھی مصنف کا ہمیشہ سے مقدر رہی ہے' چنانچہ جن حضرات کو یہ مقالہ کسی وجہ سے پسند نہ آیا' انہوں نے بھی اسے اپنی نرم گرم ہر طرح کی تنقید سے

نوازا۔ بات تنقید سے آگے سبّ و دشنام تک بھی پہنچی' اور انتہاء یہ کہ بعض جوشیلے حضرات نے ہمیں "سوشلسٹ" تک قرار دیا۔ اور نہ جانے کیسے کیسے القاب دیئے گئے۔

اس مقالے سے ہمارا مقصد صرف جمہور اہل سنت کے موقف کا مدلّل اظہار تھا' اس موضوع پر بحث و مناظرہ کی فضا پیدا کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ ہمارے پاس مقالے کی تائید اور تردید میں خطوط اور مضامین کا ایک انبار لگ گیا تھا' لیکن ہم نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود ہر ایک کو انفرادی جواب دینا گوارا کیا' اور ان میں سے کوئی ایک خط بھی شائع نہیں کیا' تاکہ یہ مسئلہ صرف اپنی علمی حدود میں رہے اور اس نازک دور میں محاذ جنگ نہ بن سکے۔

لیکن ابھی ہمارے مقالے کی صرف دو قسطیں ہی شائع ہوئی تھیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ماہانہ رسالہ ترجمان القرآن میں جناب ملک غلام علی صاحب نے اس پر قسط وار مفصل تبصرہ شروع کر دیا' جو مسلسل تیرہ مہینے جاری رہنے کے بعد چند ماہ پہلے ختم ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں' ہمارا مقصد صرف اپنے موقف کا مدلّل اظہار تھا' اس لئے ہمارا ارادہ اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کا نہیں تھا' ہماری دوسری زیادہ اہم مصروفیات بھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں' لیکن احباب کا شدید اصرار ہے کہ ملک صاحب کے مضمون پر تبصرہ ضرور کیا جائے' ادھر ملک صاحب کے پورے مضمون کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس پر تبصرہ کرنے کے لئے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا' اس لئے باول ناخواستہ اس موضوع پر دوبارہ قلم اٹھا رہا ہوں' اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اس موضوع پر البلاغ کی آخری تحریر ہوگی' اگر کوئی صاحب اس سے مطمئن ہوں تو اسے قبول فرمائیں' اور اگر مطمئن نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ نظریات کے معاملے میں جبر نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن شروع میں یہ دردمندانہ التجا میں پھر کروں گا کہ اس نازک معاملے میں ذاتی جذبات اور جماعتی تعصبات کو درمیان سے ہٹا کر پوری تحقیقی غیر جانبداری سے کام لیا جائے' اور جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اسے خالص افہام و تفہیم کے ماحول میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پڑھا جائے۔ خدا شاہد ہے کہ ان گزارشات سے کسی کی تنقیص و توہین مقصود نہیں' نہ اس کے پیچھے بات کی پچ بھرنے کا جذبہ کارفرما ہے' جو حضرات البلاغ کو پابندی سے پڑھتے

رہے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ ہم نے اپنی کسی غلطی کے اعتراف میں کبھی تامل نہیں کیا بلکہ جہاں اپنی بات نیچی کرنے میں دین کا کوئی فائدہ محسوس کیا ہے وہاں اپنا جائز حق بھی چھوڑ دیا۔

ہمارے پہلے مقالے کے پیچھے جذبہ صرف یہ کار فرما تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دین کی پوری عمارت کی بنیاد ہیں' اس بنیاد کی ایک اینٹ بھی اگر اپنی جگہ سے ہلائی جائے تو پورا قصر ایمان متزلزل ہو سکتا ہے' لہٰذا ان حضرات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس تحریر کا منشاء بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مجموعی تاثرات

میں جناب ملک غلام علی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اتنی تفصیل اور بسط کے ساتھ میرے مقالے پر تبصرہ فرمایا' کسی مسلمان کی کوئی بات اگر غلط محسوس ہو تو جذبۂ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اسے اس پر متنبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں :

(۱) تنقید کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ جس شخص پر تنقید کی جا رہی ہو' پہلے اسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دینا چاہئے' اس لئے کہ کسی کی بات کو انصاف کے ساتھ صحیح یا غلط اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا ہو' اسی اصول کے مطابق میں نے ملک صاحب کے مضمون پر اس وقت تک قلم نہیں اٹھایا جب تک ان کی تیرہ قسطیں پوری نہیں ہو گئیں' لیکن ملک صاحب نے تنقید کے اس اصول کا مطلق خیال نہیں فرمایا' ابھی میرے مضمون کی آٹھ قسطوں میں سے صرف دو ہی قسطیں منظر عام پر آئی تھیں کہ انہوں نے جواب دہی شروع کر دی' اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی اقساط میں مجھ پر بہت سے وہ اعتراضات کئے ہیں جن کا مفصل جواب میرے آئندہ مضامین میں آگیا ہے' اور اس کے بعد انہوں نے اس جواب سے کوئی تعرض نہیں فرمایا' نیز اگر وہ میرے مکمل مضامین پڑھ کر تنقید لکھتے تو شاید اس قسم کے الزامات عائد کرنے کی نوبت نہ آتی کہ میرا میلان کسی بھی درجہ میں ناصبیت کی طرف ہے یا خود ان کے الفاظ میں انکار حدیث کی طرح میں "انکار تاریخ اسلام" کے کسی نئے مسلک کے بناء ڈال رہا ہوں۔

اس طرز عمل کا ایک نقصان خود ملک صاحب نے ذاتی طور پر یہ اٹھایا ہے کہ جو مقالہ میں نے ڈیڑھ مہینے میں لکھ دیا تھا' اس پر تنقید کے لئے موصوف کو پورے تیرہ مہینے صرف کرنے پڑے' اور تیرہ مہینے بھی وہ جن میں ملک کے اندر اسلام اور سوشلزم کا معرکہ اپنے شباب پر پہنچا ہوا تھا۔

(۲) علمی تنقید میں بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کی بات خود اسی کے الفاظ میں پوری کی پوری نقل کی جائے' لیکن اگر اختصار کے پیش نظر اس کی تلخیص ضروری ہو تو کم از کم خلاصہ نکالنے میں یہ رعایت ضرور ہونی چاہئے کہ اس کے استدلال کا کوئی اہم جز رہنے نہ پائے' ملک صاحب نے ہر جگہ میری بات کا خلاصہ نکالا ہے۔ مگر یہ خلاصہ بہت سے مقامات پر غیر محتاط اور بعض جگہ صراحتًہ غلط ہے۔

(۳) جن حضرات کو میرے مقالے کے مندرجات سے اتفاق نہ ہو سکا انہوں نے بھی اس بات کا اظہار بہر حال کیا ہے کہ میری تنقید ایک خالص علمی انداز کی تنقید تھی جس میں طنز و تعریض اور ذاتی چھینٹے اڑانے سے مکمل پرہیز کیا گیا تھا' خود ملک صاحب نے بھی دبی زبان سے اس کا اعتراف فرمایا ہے' لیکن افسوس ہے کہ خود انہوں نے تنقید کا جو انداز اختیار فرمایا وہ کسی طرح بھی ایک علمی بحث کے شایان شان نہیں تھا' میں نے عرض کیا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' افہام و تفہیم کے ماحول میں کہہ رہا ہوں' لیکن انہوں نے براہ راست مناظرہ کے اس اسٹیج سے گفتگو شروع کر دی جہاں مخالف پر طعن و تشنیع کرنے' اور اس پر فقرے کسنے اور چھینٹے اڑانے کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی اور جہاں صرف اس کو ہی نہیں' اس کے اکابر کو اور جن مدارس میں اس نے تعلیم پائی ہے ان کو بھی مطعون کرنا زور بیان کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک راقم الحروف کی ذات کا تعلق ہے' ملک صاحب اس پر جو طعن و تشنیع بھی فرمائیں مجھے ذاتی طور پر اس لئے کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں "کم علم" سے لے کر "بے عمل" تک ہر خطاب کو اپنے حق میں درست سمجھتا ہوں' لیکن ہم سب کو یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ اس انداز گفتگو کے ساتھ اس اسلام کی کوئی اچھی نمائندگی نہیں کر سکیں گے جو فرعون کے سامنے بھی نرم بات کہنے کی تلقین کرتا ہے۔

اگر ملک صاحب برا نہ مانیں تو ایک خیر خواہانہ گذارش اور ہے' اور وہ یہ کہ اول تو

علمی تنقیدوں میں طعن و تشنیع کا انداز فی نفسہ مناسب نہیں۔ دوسرے اگر کسی زمانے میں اس کو مستحسن سمجھا جاتا ہو تو اب یہ طریقہ سنجیدہ علمی حلقوں میں متروک ہو چکا ہے۔ اس دور میں طعن و تشنیع کے بارے میں عموماً تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے علمی دلائل کے خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے' تیسرا اگر کسی کو طنز و تعریض کا ایسا ہی ذوق ہو تو پھر انشاء کی یہ صنف تھوڑا سا ریاض چاہتی ہے' اس کی نزاکتوں پر قابو پانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے' اور اس محنت کے بغیر انسان کو طنز اور جھنجلاہٹ کا فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ اس فن کا سب سے پہلا سبق یہ ہے طنز جھنجلا کر دانت پیسنے کا نہیں' بلکہ تبسم زیر لب کے ساتھ چٹکی لینے کا نام ہے۔ اور جب یہ سبق ذہن نشین نہ ہو تو یہ گولی خود اپنے ہی اوپر چل جاتی ہے۔

بہر کیف! جہاں تک ملک صاحب کی تعریضات کا تعلق ہے' ان کے جواب میں تو صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ۔

تو دانی کہ مارا سر جنگ نیست
دگر نہ مجال سخن تنگ نیست

اور۔

آپ ہی اپنی اداؤں پر ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

البتہ ان کے صرف ان دلائل پر مختصر تبصرہ ان صفحات میں پیش کر رہا ہوں' جو علمی نوعیت کے ہیں اور جو واقعات ذہنوں میں خلش پیدا کر سکتے ہیں۔

بدعت کا الزام

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان سے مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے:

> "ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی' اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورا کرتے تھے اور اس معاملے میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے' مختلف خلفائے بنی امیہ کے عہد میں قانون کی پابندی کا کیا حال رہا۔ اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہوگئی تھی، امام زہریؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے، نہ مسلمان کافر کا، حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا۔"

(خلافت و ملوکیت ص : ۱۷۳)

میں نے اس عبارت پر دو اعتراض کئے تھے :

(ا) مولانا مودودی صاحب نے خط کشیدہ جملے میں امام زہری کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ البدایہ والنہایہ میں (جس کے حوالہ سے مولانا نے امام زہریؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے) امام زہریؒ کا اصل عربی جملہ یہ ہے کہ :

راجع السنۃ الاولی [1]

حضرت عمر بن عبد العزیز نے پہلی سنت کو لوٹا دیا

"پہلی سنت کو لوٹا دینے" اور "بدعت کو ختم کرنے" میں جو زمین آسمان کا فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے "سنت اولی" کے لفظ کو "بدعت" سے کیوں بدلا؟ اگر مولانا خود حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو "بدعت" سمجھتے ہیں تو وہ اپنی طرف سے اسے بدعت فرمائیں، لیکن امام زہریؒ کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی گئی جو انہوں نے ہرگز نہیں کہی؟

ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کا اپنے طویل مقالے میں کوئی جواب نہیں دیا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۳۲ ج ۹ مطبعۃ السعادۃ

(۲) میرا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ خود مولانا مودودی صاحب نے جو حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو "بدعت" قرار دیا ہے' وہ درست نہیں' اس لئے کہ یہ حضرت معاویہؓ کا فقہی اجتہاد تھا' عمدۃ القاری اور فتح الباری کے حوالے سے میں نے کہا تھا کہ اس معاملہ میں صحابہ کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے' حضرت معاویہؓ کے علاوہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور تابعین میں سے مسروقؒ' حسن بصریؒ' محمد بن حنفیہؒ اور محمد بن علی بن حسینؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا جائے گا' اور یہ مسلک بے بنیاد بھی نہیں ہے' بلکہ حافظ ابن حجرؒ نے اس مسلک کی بنیاد ایک مرفوع حدیث کو قرار دیا ہے۔

جو شخص بھی میرے مقالے میں یہ بحث پڑھے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبل کا یہ مسلک دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی اور راجح ہے' بلکہ میری گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ یہ ایک فقہی اجتہاد ہے جس سے دلائل کے ساتھ اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسے "بدعت" اور "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" نہیں کہا جاسکتا' اور نہ اس پر اس قیاس کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سیاسی اغراض کے لئے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھی۔

لیکن ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کے جواب میں جو طویل بحث فرمائی ہے اسکا حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ کے دلائل کمزور اور انکے مقابلے میں جمہور فقہاء کے دلائل مضبوط ہیں۔ حالانکہ اگر مولانا مودودی صاحب کا مقصد صرف یہی ہوتا کہ حضرت معاویہؓ کا یہ اجتہاد کمزور' مرجوح یا جمہور کے مسلک کے مطابق غلط ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا' اس صورت میں جتنے دلائل ملک صاحب نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے مسلک کے خلاف پیش کئے ہیں' ہم ان پر دو چار کا اور اضافہ کرسکتے تھے' اس لئے کہ مسلک کے لحاظ سے ہم جمہور فقہاء ہی کے مسلک کے قائل ہیں اور وہی مسلک ہمارے نزدیک دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے' لیکن بحث تو یہاں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ اپنے فقہی مسلک کی بناء پر "بدعت" کے مرتکب کس طرح ہو گئے؟ ہم نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے حق میں جو دلائل پیش کئے تھے' اس سے انکے مذہب کی تائید کرنا یا اسے مضبوط قرار دینا مقصد نہیں تھا' بلکہ یہ دکھانا تھا کہ یہ حضرات مجتہد ہیں اور انکے قول کی ایک شرعی دلیل بھی ہے' وہ دلیل اگرچہ کمزور ہے

اور اسی لئے انکا مسلک مختار نہیں لیکن اس کی بناء پر انہیں بدعت کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں تک ان کے مسلک کے دلائل کے لحاظ سے کمزور ہونے کا تعلق ہے' یہ مسئلہ ہمارے اور مولانا مودودی صاحب کے درمیان مختلف فیہ نہیں تھا اسلئے ہم نے اس سے تعرض نہیں کیا۔

صورت واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے درمیان بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف رہا ہے' جن میں ہر فریق اپنے پاس کچھ دلائل رکھتا تھا' ایک مجتہد کو یہ تو اختیار حاصل ہے کہ انکے اقوال میں جس کے دلائل کو زیادہ مضبوط پائے' اسے اختیار کرے اور جس کے دلائل پر دل مطمئن نہ ہو اسے قبول نہ کرے' اور اسے اجتہادی غلطی قرار دے' لیکن ان جیسے مسائل میں کسی صحابی کے مسلک کو "بدعت" نہیں کہا جا سکتا اور نہ چودہ سو سال میں آج تک کسی صحابی کے فقہی مسلک کو' خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کمزور کیوں نہ معلوم ہو' بدعت قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کا یہ مسلک مشہور و معروف ہے کہ وہ ایک دن کی روزی سے زیادہ رقم اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے' ظاہر ہے ان کا یہ مسلک قرآن و سنت کے واضح دلائل کے خلاف ہے' اسی وجہ سے صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی اس معاملہ میں ان کا ہم نوا نہیں تھا' سب کے نزدیک ان سے اس مسئلے میں اجتہادی غلطی ہوئی تھی' اور جمہور امت نے ہمیشہ دلائل کے ذریعہ اس مسلک کی تردید کی ہے' لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا یہ فعل "بدعت" تھا' یا اس سے قانون اسلامی مجروح ہوتا تھا۔ ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں :

> "سوال یہ ہے کہ اگر ایک طرف قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ موجود ہوں' سنت نبویہ اور سنت خلفاء راشدین اربعہ موجود ہوں اور دوسری طرف کسی صحابی یا تابعی کا قول یا فعل ہو جو صریحاً ان سب سے متعارض ہو تو کیا اسے بھی دوسری سنت یا اجتہاد کا نام دیا جا سکتا ہے؟"

ملک صاحب کا منشاء غالباً یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس صحابی یا تابعی کے قول کو "اجتہاد" نہیں بلکہ "بدعت" کہا جائے گا' لیکن انہوں نے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی' میرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ صحابی یا تابعی مجتہد ہے' اور اپنے قول کی بنیاد کسی بھی شرعی دلیل پر رکھتا ہے (خواہ وہ شرعی دلیل ہمیں کمزور نظر آتی ہو) تو بلا شبہ

اسے "اجتہاد" ہی کہا جائے گا' اسے بدعت یا تحریف نہیں کہہ سکتے' ایسی صورت میں عمل تو بلاشبہ قرآن وحدیث اور خلفائے راشدین کی سنت ہی پر کیا جائے گا' صحابی کے منفرد مسلک کو کمزور' مرجوح' یہاں تک کہ اجتہادی غلطی بھی کہا جاسکتا ہے' لیکن اسے "بدعت" قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

صحابہ کرام کا معاملہ تو بہت بلند ہے' بعد کے فقہاء مجتہدین سے ایسے بے شمار اقوال مروی ہیں جو بظاہر قرآن وسنت کے خلاف نظر آتے ہیں' لیکن چونکہ ان کی کوئی نہ کوئی شرعی بنیاد کمزور یا مضبوط موجود ہے' اس لئے ایسے اقوال کو اجتہادی غلطی تو کہا گیا ہے لیکن "بدعت" کسی نے نہیں کہا۔ مثلاً امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دے تب بھی ذبیحہ حلال ہوتا ہے'[1] حالانکہ قرآن کریم کی صریح آیت موجود ہے کہ :

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ

اور اس (ذبیحہ) میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

جمہور فقہاء نے امام شافعیؒ کے اس مسلک کی تردید کی ہے' اسے کمزور کہا ہے' اور اس پر عمل نہیں کیا' لیکن کیا کوئی ایک عالم بھی ایسا بتایا جاسکتا ہے جس نے اس مسلک کی وجہ سے امام شافعیؒ پر بدعت کا الزام عائد کیا ہو؟ وجہ یہی ہے کہ امام شافعیؒ مجتہد ہیں اور اپنے قول کی ایک شرعی بنیاد رکھتے ہیں' یہ بنیاد جمہور کے نزدیک کمزور سہی' لیکن ان کو "بدعت" اور "تحریف دین" کے الزام سے بری کرنے کے لئے کافی ہے۔ ورنہ اگر ملک صاحب کے اصول کے مطابق "بدعت" کے خطاب میں اتنی فیاضی سے کام لیا جائے تو امت کا شاید کوئی مجتہد بھی اس نشتر کی زد سے نہیں بچ سکے گا کیونکہ ہر ایک کے یہاں ایک دو اقوال ضرور ایسے ملتے ہیں جو بظاہر قرآن وسُنت کے خلاف نظر آتے ہیں اور جمہور امت نے اسی لئے انکو قبول نہیں کیا بلکہ رد کردیا ہے مگر ان کے عمل کو بدعت کسی نے نہیں کہا۔

ہاں شرط یہ ہے کہ ایسے قول کا قائل اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو اور اسکے بارے میں یہ گمان نہ کیا جاسکتا ہو کہ وہ خواہشات نفسانی کی اتباع میں تحریف دین کا مرتکب ہوگا' امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

---

[1] بدایۃ المجتہد' ص ۳۴۶ ج ۱' مصطفیٰ البابی ۱۳۷۹ھ

ان الرای المذموم ما بنی علی الجھل واتباع الھویٰ من غیر ان یرجع الیہ وما کان منہ ذریعۃ الیہ وان کان فی اصلہ محموداً وذلک راجع الی اصل شرعی فالاول داخل تحت حد البدعۃ وتتنزل علیہ ادلۃ الذم والثانی خارج عنہ ولا یکون بدعۃ ابداً

قابل مذمت رائے وہ ہے جو جہالت اور خواہشات کی پیروی پر مبنی ہو اور اس میں کسی اصل شرعی کی طرف رجوع نہ کیا گیا ہو' اور رائے کی دوسری قسم وہ ہے جو اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے محمود ہو لیکن رائے مذموم کا ذریعہ بن سکتی ہے' اور اسکی بنیاد کسی شرعی اصل پر ہوتی ہے ان میں سے پہلی قسم تو بدعت کی تعریف میں داخل ہے اور اسپر مذمت کے دلائل کا اطلاق ہوتا ہے' لیکن دوسری قسم کی رائے اس سے خارج ہے اور وہ کبھی بدعت نہیں ہو سکتی۔[1]

اور خود مولانا مودودی صاحب کی زبانی سنئے کہ وہ "اجتہاد" کی کیا تعریف فرماتے ہیں؟

"اجتہاد کی اصطلاح کا اطلاق میرے نزدیک صرف اس رائے پر ہو سکتا ہے جس کے لئے شریعت میں کوئی گنجائش پائی جاتی ہو' اور "اجتہادی غلطی" ہم صرف اس رائے کو کہہ سکتے ہیں جس کے حق میں کوئی نہ کوئی شرعی استدلال تو ہو مگر وہ صحیح نہ ہو یا بعید کمزور ہو۔ (خلافت و ملوکیت' ص ۳۴۳)

اب ملک صاحب غور فرمائیں کہ توریث مسلم کے مسئلے میں انکی ساری بحث کا خلاصہ یہی تو نکلتا ہے کہ حضرت معاویہ اور حضرت معاذؓ بن جبل نے جس حدیث[2] سے استدلال کیا

---

[1] الشاطبیؒ' الاعتصام' ص ۱۳۱ ج ۱' مطبعۃ المنار مصر' ۱۳۳۲ھ

[2] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ملک صاحب نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے' اول تو خود ابو داؤدؒ ہی میں اس کے متصل روایت بغیر مجہول راوی کے آئی ہے دوسرے ملک صاحب کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ یہ سند کی تحقیق و تفتیش ہم لوگوں کے لئے تو دلیل ہے' لیکن جن صحابہؓ نے کوئی ارشاد براہ راست آپؐ سے سنا ہو ان کے لئے یہ بات حدیث کو رد کرنے کی وجہ کیسے ہو سکتی ہے کہ بعد کے راویوں میں کوئی شخص مجہول آگیا ہے۔

ہے وہ استدلال "بےحد کمزور" ہے یا زیادہ سے زیادہ "صحیح نہیں" لیکن اس سے خود مولانا مودودی صاحب کے بیان کے مطابق زیادہ سے زیادہ اجتہادی غلطی ہی تو ثابت ہوتی ہے، "بدعت" کیسے ثابت ہو گئی؟

ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:

> "اس سنت رسول اور سنت خلفائے راشدین کے بالمقابل امیر معاویہؓ کا ایک فیصلہ اور طریقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دوسری سنت ہے، یا یہ ایک فقیہ یا ایک مجتہد کا قیاس واجتہاد ہے، یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے آجکل ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور پرویز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکز ملت جو کچھ طے کر دے وہی سنت ہے۔

جناب غلام علی صاحب ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ وہ کیا بات فرما رہے ہیں؟ کیا میرے کسی ایک لفظ سے بھی یہ اشارہ کہیں نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا فعل "امیر" یا "مرکز ملت" ہونے کی حیثیت سے سنت ہے؟ بات تو یہ کہی جا رہی ہے کہ حضرت معاویہؓ صحابی اور فقیہ مجتہد ہیں، انہیں فقہی مسائل میں اجتہاد کا حق حاصل ہے، لہٰذا انکے اجتہادات کو بدعت یا تحریف دین نہیں کہا جاسکتا اور وہ "امیر" نہ ہوتے تب بھی انہیں یہ حق حاصل تھا اور جب امیر بن گئے تب بھی ان اہلیت اجتہاد ختم نہیں ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی فقیہ مجتہد "امیر" بنجائے تو اسے محض "امیر" ہونے کے جرم میں اجتہاد سے محروم تو نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں اسکے فقہی اجتہادات مرکز ملت کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مجتہد کی حیثیت سے جائز ہونگے۔

پھر ہمیں سخت حیرت ہے کہ ملک صاحب کو حضرت معاویہؓ اور پرویز صاحب کے مرکز ملت کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام امراء کی طرح کوئی امیر نہیں بلکہ ایک صحابی، کاتب وحی اور صاحب فضائل ومناقب بزرگ ہیں، ان کے قیاس واجتہاد اور بعد کے امراء کے قیاس واجتہاد میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علامہ ابن قیمؒ سے زیادہ بدعات اور "رائے مذموم" کا دشمن اور کون ہوگا، لیکن سنئے کہ صحابہؓ کے قیاسات اور آراء کے بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں:

"رأی افقہ الامۃ وابر الامۃ قلوبا و اعمقھا علما و اقلھم تکلفا و اصحہم قصودا و اکملھم فطرۃ واتمھم ادراکا واصفاھم اذھانا الذین شاھدوا التنزیل و عرفوا التاویل و فھموا مقاصد الرسول فنسبۃ آرائھم وعلومھم وقصودھم الی ماجاء بہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کنسبتھم الی صحبتہ والفرق بینھم وبین من بعدھم فی ذلک کالفرق بینھم و بینھم فی الفضل فنسبۃ رأی من بعدھم الی رأیھم کنسبۃ قدرھم الی قدرھم"[1]

"ان حضرات کی رائے جو تمام امت میں سب سے زیادہ فقیہ سب سے زیادہ نیک دل سب سے بڑھ کر عمیق علم رکھنے والے سب سے کم تکلفات کرنے والے سب سے بہتر نیتوں کے حامل اور سب سے زیادہ کامل الفطرت تھے جن کا ادراک سب سے زیادہ مکمل اور جن کے ذہن سب سے زیادہ جلایافتہ تھے' یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے نزول قرآن کا مشاہدہ کیا۔ اس کے معانی کو سمجھا' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کو پہچانا' لہٰذا ان حضرات کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جیسی خود انکو آنحضرت کی صحبت سے حاصل ہے' اور اس معاملے (رائے واجتہاد) میں انکے اور انکے بعد والوں کے درمیان وہی فرق ہے جو فضیلت کے اعتبار سے انکے درمیان پایا جاتا ہے' لہٰذا بعد والوں کی رائے ان حضرات کی رائے کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو ان جیسے لوگوں کی ان جیسے لوگوں کے ساتھ موجود ہے۔"

خلاصہ یہ کہ زیر بحث مسئلہ میں صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی رائے دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے یا کمزور' دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان میں اجتہاد کی اہلیت ہے یا نہیں اگر ان میں اجتہاد کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ کسی فقہی مسئلے میں کوئی رائے دیتے ہیں تو خواہ وہ ہمیں کتنی ہی کمزور معلوم ہو'

---

[1] ابن القیمؒ: اعلام الموقعین ص ٦٦ ج ۱' ادارۃ الطباعۃ المنیریہ

اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے بدعت قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے شاذ مذاہب میں ہم تک صرف ان حضرات کے اقوال پہنچے ہیں انکے دلائل تفصیل کیساتھ نہیں پہنچ سکے ورنہ اگر انکے مکمل دلائل ہم تک پہنچتے تو شاید انکے مذاہب ہمیں اتنے بدیہی البطلان بھی معلوم نہ ہوتے۔

اب سنئے کہ حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ کا علم وفقہ میں کیا مقام ہے؟ یہ روایت تو بہت سے محدثین اور مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ:

اللهم علم معاوية الكتاب[1]

اے اللہ معاویہؓ کو کتاب (قرآن) کا علم عطا فرما

نیز جامع ترمذی کی روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت معاویہؓ کے لئے دعا بھی فرمائی کہ:

اللهم اجعله هاديًا مهديًا واهد به[2]

یا اللہ انکو رہنما اور ہدایت یافتہ بنا اور انکے ذریعہ لوگوں کو ہدایت دے

اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھایا، پھر آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے جسم کا کون سا حصہ مجھ سے متصل ہے؟ حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ "پیٹ" آپ نے فرمایا:

اللهم املأه علمًا[3]

"یا اللہ اسکو علم سے بھر دے"

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا قبول ہوئی۔ صحیح بخاری کی یہ روایت میں اپنے پہلے مقالے میں نقل کر چکا ہوں کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں فرمایا

انه فقيه

بلا شبہ وہ فقیہ ہیں

---

[1] البدایہ والنہایہ، ص ۱۲۲ ج ۸ مطبعۃ السعادۃ مصر

[2] مشکوۃ المصابیح: ص ۵۷۹ اصح المطابع کراچی:

[3] الذہبیؒ تاریخ الاسلام، ص ۳۱۹ ج ۲

علامہ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں ان صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی شمار کرائے ہیں جو فقہ و اجتہاد میں معروف تھے' انہوں لے صحابہ کرامؓ کے تین طبقے قرار دیئے ہیں' ایک وہ جن سے بہت سے فتاوی مروی ہیں' دوسرے وہ جن سے ان سے کم فتاوی منقول ہوئے ہیں اور تیسرے وہ صحابہ جن سے بہت کم فتاویٰ ہم تک پہنچے ہیں' پھر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متوسط طبقے میں شمار کیا ہے[1]

یہی وجہ ہے کہ توریث مسلم من الکافر کے مسئلے میں فقہاء امت نے جہاں بھی صحابہؓ تابعین اور دوسرے فقہاء کے مذاہب شمار کرائے ہیں' وہاں حضرت معاویہؓ حضرت معاذؓ بن جبل کے اس قول کو بھی بطور ایک فقہی مسلک کے ذکر کیا ہے اور چودہ سو سال کے عرصے میں کوئی ایک فقیہ ہماری نظر سے نہیں گذرا جس نے اس قول کو "بدعت" قرار دیا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ ٹھنڈے دل سے ان حقائق پر غور کرے گا اس کے واسطے بات سمجھنے کے لئے یہ بحث کافی ہوگی' اور وہ یقیناً اس موقف کی تائید کرے گا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو انکے اس فقہی مسلک کی بناء پر بدعت کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آخر میں ملک غلام علی صاحب کے دیئے ہوئے ایک اور مغالطے کی نشاندہی ضروری ہے' وہ لکھتے ہیں کہ:

> "المغنی ج ۷ ص ۱۶۶ پر ابن قدامہ" پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد الحنیفہ' علی بن حسین' سعید بن المسیب' مسروق' عبداللہ بن معقل' شعبی' ابراہیم نخعی' یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم کو کافر کا وارث قرار دیا ہے اسکے بعد فرماتے ہیں ولیس بموثق بہ عنہم (اور اسکی نسبت انکی جانب قابل اعتماد نہیں ہے۔) تقریباً یہی وہ نام ہیں جنھیں البلاغ میں بار بار دہرایا گیا ہے۔"
>
> (ترجمانؒ جون ۶۹ ص: ۳۹)

اس عبارت سے ملک غلام علی صاحب کا منشاء یہ ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کے

---

[1] دیکھئے اعلام الموقعین ص ۹ ج اول' ادارۃ الطباعۃ المنیریہ والاصابہ ص ۲۲ ج ۱

اس فقہی مسلک کے بارے میں جو کہا تھا کہ بہت سے حضرات تابعین نے بھی اس مسلک کو اختیار کیا ہے' اس کی تردید کی جائے' لیکن اس مقصد کے لئے انہوں نے المغنی کی عبارت کو جس طرح نقل کیا ہے' اور اسکے مجموعی مفہوم کے ساتھ جو زیادتی فرمائی ہے اسکا اندازہ پوری عبارت کو سیاق و سباق کے ساتھ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے' علامہ ابن قدامہؒ کا پورا فقرہ یہ ہے:

روی عن عمر و معاذ و معاویۃ انھم ورثوا المسلم من الکافر ولم یورثوا الکافر من المسلم و حکی ذلک عن محمد بن الحنفیۃ و علی بن الحسین و سعید بن المسیب و مسروق و عبداللہ ابن معقل والشعبی والنخعی و یحیٰی بن یعمر واسحاق ولیس بموثوق بہ عنھم فان احمدؒ قال: لیس بین الناس اختلاف فی ان المسلم لا یرث الکافر[1]

حضرت عمرؓ' حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ سے یہ قول مروی ہے کہ انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا' اور کافر کو مسلمان کا وارث نہیں بنایا' یہی محمد بن حنفیہ' علی بن حسینؓ' سعید بن مسیبؒ' مسروقؒ عبداللہ بن معقلؒ' شعبیؒ' نخعیؒ' یحییٰ بن یعمرؒ اور اسحاقؒ سے بھی منقول ہے' لیکن ان حضرات کی طرف اس قول کی نسبت قابل اعتماد نہیں' اس لئے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔"

اب یہ بوالعجبی ملاحظہ فرمایئے کہ علامہ ابن قدامہؒ نے شروع میں اس مسلک کی نسبت صرف محمد بن حنفیہؒ وغیرہ ہی کی طرف نقل نہیں کی ہے' بلکہ حضرت عمرؓ' حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف بھی نقل کی ہے' اور پھر آخر میں ان تمام ہی حضرات کے بارے میں فرمایا ہے "ان حضرات کی طرف اس قول کی نسبت ناقابل اعتماد ہے"[2] لیکن ملک غلام

---

[1] ابن قدامہؒ: المغنی ص ۲۹۴ ج ۶ دار المنار مصر ۱۳۶۷ھ

[2] اس لئے کہ انہوں نے دلیل میں امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے:" اس سے صاف واضح ہے کہ اس قول کی نسبت نہ حضرت معاویہؓ وغیرہ کی طرف درست ہے نہ محمد بن حنفیہؒ وغیرہ کی طرف۔

علی صاحب حضرت عمرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ کا نام حذف کر کے صرف محمد بن حنفیہ وغیرہ کے اسماء گرامی ذکر کرتے ہیں، اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ ابن قدامہ نے صرف ان حضرات کی طرف اس مسلک کی نسبت کو مشکوک بتایا ہے حالانکہ اگر ابن قدامہ کی بات مانی ہے تو پوری مانئے، اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں بھی یہ کہئے کہ انکی طرف بھی اس قول کی نسبت صحیح نہیں، لہٰذا مولانا مودودی صاحب نے انکے خلاف جو بحث چھیڑی ہے وہ جڑ مول ہی سے غلط ہے، لیکن یہ آخر انصاف و دیانت کی کونسی قسم ہے کہ ابن قدامہ کی بات کو محمد بن حنفیہ کے بارے میں تو آپ واجب التسلیم قرار دیتے ہیں، اور وہ اسی فقرے میں حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو کہہ رہے ہیں کہ انکی طرف اس قول کی نسبت لائق اعتماد نہیں، تو اسے نقل تک نہیں کرتے، تاکہ یہ کہا جاسکے کہ حضرت معاویہؓ اپنے اس مسلک میں تنہا ہیں، انکا کوئی ہم نوا نہیں، اور پھر مولانا مودودی صاحب نے انہیں جو "بدعت" کا مرتکب بتایا ہے، اسکی تصدیق و تائید کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس طرز عمل پر سوائے اظہار افسوس کے اور کیا کیا جائے؟

نصف دیت کا معاملہ : دوسرے نمبر پر میں نے مولانا مودودی صاحب کی اس عبارت پر تنقید کی تھی:

> "حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی۔ مگر حضرت معاویہؓ نے اسکو نصف کردیا اور باقی نصف خود لینی شروع کردی۔ (خلافت ملوکیت ص ۱۷۳ و ۱۷۴)

میں نے اس عبارت پر چار اعتراض کئے تھے :

(۱) خط کشیدہ جملہ مولانا مودودی صاحب نے خود اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے، اصل کتاب میں یہ جملہ بالکل موجود نہیں ہے، نہ حافظ ابن کثیرؒ نے یہ جملہ کہا، نہ امام زہریؒ نے۔

ملک غلام علی صاحب نے میرا یہ اعتراض میری عبارت کے ذیل میں نقل کیا ہے، لیکن نہ تو اسکا کوئی جواب دیا ہے نہ مولانا مودودی کی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ عربی داں حضرات خود بھی البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸ کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔

(۲) دوسرا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ خط کشیدہ حصے کو چھوڑ کر باقی مقولہ کی نسبت حافظ ابن کثیر کی طرف کرنے میں بھی مولانا مودودی صاحب کو مغالطہ ہوا ہے، یہ مقولہ حافظ ابن کثیر کا نہیں "امام زہریؒ" ہی کا ہے، میں نے لکھا تھا کہ: [۱]

وبہ قال الزھری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں"

ایک دلچسپ غلطی :- میرے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ملک صاحب نے بڑی ہی دلچسپ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

"مدیر البلاغ نے ابن کثیرؒ کے قول کے ساتھ سابق فقرے کے آخری الفاظ وبہ قال الزھری کو غلط طریق پر ملا کر ابن کثیرؒ کے قول کو امام زہریؒ کا قول بنا دیا ہے حالانکہ قال اور بہ قال (یا قال بہ) کے معانی کا فرق تو انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا، اور اس بات سے بھی بے خبر نہ ہونا چاہئے تھا کہ بہ قال کے الفاظ کو بالعموم آخر میں لایا جاتا ہے اور اس کا اشارہ قول ماسبق کی جانب ہوتا ہے" (ترجمان القرآن جون ۱۹۶۹ء صفحہ ۴۰)

اگر ملک غلام علی صاحب کے ذریعے ہماری عربی زبان کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو جاتا تو ہم ان کے ممنون ہی ہوتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ "مدیر البلاغ" کو ملک صاحب سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی، اس کے بجائے اس نے "عربی مدارس کے ماحول" میں تعلیم پائی ہے جہاں کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ "بہ قال" کی ایک قسم اور بھی ہے، جو ہمیشہ روایت کے شروع میں آتی ہے، یہ محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہے کہ جب وہ ایک سند سے کسی کا ایک مقولہ ذکر کرتے ہیں اور پھر آگے اسی سند سے اسی شخص کا دوسرا مقولہ نقل کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مقولہ میں سند کا اعادہ کرنے کے بجائے شروع میں وبہ قال کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بہ کی ضمیر سند کی طرف راجع ہوتی ہے، یعنی وبھذا السندقال جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "مذکورہ سند سے ہی اسکا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔"

---

[۱] ملک صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ "اس سے نفس مسئلہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا" ہمارے نزدیک یہ بات صاف ہونی اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر سنن بیہقیؒ کی جو روایت ہم نے آگے نقل کی ہے، اس کا کماحقہ اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

یہاں بھی "وبہ قال الزھری" کا جملہ اسی معنی میں آیا ہے' شروع میں حافظ ابن کثیرؒ نے توریث مسلم من الکافر کے سلسلے میں امام زہریؒ کا قول نقل کیا ہے' اس کے بعد چونکہ "نصف دیت" کے ... بارے میں امام زہریؒ کا مقولہ بھی اسی سند سے مروی تھا' اس لئے اس کے شروع میں وبہ قال الزھری کہہ دیا ہے' ملاحظہ فرمائیے: البدایہ والنہایہ کی پوری عبارت اس طرح ہے:۔

وقال ابوالیمان عن شعیب عن الزھری: مضت السنة ان لایرث الکافر المسلم ولا المسلم الکافر و اول من ورث المسلم من الکافر معاویة' وقضی بذلک بنوامیة بعده حتی کان عمر بن عبدالعزیز فراجع السنة واعاد ھشام ما قضی به معاویة و بنو امیة من بعده وبه قال الزھری و مضت السنة ان دیة المعاھد کدیة المسلم' وکان معاویة اول من قصرھا الی النصف الخ

ابوالیمان شعیب سے اور وہ زہری سے روایات کرتے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا' نہ مسلمان کافر کا' یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیزؒ آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا' پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو امیہ نے کیا تھا' اور مذکور سند ہی سے امام زہریؒ کہتے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہو گی' معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا الخ......

اب اگر ملک صاحب کے ارشادات مطابق و بہ قال الزھری کے الفاظ کو اگلے فقرے کے بجائے سابق فقرے سے متعلق سمجھا جائے تو عبارت کا ترجمہ یہ ہو جائے گا کہ ... "پہلے وہ شخص جنہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا معاویہؓ ہیں' اسی پر ان کے بعد بنوامیہ فیصلے کرتے رہے یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیزؒ آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا' پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا' جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنوامیہ نے کیا تھا' اور یہی امام زہریؒ کا قول ہے۔"

اب یہ طرفہ تماشہ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو ملک صاحب اس بات پر مصر ہیں کہ

امام زہریؒ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ سنت نہیں' بلکہ بدعت تھا' دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ بہ قال الزھری کا تعلق توریث مسلم کے مقولہ سے ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ امام زہریؒ نے حضرت معاویہؓ ہی کے فیصلے کو صحیح قرار دیا ہے' اور جس چیز کو وہ "بدعت" سمجھتے ہیں اسی کو اپنا مذہب بھی بنایا ہے۔ کیا جناب ملک صاحب اس پر راضی ہیں؟

"مدیر البلاغ" کا جرم یہ ہے کہ اس نے اس مضحکہ خیز صورت حال کو دیکھ کر اتنا لکھ دیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب سے اس عبارت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے' یہ مقولہ حافظ ابن کثیرؒ کا نہیں' بلکہ امام زہریؒ ہی کا ہے وبہ قال الزھری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں' اور پھر غلط فہمی سے بچانے کے لئے بہ قال الزھری" کا ترجمہ بھی ان الفاظ کے ساتھ کر دیا تھا کہ "مذکورہ سند ہی سے امام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔" ہم سمجھتے تھے کہ اہل علم کے لئے اتنا اشارہ کافی ہو گا' لیکن ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ملک صاحب کے لئے اتنا اشارہ غلط فہمی کا سبب بن جائے گا' اور وہ جواب میں ہمیں "بہ قال" کے مفہوم سے باخبر کرنے کی سعادت عطا فرمائیں گے۔

بہرکیف! جس شخص کو حدیث اور تاریخ کی عربی کتابوں سے ادنیٰ ممارست بھی رہی ہو وہ اس تشریح کے بعد اس حقیقت میں شبہ نہیں کر سکتا کہ دیت کے بارے میں یہ مقولہ حافظ ابن کثیرؒ کا اپنا نہیں' بلکہ امام زہریؒ کا ہے' حافظ ابن کثیرؒ نے صرف اسے نقل کیا ہے۔

(۳) اس کے بعد ہم نے عرض کیا تھا کہ امام زہریؒ کا یہ قول یہاں اختصار اور اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے' اس کی پوری تفصیل بیہقیؒ نے اپنی سنن کبریٰ میں روایت کی ہے' اور اس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت معاویہؓ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دیتے تھے' اور باقی نصف بیت المال میں داخل کر دیتے تھے'[۱] لہٰذا آدھی دیت کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ بالکل صاف اور سیدھی سی بات تھی کہ حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا مقولہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔ بیہقیؒ نے تفصیل کے ساتھ' لہٰذا اعتبار بیہقیؒ کی روایت کا ہو

---

[۱] السنن الکبریٰ للبیہقی" ص ۱۰۲ ج ۸' دائرۃ المعارف العثمانیہ' حیدر آباد دکن ۱۳۵۴ھ پوری عبارت کے لئے ملاحظہ ہو یہی کتاب ص ۲

گا' اور اس کی موجودگی میں یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ حضرت معاویہؓ نے آدھی دیت اپنے استعمال میں لانی شروع کر دی تھی' مولانا مودودی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :-

"تمام بزرگان دین کے معاملہ میں عموماً' اور صحابہ کرامؓ کے معاملہ میں خصوصاً میرا طرز عمل یہ ہے کہ جہاں تک کسی معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو' اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔"

(خلافت و ملوکیت ص ۳۰۸)

اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ سنن بیہقیؒ کی اس "معتبر روایت" کو دیکھ کر مولانا کی طرف سے مسرت کا اظہار ہو گا کہ "اس کی مدد سے" حضرت معاویہؓ کے فعل کی صحیح تعبیر مل گئی' لیکن افسوس ہے کہ ملک غلام علی صاحب کو اب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ حضرت معاویہؓ آدھی دیت ذاتی استعمال ہی کے واسطے لیتے تھے' اور بیہقی کی روایت میں جو بیت المال کا لفظ آیا ہے اس سے مراد بھی حضرت معاویہؓ کی ذات ہی ہے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں؛

"واقعہ یہ ہے کہ مورخین نے دوسرے مقامات پر بھی امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو امیہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لئے دونوں طرح کے الفاظ استعمال کئے ہیں' ایک ہی واقعہ میں کہیں لنفسہ کا لفظ ہے اور کہیں لبیت المال کا لفظ' اب اگر بیت المال کی پوزیشن فی الواقع امیر معاویہ اور آپ کے جانشینوں کے زمانے میں وہی ہوتی جو عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں تھی' تب تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہر جگہ لنفسہ سے مراد لبیت مال المسلمین ہے' لیکن بیت المال اگر ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لئے بلا تامل اور بے دریغ استعمال ہونے لگے' فرمانروا کے صرف خاص اور قوم کے بیت المال میں عملاً کوئی فرق نہ رہے اور مسلمانوں کا امیر بیت المال کے آمد و خرچ اور حساب و کتاب کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جوابدہ نہ رہے تو پھر صورتحال الٹ جاتی ہے' اس صورت میں اخذ

لبیت المال بھی اخذلنفسہ بن کر رہ جاتا ہے۔"[1]

ہماری پہلی گذارش تو یہ ہے کہ اگر ملک صاحب کے اس ارشاد گرامی کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں "اخذلبیت المال" بھی "اخذلنفسہ" بن کر رہ گیا ہے تو ملک صاحب کو چاہئے کہ تاریخ میں جن جن مقامات پر حضرت معاویہؓ کا بیت المال کے لئے کچھ لینا مذکور ہے، ان سب کو حضرت معاویہؓ کے "جرائم" کی فہرست میں شامل فرمالیں، اور جب کوئی پوچھے کہ یہ فعل جرم کیسے ہوا تو یہی بلیغ جواب دہرادیں کہ حضرت معاویہؓ کے حق میں اخذلبیت المال کا جملہ اخذلنفسہ کے معنی دیتا ہے۔

پھر کیا جناب غلام علی صاحب کوئی دلیل ایسی پیش کرسکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت معاویہؓ نے بیت المال کی رقوم اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کردی تھیں؟ اور عملاً ان کے ذاتی صرف اور بیت المال میں کوئی فرق نہیں رہا تھا؟ عجیب بات ہے کہ دعویٰ تو وہ کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بیت المال ذاتی اغراض کے لئے بے دریغ استعمال ہونے لگا تھا، مگر خود اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے اس دعوے کی نفی پر دلیل ہم سے طلب فرماتے ہیں کہ:

> "کیا کوئی شخص یہ بتا سکتا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں خلیفہ کے لئے ایک مشاہرہ متعین کردیا گیا ہو اور بیت المال کے مصارف ان کے ذاتی مصارف سے بالکل الگ رکھے گئے ہوں۔"

حالانکہ بیت المال کی پوزیشن میں تبدیلی کا دعویٰ خود انہوں نے کیا ہے اور دنیا بھر کے مسلّمہ اصول استدلال کی رو سے دلیل اس کے ذمہ ہے جو تبدیلی کا مدعی ہے، جو شخص تبدیلی کا انکار کرتا ہے اس کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تبدیلی کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے دعوے کی تردید کے لئے دلیل پیش کرنا ہماری ذمہ داری نہیں تھی، مگر تبرعاً ہم یہ دلیل پیش کرتے ہیں، اس مقالے کی تحریر کے دوران حضرت معاویہؓ سے متعلق حدیث اور تاریخ کی بیسیوں کتابیں ہماری نگاہ سے گزری ہیں، ہمیں تو کہیں اس کا ادنیٰ ثبوت بھی نہیں مل سکا کہ وہ بیت المال کو ذاتی مصارف میں خرچ کرنے لگے تھے، اس کے بجائے ایک ایسی روایت ملی جو شاید ملک صاحب کی بصیرت میں اضافہ کرسکے، حافظ شمس الدین ذہبی رحمتہ اللہ علیہ سند حسن کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

---

[1] ترجمان القرآن، جون ۱۹۶۹ء ص ۴۰ و ۴۱

عن معاویۃؓ وصعد المنبر یوم الجمعۃ فقال عند خطبتہ ایھا الناس ان المال مالنا والفیئی فیئنا' من شئنا اعطینا ومن شئنا منعنا' فلم یجبہ احد فلما کانت الجمعۃ الثانیۃ قال مثل ذلک فلم یجبہ احد فلما کانت الجمعۃ الثالثۃ قال مثل مقالتہ فقام الیہ رجل فقال کلا! انما المال مالنا والفئی فیئنا' من حال بیننا وبینہ حکمناہ الی اللہ باسیافنا' فنزل معاویۃ فارسل الی الرجل فادخل علیہ فقال القوم ھلک ففتح معاویۃ الابواب و دخل الناس فوجلوا الرجل معہ علی السریر فقال ان ھذا احیانی احیاہ اللہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ستکون ائمۃ من بعدی یقولون فلا یرد علیھم قولھم یتقاحمون فی النار تقاحم القردۃ' وانی تکلمت فلم یرد علی احد فخشیت ان اکون منھم فتکلمت الثانیۃ فلم یرد علی احد فقلت فی نفسی انی من القوم ثم تکلمت الجمعۃ الثالثۃ فقام ھذا فرد علی فاحیانی احیاہ اللہ فرجوت ان یخرجنی اللہ منھم' فاعطاہ واجازہ

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن منبر پر چڑھے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "ساری دولت ہماری دولت ہے اور سارا مال غنیمت ہمارا مال ہے' ہم جس کو چاہیں گے دیں گے' اور جس کو چاہیں گے روک دیں گے۔" اس پر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا' جب دوسرا جمعہ آیا تو انہوں نے پھر یہی بات دہرائی' مگر کوئی نہ بولا' پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے پھر یہی بات کہی' تو ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا: "ہر گز نہیں! مال تو سارا ہمارا ہے' مال غنیمت بھی ہم سب کا ہے' جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہو گا' ہم اپنی تلوار کے ذریعہ اس کا فیصلہ اللہ کے پاس لے جائیں گے۔" یہ سنکر حضرت معاویہؓ منبر سے اترے اس شخص کو بلوا بھیجا' جب اسے حضرت معاویہؓ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص مارا گیا' لیکن حضرت معاویہؓ نے دروازے کھول دیئے' لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص انکے

ساتھ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے' اس پر حضرت معاویہؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ رکھے' اس نے مجھے زندہ کر دیا' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "میرے بعد کچھ امراء ایسے آئیں گے جو (غلط) باتیں کہیں گے' مگر ان کا جواب نہیں دیا جائے گا' ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔" میں نے (اپنا امتحان کرنے کے لئے) ایک بات کہی تھی' کسی نے اس کی تردید نہ کی' تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں ان امراء میں داخل نہ ہو جاؤں' تو میں نے دوبارہ وہی بات کہی' پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں' پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا' اور اس نے میری تردید کی' اور اللہ اسے زندہ رکھے' اس نے مجھے زندہ کر دیا اب مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے امراء کے زمرہ سے نکال دیگا۔ پھر حضرت معاویہؓ نے اس شخص کو انعام دیا۔"

حافظ ذہبیؒ یہ روایت نقل کر کے فرماتے ہیں:

ھذا حدیث حسن [1]

(سند کے لحاظ سے) یہ حدیث حسن ہے

اور سنئے! محمد بن عوف طائیؒ اپنی سند سے عطیہ بن قیسؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا کہ: "تمہارے بیت المال میں وظائف ادا کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی ہے اب میں وہ بھی تمہارے درمیان تقسیم کر رہا ہوں' اگر آئندہ سال بھی رقم بچ گئی تو وہ بھی تقسیم کر دیں گے ورنہ مجھ پر کوئی الزام نہ ہو گا" فانہ لیس بمالی و انما ھو مال اللہ الذی افاءعلیکم "اس لئے کہ وہ میرا مال نہیں بلکہ اللہ کا مال ہے جو اللہ نے تم کو بطور غنیمت عطا کیا ہے" [2]

کیا اب بھی ملک صاحب یہ فرمائیں گے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بیت المال

---

[1] الذہبیؒ تاریخ الاسلام ص ۳۲۱ و ۳۲۲ ج ۲ مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ

[2] ابن تیمیہؒ منہاج السنہ ص ۱۸۵ ج ۳ بولاق ۱۳۲۲ھ

ذاتی اغراض کے لئے بے دریغ استعمال ہونے لگا تھا؟

(۴) چوتھا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ مسئلہ عہد صحابہؓ ہی سے مختلف فیہ چلا آتا ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی یا اس سے آدھی یا تہائی' میں نے عرض کیا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں مختلف احادیث مروی ہیں' کسی میں پوری دیت ادا کرنے کا حکم ہے' کسی میں آدھی کا' اسی لئے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی آدھی دیت لینے کا حکم مروی ہے' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل بھی اسی پر رہا' اور امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب ہے' امام ابوحنیفہؒ پوری دیت والی روایت کو ترجیح دیتے ہیں' اور مسلمان اور ذمی کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے' حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں مذاہب کی درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے متعارض احادیث میں تطبیق دی اور یہ مسلک اختیار کیا کہ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دلوائی اور آدھی بیت المال کو۔ میں نے صرف یہ صاف لکھا تھا کہ یہ حضرت معاویہؓ کا فقہی اجتہاد ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

ملک صاحب نے اس کے جواب میں پھر حضرت معاویہؓ کے دلائل پر گفتگو کر کے انہیں کمزور کرنے کی کوشش کی ہے' اور ان کے مقابلے میں اپنے دلائل پیش کئے ہیں' اگرچہ ان کے بیان کئے ہوئے دلائل پر بھی کلام کیا جا سکتا ہے' لیکن ہمارے خیال میں یہ پوری بحث بالکل غیر متعلق ہے' اس لئے کہ بحث سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے دلائل مضبوط ہیں یا کمزور' ہم خود بھی مسلک کے لحاظ سے حضرت معاویہؓ کے مسلک کے قائل نہیں ہیں' گفتگو تو یہ ہے کہ ایک فقیہ مجتہد کے کسی فقہی مسلک کو دلائل کے لحاظ سے کمزور قرار دینے کے بعد بھی اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا اور ہم سمجھتے ہیں کہ "توریث مسلم" کے مسئلے میں ہم اس پر کافی بحث کر چکے ہیں' یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مال غنیمت میں خیانت : مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی

روسے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے
اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہو'
لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے
لئے الگ نکال دیا جائے' پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا
جائے۔"

مولانا مودودی صاحب نے اس واقعہ کے لئے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے تھے' جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ ص ۲۹ جلد ۸ کا حوالہ بھی تھا' میں نے اس حوالے کی مکمل عبارت نقل کرکے ثابت کیا تھا کہ اس میں صاف یہ الفاظ موجود ہیں کہ یجمع کلہ من ھذہ الغنیمۃ لبیت المال (اس مال غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔) ایسی صورت میں مولانا مودودی صاحب کے لئے جائز نہیں تھا کہ وہ اس کتاب کے حوالے سے یہ تحریر فرمائیں کہ "حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا' ان کے لئے الگ نکال لیا جائے) محترم ملک غلام علی صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا مودودی نے اس بات کی سند میں پانچ کتابوں کے حوالے دیئے تھے
جن میں سے پانچواں اور سب سے آخری حوالہ البدایہ والنہایہ کا تھا۔
اب جناب محمد تقی صاحب نے کیا یہ ہے کہ باقی کتابوں کو چھوڑ کر صرف
البدایہ کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔"

ملک صاحب نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے فرمائی ہے کہ جیسے میں نے البدایہ کا حوالہ نقل کرکے کسی جرم عظیم کا ارتکاب کیا ہے' سوال یہ ہے کہ جب مولانا مودودی صاحب نے البدایہ کا حوالہ بقید صفحات خود اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے' اور ساتھ ہی ضمیمہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اصحاب علم خود اصل کتابوں سے مقابلہ کرکے دیکھ سکتے ہیں" (خلافت و
ملوکیت ص ۲۹۹)

تو کیا یہاں "البدایہ" کی طرف رجوع کرنا محض اس وجہ سے گناہ ہوگیا ہے کہ اس سے مولانا مودودی صاحب کی ایک غلطی واضح ہوتی ہے؟

یہ درست ہے کہ باقی چار حوالوں میں بیت المال کا لفظ نہیں ہے' لیکن میں ایک مثال

پیش کرتا ہوں (جسے محض بات سمجھنے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے' اس لئے اس پر برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں) ملک صاحب غور فرمائیں کہ اگر چار اخباروں میں یہ خبر شائع ہو کہ "مولانا مودودی صاحب نے اپنے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا" اور ایک پانچویں اخبار میں خبر کے الفاظ یہ ہوں کہ "مولانا مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا" پھر کوئی شخص ان پانچوں اخباروں کے حوالے سے مولانا پر یہ الزام عائد کرے کہ وہ اپنی ذات کے لئے چندہ وصول کرتے ہیں' تو کیا ملک صاحب اس الزام تراش شخص کو پانچواں اخبار محض اس لئے نہیں دکھائیں گے کہ اس کا حوالہ پانچویں نمبر پر سب سے آخر میں دیا گیا تھا؟

ظاہر ہے کہ اس شخص سے یہی کہا جائے گا کہ پانچویں اخبار میں صراحت کے ساتھ "جماعت اسلامی" کا لفظ موجود ہے اس لئے تمہارے لئے جائز نہیں تھا کہ اس اخبار کا حوالہ بھی دو' اور یہ بھی کہو کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ چندہ اپنی ذات کے لئے وصول کیا ہے' اس کے علاوہ ہر معقول آدمی ان پانچوں اخبارات کو پڑھ کر یہ کہے گا کہ دراصل پہلے چار اخبارات میں خبر مجمل اور مختصر شائع ہوئی ہے' اور پانچویں اخبار نے اصل حقیقت واضح کر دی ہے' اس لئے اعتبار اسی کا ہو گا' پہلے اخبارات نے یا تو معاملہ کی تحقیق نہیں کی یا ان کے رپورٹروں نے مولانا سے عناد کی بناء پر اس چندے کو مولانا کی ذات کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہی بات میں نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں کہہ دی تو کون سا گناہ کیا؟ یہاں تو پانچ حوالوں کا معاملہ ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اگر دس کتابوں میں بھی حضرت معاویہؓ یا کسی اور صحابی تابعی یا کسی بھی شریف آدمی کی طرف ایک مجمل بات منسوب کی گئی ہو جس سے اس کی ذات پر کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہو اور کوئی گیارہویں کتاب اس کی تفصیل بیان کر کے حقیقت واضح کر دے تو عقل' دیانت اور انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ دس کی دس کتابوں کو اسی آخری کتاب کی تشریح پر محمول کیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی یہ غلطی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے' اسے سمجھنے کے لئے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں' اور اگر کوئی شخص اتنی واضح غلطی کو بھی صحیح قرار دینے پر اصرار کرے تو اسے اعلان کر دینا چاہئے کہ وہ مولانا مودودی

صاحب کو معصوم اور غلطیوں سے پاک تصور کرتا ہے۔ ساری دنیا کی آنکھیں فریب کھا سکتی ہیں، لیکن ان کے قلم سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہو سکتی۔

ملک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ان پانچوں مؤرخین میں سب سے آخر میں آئے ہیں' اس لئے ان کا قول پہلے مؤرخین کے مقابلے میں مرجوح ہے' لیکن اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے جتنی باتیں پہلی تواریخ کے خلاف یا ان سے زائد نقل کی ہیں' وہ ساری کی ساری رد کر دی جائیں' کیونکہ پہلی تواریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے' پھر تو حافظ ابن کثیرؒ نے فضول ہی ایک مستقل تاریخ لکھنے کی تکلیف گوارا کی' انہیں چاہئے تھا کہ پہلی تواریخ ہی پر اکتفاء فرمالیتے' اور ایک حافظ ابن کثیرؒ ہی پر کیا موقوف ہے اگر تاریخ کا بعد میں لکھا جانا اس کی تردید کی دلیل ہے تو اسلام میں جو تاریخ سب سے پہلے لکھی گئی تھی' اس کے بعد کسی کو بھی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہئے تھا' اور اگر کسی نے اٹھالیا تھا تو ساری امت کو چاہئے تھا کہ بعد کی تمام تواریخ کو نذر آتش کر دیتی کہ ان سے گمراہیاں پھیلتی ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کی اس صریح غلطی کی تاویل کرنے کے لئے جناب غلام علی صاحب نے دلچسپ ترین بات یہ لکھی ہے کہ "آٹھویں صدی ہجری تک ابن کثیرؒ سے پہلے جن لوگوں نے اس واقعہ کو نقل و روایت کیا ہے اور جنہوں نے ان پہلی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے کیا ان کا یہ بیان کرنا یا یہ سمجھنا بالکل غلط ہو گا کہ امیر معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لئے طلب کیا تھا؟" ملک صاحب کا منشاء غالباً یہ ہے کہ اگر ایک تاریخی حقیقت کے مجمل رہنے کی وجہ سے ساتویں صدی تک کے انسان کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہوں' اور آٹھویں صدی میں وہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی ہو تو بعد کے لوگوں پر بھی واجب ہے کہ وہ حقیقت کے اس انکشاف سے آنکھیں بند کر کے بدستور غلط فہمی ہی میں مبتلا رہیں' اور محض اس لئے اس حقیقت پر کان نہ دھریں کہ وہ ساتویں صدی کے لوگوں پر واضح نہیں ہو سکتی تھی۔

یوں ملک صاحب کے مزید اطمینان کے لئے ہم یہ وثوق کے ساتھ عرض کر سکتے ہیں کہ ساتویں صدی تک کے لوگوں نے بھی ان الفاظ کا یہی مطلب لیا ہو گا کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ بیت المال کے لئے منگایا تھا' اس لئے کہ وہ لوگ زبان و بیان کے محاورات سے اتنے بے خبر نہیں تھے کہ الفاظ کے ظاہر ہی کو تھام کر بیٹھ جائیں اور اس

بات سے قطع نظر کر لیں کہ اگر ایک امیر سلطنت اپنے کسی ماتحت کو یہ حکم لکھ کر بھیجے کہ "خراج کا روپیہ مجھے بھیج دو" تو محاورۃً "مجھے" سے مراد اپنی ذات نہیں ہوتی' بلکہ سرکاری خزانہ ہوتا ہے' اور اگر کوئی شخص اس "مجھے" کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے تو اس کو خلفائے راشدین کے احکام میں بھی (معاذاللہ) خیانت کی بو آسکتی ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ سونا چاندی اپنی ذات کے لئے نہیں' بلکہ بیت المال کے لئے منگایا تھا' اس سلسلے میں ملک صاحب نے جو تاویلات۔۔ ذکر فرمائی ہیں' انکا جواب بھی عرض کر دیا گیا' اور میں سمجھتا ہوں کہ خود ملک صاحب بھی جب کبھی تنہائی میں اپنی ان تاویلات پر غور فرمائیں گے تو انہیں کوئی خوشی نہیں ہو گی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ بیت المال ہی کے لئے سہی سارا سونا چاندی طلب کر لینا شرعاً کہاں جائز ہے؟ اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ اگر سارا سونا چاندی پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ ہو تو یہ حکم شریعت کے مطابق ہو جاتا ہے' بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو گی اس لئے حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دے دیا کہ سارا سونا چاندی (جو حضرت معاویہؓ کے اندازے کے مطابق کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ تھا) بیت المال میں بھیج دیا جائے ملک صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> "یہ استدلال بھی مہمل ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی تھی جسے امیر معاویہؓ پورا کرنا چاہتے تھے' اس زمانے میں مبادلہ زر اور تبادلہ اشیاء کا نظام زیادہ پیچیدہ نہ تھا' اور سونے چاندی کے ذخائر بیت المال کے استحکام کے لئے محفوظ رکھنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔"

اب یہ مقام تو ہمارے محترم نقادہی کو حاصل ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے کی حکومت کے بارے میں اس زمانے کے حکمران سے بھی زیادہ صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی ضرورت تھی یا نہیں تھی' ہمیں کشف والہام کا یہ کمال تو حاصل نہیں' لہٰذا ہمیں یہ جرأت بھی نہیں ہے کہ اپنے اندازے کے خلاف ہر امکان کو "مہمل" قرار دے دیں' لیکن جو تھوڑی سی عقل اللہ نے دی ہے' اس سے اتنا خیال ضرور ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو نظام زر (MONETARY SYSTEM) رائج تھا' وہ دو دھاتی

معیار (BI-METALISM) پر مبنی تھا جس میں بیت المال کو سونے چاندی کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس نظام میں سکے بھی سونے چاندی ہی کے چلتے تھے' اور آج کل کی طرح سونے چاندی کی کمی زائد نوٹ چھاپ کر پوری نہیں کی جا سکتی تھی' اس لئے بیت المال کے استحکام کے لئے سونے چاندی کی ضرورت آج سے زیادہ ہو تو ہو کم کسی طرح نہیں تھی۔

اور اگر بالفرض اس وقت بیت المال کو سونے چاندی کی ضرورت آج کے مقابلے میں کم ہوتی تھی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ضرورت پڑتی ہی نہیں تھی؟ اور کیا اس دور میں کسی ایسے وقت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جس میں بیت المال کے اندر سونا چاندی ضرورت کے مقابلے میں کم ہو گیا ہو؟

ملک غلام علی صاحب نے تاریخ طبریؒ کی ایک روایت پیش کر کے کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے صرف سونا چاندی ہی نہیں بلکہ دوسری نفیس اور عمدہ اشیاء (الروائع) بھی طلب کی تھیں' لیکن طبریؒ کی اس روایت میں کئی راوی مجہول الحال ہیں' اس کے مقابلے میں خود انہوں نے مستدرک حاکمؒ کی جو روایت نقل کی ہے وہ سند کے لحاظ سے مضبوط ہے' اور اس میں "الروائع" کا لفظ نہیں ہے' لہٰذا یہ لفظ حاشیہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے اپنے مضمون میں مولانا مودودی صاحب کی عبارت کو ان کے ماخذ کے مقابلے میں رکھ کر یہ دکھلایا تھا کہ دونوں میں کیا کیا تفاوت پایا جاتا ہے؟ اس کا مقصد صرف دونوں عبارتوں کا فرق بیان کرنا تھا۔ وہاں حضرت معاویہؓ کے فعل کے جواز اور عدم جواز سے بحث نہیں تھی' یہ بحث میں نے آگے کی تھی' لیکن جناب ملک غلام علی صاحب نے میرے مضمون کی نکات میں تقدیم و تاخیر کر کے انہیں "تاویلات" کا لقب عطا فرمایا اور پھر ان تاویلات کی تردید میں کئی صفحات سپردِ قلم کئے ہیں۔ جب خلط مبحث اس حد تک پہنچ جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب دینا تطویل بھی ہے اور وقت کا ضیاع بھی' ملک صاحب کے بنیادی نکات کا جواب میں نے اوپر دے دیا ہے' اس خلط مبحث کے لئے میں قارئین کو صرف یہ دعوت دینے پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ میرے اور ان کے مضمون کو آمنے سامنے رکھ کر مطالعہ فرمالیں۔ انشاء اللہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

حضرت علیؓ پر سبّ وشتم

اس موضوع پر مولانا مودودی صاحب کی زیر بحث عبارت یہ تھی :

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور انکے حکم سے ان کے تمام گورنر' خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے' حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبر رسولؐ پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار' انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔"

(خلافت وملوکیت صفحہ ۱۷۴)

(۱) میں نے اس پر سب سے پہلا اعتراض یہ کیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی طرف یہ "مکروہ بدعت" غلط منسوب کی ہے کہ وہ خود خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔" اس کا ثبوت نہ مولانا مودودی کے دیئے ہوئے حوالوں میں موجود ہے' نہ تاریخ و حدیث کی کسی اور کتاب میں۔ ملک صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"مجھے عثمانی صاحب کی شکایت اس حد تک تسلیم ہے کہ جن مقامات کے حوالے مولانا مودودی نے دیئے ہیں وہاں یہ بات صراحتہً مذکور نہیں کہ امیر معاویہؓ خود سبّ وشتم کرتے تھے۔"

(ترجمان القرآن' جولائی ۱۹۶۹ء ص ۲۴ و ۲۵)

لیکن اس کے بعد انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت معاویہؓ بھی اس فعل کا ارتکاب کرتے تھے' اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے البدایہ والنہایہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ :

لما حج معاویة اخذ بید سعد بن ابی وقاصؓ وادخله دار الندوة فاجلسه معه علی سریره ثم ذکر علی بن ابی طالبؓ فوقع فیه فقال ادخلتنی دارک واجلستنی علی سریرک ثم وقعت فی علی تشتمه الخ

(خود ملک صاحب کے الفاظ میں اس روایت کا ترجمہ یہ ہے)

"جب معاویہؓ نے حج کیا تو انہوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو ہاتھ سے پکڑا اور دار الندوہ میں لے جا کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا' پھر علی بن ابی طالب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عیب جوئی کی' حضرت سعدؓ نے جواب دیا "آپ نے مجھے اپنے گھر میں داخل کیا' اپنے تخت پر بٹھایا' پھر آپ نے علیؓ کے حق میں بدگوئی اور سب وشتم شروع کر دی۔"

ملک صاحب کے بقول اس روایت کے "شواہد و متابعات" مسلم اور ترمذی میں بھی موجود ہیں، مسلم کی ایک حدیث یہ ہے:

عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیه قال امر معاویة بن ابی سفیان سعدًا فقال ما منعک ان تسب ابا تراب فقال اما ما ذکرت ثلاثًا قالهن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلن اسبه

(ملک صاحب کے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے):

"عامر بن سعد بن ابی وقاصؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے حضرت سعدؓ کو حکم دیا' پھر کہا کہ آپ کو کس چیز نے روکا ہے کہ آپ ابو تراب (حضرت علیؓ) پر سب وشتم کریں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب میں ان تین ارشادات کو یاد کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمائے تھے تو ہرگز ان پر سبّ وشتم نہیں کر سکتا الخ"

یہاں سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس روایت کے اس ترجمہ کو درست مان لیا جائے جو جناب غلام علی صاحب نے کیا ہے' اور اس سے بعینہ وہ تاثر لیا جائے جو وہ لے رہے ہیں' تب بھی اس کی روشنی میں مولانا مودودی صاحب کے اس قول کی دلیل

کیسے مل گئی کہ ''حضرت معاویہؓ خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے''۔ ہر معقولیت پسند انسان یہ فرق محسوس کر سکتا ہے کہ نجی مجلسوں میں کسی شخص پر اعتراضات کرنا اور بات ہے اور ''جمعہ کے خطبوں میں بر سر منبر سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' بالکل دوسری چیز' دعویٰ تو یہ کیا جا رہا ہے کہ حضرت معاویہؓ جمعہ کے خطبوں میں سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے' اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ ایک نجی مجلس میں ایک صحابی کے سامنے انہوں نے حضرت علیؓ پر کچھ اعتراضات کئے' اس پر ملک صاحب لکھتے ہیں:

> ''ممکن ہے کہ عثمانی صاحب یہاں نکتہ اٹھائیں کہ اس میں منبر کا ذکر نہیں ہے' مگر میں کہتا ہوں کہ ایسا فعل جس کا دوسروں کو امر کیا جائے اور جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں باز پرس کی جائے کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس کا ارتکاب علانیہ نہ ہو۔ پھر بالفرض اگر یہ فعل منبر پر کھڑے ہو کر نہیں' بلکہ سریر پر بیٹھ کر کیا جائے تو کیا قباحت میں کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے؟ بلکہ ایک طرح سے پرائیوٹ مجلس میں سبّ وشتم اپنے ساتھ اغتیاب کو بھی جمع کر لیتا ہے۔''

اس سوال کا جواب تو صرف ملک صاحب ہی کے پاس ہو گا کہ صرف پرائیوٹ مجلس ہی کی گفتگو ''اغتیاب'' کے ذیل میں کیوں آتی ہے؟ منبر پر سبّ وشتم کرنا اغتیاب کیوں نہیں؟ یہ بات فی الحال موضوع سے خارج ہے' بہر کیف! ان کے کہنے کا خلاصہ یہ ہوا کہ پرائیوٹ مجلس میں کسی کو برا بھلا کہنا منبر پر سبّ وشتم کرنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ اس میں بقول ان کے اغتیاب بھی شامل ہو جاتا ہے' لیکن شاید ملک صاحب یہ لکھتے وقت یہ بھول گئے کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب کیا ارشاد فرما چکے ہیں' انہوں نے مذکورہ عبارت ہی میں لکھا ہے کہ:

> ''کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار' انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔''

خط کشیدہ الفاظ انہوں نے اس جرم کی شناعت کو بڑھانے کے لئے ہی لکھے ہیں' اگر ملک صاحب کے قول کے مطابق خطبے میں گالی دینا پرائیوٹ مجلس میں برا کہنے سے اہون ہے

تو براہ کرم وہ اس کی تشریح بھی فرمادیں کہ اس "خاص طور پر" کا کیا مطلب ہوا؟

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت کا مفہوم ملک صاحب نے صحیح طور سے بیان نہیں فرمایا' حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں نقطۂ نظر کا جو شدید اختلاف تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علیؓ' حضرت معاویہؓ کو بغاوت کا مرتکب سمجھتے تھے اور اس کا اظہار بھی فرماتے تھے' دوسری طرف حضرت معاویہؓ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے میں مداہنت برت رہے ہیں' اس لئے بر غلط ہیں۔ نقطۂ نظر کے اس شدید اختلاف کا اظہار دونوں کی نجی مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا۔ حضرت معاویہؓ اپنے ذاتی خصائل و اوصاف اور فضائل و مناقب میں چونکہ حضرت علیؓ کے ہم پلہ نہیں تھے' اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان نجی مجلسوں میں ان کے منہ سے کوئی ایک آدھ لفظ غیر محتاط بھی نکل جاتا ہو' لیکن اس رائی پر یہ پربت آخر عدل و انصاف کی کونسی منطق سے کھڑا کیا جا سکتا ہے کہ وہ "علانیہ خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔"

اصل میں مذکورہ روایت کے اندر لفظ "سبّ" استعمال ہوا ہے عربی زبان میں اسکا مفہوم بہت وسیع ہے اردو میں لفظ سبّ وشتم جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے عربی زبان میں اسکا استعمال اس مفہوم میں نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی کی غلط روش پر اعتراض کرے' اس کی کسی غلطی پر ٹوکے' اسے خطا کار ٹھہرائے' یا تھوڑا بہت برا بھلا کہہ دے تو اردو میں اس کے لئے لفظ "سبّ و شتم" استعمال نہیں ہوتا' نہ اس پر "گالی" کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے' لیکن عربی زبان میں معمولی سے اعتراض یا تغلیط کو بھی لفظ "سبّ" سے تعبیر کر دیتے ہیں' اور کلام عرب میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔

صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے کہ تبوک کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کل جب تم تبوک کے چشمے پر پہنچو تو تم میں سے کوئی شخص اس کے پانی کو میرے پہنچنے سے پہلے نہ چھوئے' اتفاق سے دو صاحبان قافلے سے آگے نکل کر چشمے پر پہلے پہنچ گئے' اور انہوں نے پانی پی لیا' راوی کہتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو

فسبّھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ان دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "سبّ" فرمایا۔[1]

کیا کوئی شخص یہاں روایت کا یہ ترجمہ کر سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپؐ نے انہیں گالیاں دیں؟ یا ان پر "سبّ وشتم کی بوچھاڑ" کردی؟ ظاہر ہے کہ نہیں! یہاں "سبّ" کا لفظ غلطی پر ٹوکنے' خطا کار ٹھہرانے یا غلطی پر سخت سست کہنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے' ادھر میں نے اپنے پہلے مقالے میں صحیح بخاری کی ایک روایت پیش کرکے ثابت کیا تھا کہ ایک صاحب نے حضرت علیؓ کے لئے محض "ابوتراب" کا لفظ استعمال کرنے کو "سبّ" سے تعبیر فرمادیا تھا۔

ان حالات میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت سعدؓ کے ساتھ اپنی نجی مجلس میں بھی حضرت علیؓ پر جو "سبّ" کیا' یا کرنے کی ہدایت کی تو وہ اردو والا "سبّ و شتم" نہیں تھا جسے مولانا مودودی صاحب نے بڑی آسانی کے ساتھ "گالیاں دینے" سے تعبیر فرمادیا ہے' بلکہ صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث کی طرح یہاں بھی "سبّ" سے مراد حضرت علیؓ پر اعتراض کرنا اور ان کی (مزعومہ) غلطی سے اپنی برأت کا اظہار ہے' اس سے زائد کچھ نہیں' ورنہ یہ بات آخر کیونکر عقل میں آسکتی ہے کہ ایک طرف حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کو اپنے سے افضل قرار دیتے ہیں (واللہ انی لا علم انہ خیر منی وافضل)[2] ضرار صدائی سے کہتے ہیں کہ "میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو" اور جب وہ حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "اللہ ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے' خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے" (رحم اللہ ابا الحسن کان واللہ کذلک)[3] اور جب حضرت علیؓ کی وفات کی خبر پہنچتی ہے تو اس پر شدید رنج و غم کا اظہار فرماتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ "ابن ابی طالب کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہوگئے" (ذھب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالب)[4] اور دوسری طرف انہیں گالیاں دینے' اور ان پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرنے کو جزو ایمان بھی سمجھتے ہیں؟

---

1. صحیح مسلم ص ۲۴۶ ج ۲ اصح المطابع کراچی کتاب الفضائل باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
2. البدایہ والنہایہ ص ۱۲۹ ج ۸
3. الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۳ و ۴۴ ج ۳۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ' القاہرہ ۱۹۳۹ء
4. البدایہ والنہایہ ص ۱۳۰ ج ۸

اگر حضرت سعدؓ کی مذکورہ روایت کو ان تمام روایات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے اور ساتھ میں حضرت معاویہؓ کے مقام صحابیت' ان کے علم و فضل' ان کی شرافت و نجابت اور ان کے حلم و تدبر کو سامنے رکھا جائے تو کسی بھی صاحب انصاف کو اس بات میں شک نہیں رہ سکتا کہ یہاں "سب" کا ترجمہ "گالی" سے کرنا ایسی ہی زیادتی ہے جیسے صحیح مسلمؒ کی مذکورہ حدیث کا یہ ترجمہ کرنا کہ:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) انہیں گالیاں دیں۔"

میں نے اپنے مقالے میں نقل کیا تھا کہ حضرت معاویہؓ کے پاس جب حضرت علیؓ کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ رونے لگے' اور اپنی اہلیہ سے حضرت علیؓ کی تعریف کی' اس واقعے پر جو تبصرہ ملک غلام علی صاحب نے فرمایا ہے اس کا جواب دینا تو میرے بس سے باہر ہے' البتہ اسے محض عبرت کے لئے قارئین کے سامنے نقل کرنا چاہتا ہوں' فرماتے ہیں:

مجھے اس رونے پر کسی شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آگیا۔

آئے تربت پر مری' روئے ' کیا یاد مجھے
خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے رونے سے تو دراصل یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ضمیر خود جانتا تھا کہ خلیفہ وقت سے لڑ کر انہوں نے کس خطائے عظیم کا ارتکاب کیا تھا' اور ان کا دل خوب جانتا تھا کہ بغاوت کے جرم سے قطع نظر علیؓ جیسے شخص کے مقابلہ میں خود ان کا دعوائے خلافت کس قدر بے جا تھا۔[1]

یہاں تک ہماری گزارشات کا خلاصہ دو باتیں ہیں' ایک یہ کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر جو یہ بے دلیل الزام عائد کیا ہے کہ وہ "خطبوں میں بر سر منبر حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے" اسکا ثبوت نہ صرف یہ کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں نہیں ہے' بلکہ جو روایت ملک صاحب نے پیش کی ہے' اس سے بھی یہ الزام ثابت نہیں ہوتا' کیونکہ مولانا مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جمعہ کے خطبوں میں بر سر منبر اس حرکت

---

[1] ترجمان القرآن جولائی ۱۹۶۹ء ص ۲۸

کا ارتکاب کیا جاتا تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ سبِّ علیؓ کو جزو دین بنالیا گیا تھا، اسی لئے اس کو انہوں نے "بدعت" کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ملک صاحب نے جو روایت پیش کی ہے، اس کے پیش نظر یہ ایک نجی مجلس کا واقعہ تھا۔

دوسرے یہ کہ اس نجی مجلس میں بھی جو "سبّ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا ترجمہ "گالی" سے کرنا درست نہیں، اس کا حاصل حضرت علیؓ کے طرز عمل پر اعتراض کرنا، ان کے موقف کو غلط ٹھہرانا، اور اس موقف سے اپنی براءت کا اظہار ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ صحیح مسلم کی حدیث مذکورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لفظ "سبّ" منسوب کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ حضرت معاویہؓ کے گورنروں کا ہے، مولانا مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے "تمام گورنر" بلا استثناء خطبوں میں سبِّ علیؓ کیا کرتے تھے، اس دعوے کی دلیل میں مولانا مودودی نے صرف دو روایتوں کا حوالہ دیا تھا، ایک سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو باقاعدہ سبِّ علیؓ کی تاکید فرمائی تھی، اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ مروان بن حکم اپنے خطبوں میں حضرت علیؓ پر سبّ کیا کرتا تھا۔

ان میں سے پہلی روایت کے بارے میں میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ اس کے تمام راوی از اول تا آخر شیعہ ہی شیعہ ہیں، اور ان میں سے بعض کو علماء رجال نے "کذّاب" تک کہا ہے، اس لئے یہ روایت لائق اعتماد نہیں۔

ملک صاحب نے اس کے جواب میں "رواۃ تاریخ" کے عنوان سے لمبی چوڑی بحث کی ہے، لیکن اس میں سب وہی باتیں دہرائی ہیں جو مولانا مودودی صاحب نے "خلافت و ملوکیت" کے ضمیمے میں لکھی ہیں۔ میرے مقالے کی ساتویں قسط ملک صاحب کی اس بحث کے بعد شائع ہوئی تھی، میں اس میں ان تمام دلائل پر مفصل گفتگو کر کے ان کا جواب دے چکا ہوں، ملک صاحب نے میری اس بحث کا کوئی جواب اب تک نہیں دیا اس لئے مجھے یہاں اس بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں، جو حضرات چاہیں، اس بحث کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

رہی دوسری روایت سو اس کے بارے میں میں نے صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ثابت کیا تھا کہ مروان بن حکم کا "سبّ" کیا تھا؟ ایک شخص نے حضرت سہلؓ سے آکر شکایت

کی کہ مدینہ کا گورنر حضرت علیؓ پر "سب" کرتا ہے' حضرت سہلؓ نے پوچھا "کیا کہتا ہے؟" اس نے جواب دیا

"حضرت علیؓ کو ابو تراب کہتا ہے" حضرت سہلؓ نے جواب میں اسے بتایا کہ یہ لقب تو حضرت علیؓ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت میں دیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مروان کے سبّ وشتم کی حقیقت بس اتنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارتے تھے' مروان زیادہ سے زیادہ اسے اسکے حقیقی معنی میں استعمال کرتا ہوگا۔ اسکے جواب میں ملک صاحب لکھتے ہیں :

"امام بخاریؒ نے حدیث کا صرف وہ حصہ روایت کیا ہے۔ جس سے حضرت علیؓ کی منقبت ثابت ہوتی ہے۔"

غالباً ملک صاحب کا منشاء یہ ہے کہ یہاں مروان کی کچھ اور گالیاں بھی مذکور ہوں گی جنہیں امام بخاریؒ چھوڑ گئے۔ میری گذارش یہ ہے کہ روایت کا جو حصہ امام بخاریؒ چھوڑ گئے ہیں' اگر جناب غلام علی صاحب کسی معتبر روایت سے وہ حصہ نقل کرکے دکھادیتے' اور اس میں واقعتاً حضرت علیؓ کو گالیاں دی گئی ہوتیں' تب تو ان کا یہ کہنا بجا ہو سکتا تھا' لیکن وہ باقی ماندہ حصہ پیش بھی نہیں کرتے تو محض ان کے قیاس بلکہ واہمہ کی بنیاد پر یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ اس روایت کا کچھ حصہ امام بخاریؒ چھوڑ گئے ہیں' اس طرح تو ہر باطل سے باطل مسلک کی دلیل یہ لائی جا سکتی ہے کہ بخاری کی فلاں حدیث امام بخاریؒ نے مختصر نقل کی ہے' اس کا باقی ماندہ حصہ سے فلاں بات ثابت ہوتی ہے۔ ملک صاحب علمی و تحقیقی مباحث میں کم از کم ایسی باتوں سے تو پرہیز فرمائیں۔ آگے تحریر فرماتے ہیں :

عثمانی صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ مروان ابو تراب سے بس "مٹی کا باپ" مراد لیتا تھا' عربی میں "ابو" کا لفظ بطور مضاف صرف باپ کے معنی میں نہیں آتا' "والے" کے معنی میں بھی آتا ہے... مروان طنزاً اس لفظ کو خاک آلود کے معنی میں استعمال کرتا تھا۔"

میری گذارش یہ ہے کہ "ابو تراب" کا لفظی ترجمہ "آپ" مٹی کا باپ" کر لیجئے یا "مٹی والا" بہرحال یہ پیار بھرا لقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو دیا تھا' کوئی شخص کسی بُری نیت سے یہ لفظ حضرت علیؓ کے لئے استعمال کرے تو یہ اس کی احمقانہ تعریض

ہے، نیت کے لحاظ سے اس کا یہ فعل لائق ملامت ضرور ہے لیکن اس لفظ کو انصاف کے کسی بھی قاعدے سے "سبّ و شتم کی بوچھاڑ" یا "گالی" نہیں کہا جا سکتا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت علیؓ کے ایک فوجی افسر حضرت جاریہ بن قدامہؓ نے ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ کو "ابو سنور" (بلی والا یا بلی کا باپ) کے نام سے یاد کیا تھا، اگر لفظ "ابو تراب" کو سبّ و شتم کی بوچھاڑ کہا جا سکتا ہے تو معلوم نہیں جناب غلام علی صاحب "ابو سنور" کو کیا فرمائیں گے؟

یہ تو وہ دو روایتیں تھیں جن کا حوالہ مولانا مودودی صاحب نے دیا ہے[1] ملک غلام علی صاحب نے اپنے مقالے میں تین روایتیں اور پیش کی ہیں، پہلے مسند احمد سے حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت پیش کی ہے کہ انہوں نے بعض اصحاب سے فرمایا "کیا تمہارے یہاں منبروں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سبّ ہوتا ہے؟" لوگوں نے پوچھا "وہ کیسے؟" حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا "الیس یسب علی و من احبہ؟" (کیا علیؓ اور ان سے محبت کرنے والوں پر سبّ نہیں ہوتا؟)

دوسرے ابو داؤدؒ اور مسند احمدؒ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے سامنے کسی شخص نے حضرت علیؓ پر لگاتار "سبّ" شروع کیا تو حضرت سعید بن زیدؓ نے حضرت مغیرہؓ کو تنبیہہ فرمائی کہ تمہارے سامنے یہ "سبّ" ہو رہا ہے اور تم اس پر کوئی نکیر نہیں کرتے؟"

تیسرے ابن جریر طبریؒ کی ایک روایت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کرتے وقت منجملہ اور شرائط کے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ "ان کے سنتے ہوئے حضرت علیؓ پر سبّ نہ کیا جائے۔"

---

[1] یہاں پرانے ایڈیشن میں ایک حاشیہ تھا جس سے رجوع کا اعلان "البلاغ" جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ میں کر دیا گیا تھا، مگر وہ کچھ عرصہ چھپتا رہا، اب اسے یہاں سے نکال دیا گیا ہے۔ محمد تقی عثمانی ۷/۲/۱۴۲۲ھ

یہ ہیں وہ تین روایتیں جن کی بنیاد پر انہوں نے سبِّ علیؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ بات جس طرح تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت اور تواتر کا درجہ دے رہی ہے۔"

مذکورہ بالا روایات کا تحقیقی جواب دینے سے قبل میں یہاں کچھ اور روایات پیش کرتا ہوں، ملک صاحب براہ کرم ان کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

(الف) ابن حبیبؒ (متوفی ۲۴۵ھ) مشہور مورخ ہیں وہ نقل کرتے ہیں :

فلما قدم الكوفة علی رضی الله عنه جعل اصحابه يتناولون عثمانؓ فقال بنوالارقم لا نقيم ببلد يشتم فيه عثمانؓ فخرجوا الی الجزيرة فنزلوا الرها، وشهدوا مع معاوية الصفين [1]

جب حضرت علیؓ کوفہ میں آئے تو ان کے ساتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بدگوئی کرنے لگے، بنو الارقم نے کہا کہ ہم اس شہر میں نہیں رہ سکتے۔ جس میں حضرت عثمانؓ پر سبّ و شتم کیا جاتا ہو، چنانچہ وہ جزیرہ کی طرف چلے گئے، اور رہا کے مقام پر مقیم ہوئے اور حضرت معاویہؓ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے۔ [2]

(ب) ابن جریر طبریؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے بھیجے ہوئے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا

معاوية الذی لم يجعل الله عزوجل له سابقة فی الدين ولا سلف صدق فی الاسلام طليق بن طليق حزب من هذه الاحزاب لم يزل لله عزوجل ولرسوله صلی الله عليه وسلم وللمسلمين عدوا هو وابوه حتی دخلا فی الاسلام کارهين

"معاویہ وہ ہیں جن کے لئے اللہ نے نہ دین میں کوئی فضیلت رکھی ہے، نہ اسلام میں ان کا کوئی اچھا کارنامہ ہے، خود بھی طلیق ہیں، اور ان کے باپ بھی طلیق، ان احزاب میں سے ہیں (جو مدینہ پر چڑھ کر آئے تھے) اللہ اور

---

[1] ابن حبیبؒ المحبرؔ ص ۲۹۵ دائرۃ المعارف ۱۳۶۱ھ

[2] ابن حبیبؒ المحبرؔ، ص ۲۹۵ دائرۃ المعارف ۱۳۶۱ھ

اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ دشمن رہے' وہ بھی' اور ان کے باپ بھی یہاں تک کہ اسلام میں بادل ناخواستہ داخل ہوئے۔

اسی روایت میں آگے ہے کہ وفد کے لوگوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ "کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مظلوماً قتل ہوئے۔" تو آپ نے فرمایا کہ "لا اقول انہ قتل مظلوماً ولا انہ قتل ظالماً" (نہ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم بن کر قتل ہوئے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ مظلوم بن کر قتل ہوئے)۔ اس پر وفد یہ کہہ کر چلا آیا کہ "جو حضرت عثمانؓ کے قتل کو مظلوماً نہیں سمجھتا' ہم اس سے بری ہیں۔" [1]

(ج) ابن جریرؒ ہی نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے صفین میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"فان معاویة و عمر و بن العاص وابن ابی معیط و حبیب بن مسلمة و ابن ابی سرح والضحاک بن قیس لیسوا با صحاب دین ولا قرآن انا اعرف بهم منکم قد صحبتهم اطفالا و صحبتهم رجالا فکانوا اشر اطفال و شر رجال" [2]

"معاویہ' عمرو بن عاص' ابن معیط' حبیب بن مسلمہ' ابن سرح اور ضحاک بن قیس دین اور قرآن سے تعلق رکھنے والے نہیں ہیں' میں انہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں' میں ان کے ساتھ اس وقت بھی رہا ہوں' جب یہ بچے تھے اور اس وقت بھی رہا ہوں جب یہ مرد تھے' یہ بچے تھے تو بد ترین بچے اور مرد تھے تو بد ترین مرد۔"

(د) حجر بن عدیؒ حضرت علیؓ کے معروف ساتھیوں میں سے تھے' ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :

"انهم کانوا ینالون من عثمانؓ ویطلقون فیه مقالة الجور و ینتقدون علی الامراء الخ"

یہ لوگ حضرت عثمان کی بدگوئی کرتے اور انکے بارے میں ظالمانہ

---

[1] الطبری' ص ۴و۵ ج ۴   [2] ایضاً ص ۲۴ ج ۴

باتیں کہتے تھے۔[1]"

(ہ) بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے عین صلح کی گفتگو کے دوران بھی حضرت معاویہؓ کیلئے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کئے اور انکے ایمان تک کو مشکوک بتایا' البدایہ والنہایہ ص ۲۵۸ ج ۷ میں مؤرخین کے یہ اقوال نقل کے لئے حافظ ابن کثیر نے انکی تردید کی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے' ہم تو ان جیسی بیشتر روایتوں کو ان کی سند کے ضعف اور راویوں کے ناقابل اعتماد ہونے کی بناء پر صحیح نہیں سمجھتے اور ان میں سے بعض کو قطعی جھوٹ اور افترا سمجھتے ہیں' لیکن مولانا مودودی صاحب اور ملک غلام علی صاحب جو تاریخی روایات کو بے چون و چرا مان لینے کے قائل ہیں' براہ کرم "اسماء الرجال کے دفتر" کھولے بغیر یہ بتائیں کہ اگر ان روایات کی بناء پر کوئی شخص یہ عبارت لکھے کہ:

> "ایک مکروہ بدعت حضرت علیؓ کے زمانے میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے ساتھی خطبوں میں بر سرِ منبر حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے' اور ان کے محبت رکھنے والے دوست اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔"

اور پھر کوئی شخص مذکورہ چار روایات کو نقل کر کے اس جملے کی تائید میں یہ لکھ دے کہ یہ بات جس طرح تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت اور تواتر کا درجہ دے رہی ہے۔" تو مولانا مودودی صاحب اور محترم ملک غلام علی صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہو گا؟ کیا وہ ان واقعات کو "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" قرار دے کر ملوکیت کا آغاز معاذ اللہ حضرت علیؓ سے کر سکیں گے؟

ملک صاحب سے اس تمہیدی سوال کے بعد میں اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں' حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان نقطۂ نظر کا شدید اختلاف تھا جو بالآخر باہمی جنگ پر منتج ہوا۔ لیکن ان کا یہ باہمی اختلاف کبھی شرافت کی حدود سے متجاوز نہیں ہوا' جو روایتیں اس کے بظاہر خلاف نظر آتی ہیں' خواہ ان میں حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ پر سبّ و شتم کرنا مذکور ہو یا حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کا

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۵۴ ج ۸

حضرت علیؓ پر' ان میں سے اکثر تو فتنہ پرداز قسم کے سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں' اور جو دو ایک روایتیں صحیح سند کے ساتھ آئی ہیں' ان میں لفظ سبّ سے مراد بلاشبہ ایک دوسرے کے موقف کو غلط قرار دینے اور اس سے اپنی براءت کا اظہار ہے۔

جن روایتوں سے خود حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ پر سبّ کرنا یا اس کا حکم دینا معلوم ہوتا ہے' ان کی حقیقت تو ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں' رہیں یہ تین روایتیں تو ان سے خود حضرت معاویہؓ کا سبّ کرنا تو ظاہر ہے کہ ثابت نہیں ہوتا۔ ان کے بعض ساتھیوں کا سبّ کرنا معلوم ہوتا ہے' لیکن جس ماحول میں "ابو تراب" کہنے کو بھی "سبّ" سے تعبیر کر دیا جاتا ہو' وہاں ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس سے مراد "گالی دینا" نہیں' بلکہ تغلیط و تعریض ہے یہ ممکن ہے کہ تغلیط و تعریض میں بعض لوگ کسی وقت حدود سے کسی قدر متجاوز بھی ہو گئے ہوں' لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت معاویہؓ خود اور انکے حکم سے ان کے تمام گورنر جمعہ کے خطبوں میں حضرت علی پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔

حیرت ہے کہ مولانا مودودی اور غلام علی صاحب ایک طرف تو صرف لفظ "ابو تراب" کو "سبّ و شتم کی بوچھاڑ" کہنے پر مصر ہیں' دوسری طرف وہ خود حضرت معاویہؓ کو بغاوت کا مجرم قرار دیتے ہیں' ان کی طرف انسانی شرافت کے یکسر خلاف حرکات منسوب کرتے ہیں' انہیں مال غنیمت میں خیانت کا مرتکب بتاتے ہیں' انہیں ظالم و جابر ثابت کرتے ہیں' ان کے باوجود یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ پر "سبّ و شتم کی بوچھاڑ" کی ہے۔ ملک صاحب نے اپنے مضمون میں ماضی قریب کے بعض مصنفین کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں کہ انہوں نے وہی باتیں لکھی ہیں جو مولانا مودودی صاحب نے لکھی ہیں۔ لیکن اول تو ان کے اور مولانا مودودی صاحب کے انداز بیان میں عموماً خاصا فرق ہے' دوسرے ظاہر ہے کہ یہ بات کسی غلطی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی کہ وہ ماضی قریب کے بعض دوسرے مصنفین سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ اس لئے اس پر گفتگو لاحاصل ہے۔[1]

---

[1] اس ضمن میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی زبانی حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کا جو واقعہ ملک صاحب نے حکایات الاولیاء سے نقل کیا ہے' اس میں حضرت شاہ شہیدؒ نے شیعہ حضرات کو الزامی جواب دیا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت شاہ شہید کا نظریہ یہی تھا۔

استلحاق زیاد

اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب کی زیر بحث عبارت یہ ہے :

"زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جس میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابو سفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا اور اس سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابو سفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد انہی کے نطفہ سے ہے۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں ان کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی اور مدد گار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہیں کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح اور ناجائز فعل تھا کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ "بچہ" اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں۔" ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے پردہ فرمایا۔"

میں نے ابن خلدون وغیرہ کے حوالے سے یہ ثابت کیا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں سمیہ کے ساتھ حضرت ابو سفیان کے جس تعلق کو مولانا مودودی صاحب نے زنا کا عنوان دیا ہے وہ در حقیقت جاہلی نوعیت کا ایک نکاح تھا' اور اس نوعیت کا نکاح اگرچہ اسلام کے بعد منسوخ ہو گیا' لیکن اس قسم کے نکاح سے جو اولاد جاہلیت میں پیدا ہوئی اسے ثابت النسب کہا گیا'

وہ اولاد حرام نہیں ہوئی۔ زیاد کا معاملہ بھی یہی تھا کہ حضرت ابو سفیانؓ نے اسلام سے پہلے خفیہ طور پر یہ اقرار کر لیا تھا کہ زیاد انہی کا بیٹا ہے' اس لئے اس کا نسب ثابت ہو چکا تھا' حضرت معاویہؓ نے دس گواہوں کے گواہی دینے پر (جن میں بیعت رضوان کے شریک صحابہؓ بھی شامل تھے) اس واقعہ کا صرف اعلان کیا' اور زیاد کو اپنا سوتیلا بھائی تسلیم کر لیا۔

جناب ملک غلام علی صاحب نے اس تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "ظاہر ہے کہ نسب و انتساب کی یہ صورتیں جو جاہلیت میں رائج تھیں وہ اس وقت تک متحقق اور مسلّم شمار نہیں ہو سکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلان عام نہ ہو جائے اور مرد صُلبی اولاد کی طرح بچے کو اپنے کنبے میں داخل نہ کر لے۔"

ملک صاحب نے اپنے مضمون میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ اگر زیاد زنا کے بجائے جاہلی نکاح سے پیدا ہوا تھا تو انتساب کا اعلان عام ضروری تھا' اور خفیہ طور پر استلحاق کا اقرار ثبوت نسب کے لئے کافی نہیں تھا لیکن اول تو غلام علی صاحب نے اس بات کی کوئی دلیل نہیں دی کہ جاہلیت کے اس انتساب میں اعلان عام ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا تھا' جاہلیت کے نکاحوں کی جو تفصیل حضرت عائشہ صدیقہؓ سے صحیح بخاری میں مروی ہے' اس میں اس شرط کا کوئی بھی ذکر نہیں ہے' بلکہ جاہلی نکاح کے جو اور طریقے اسلام سے پہلے رائج تھے' ان پر نظر کی جائے تو صراحۃً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے انتساب کے لئے اعلان عام ہرگز ضروری نہیں تھا' بلکہ اگر معاملہ بالکل خفیہ رہے تب بھی انتساب ہو جاتا تھا' علامہ داؤدیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> بقی علیھا انحاء لم تذکرھا' الاول نکاح الخدن وھو فی قولہ تعالٰی ولا متخذات اخدان کانوا یقولون ما استتر فلا باس بہ وما ظھر فھو لوم [1]

جاہلی نکاح کی کچھ قسمیں ایسی بھی ہیں جو حضرت عائشہؓ نے بیان نہیں فرمائیں' ان میں سے پہلی قسم خفیہ آشنائی کا نکاح ہے' اور اس کا ذکر قرآن

[1] دیکھئے فتح الباری ص ۱۵۰ ج ۹ و عمدۃ القاری ص ۱۲۳ ج ۲۰

کریم کے ارشاد ولا متخذات اخدان میں موجود ہے' جاہلیت کے لوگ کہا
کرتے تھے کہ ایسا تعلق اگر خفیہ طور پر ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں' اور
علی الاعلان ہو تو وہ قابل ملامت بات ہے۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ جاہلی نکاح میں خفیہ تعلق یا خفیہ انتساب قابل ملامت نہیں تھا' لہٰذا ملک غلام علی صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ "نسب و انتساب کی یہ صورتیں اس وقت تک مسلّم نہیں ہو سکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلان عام نہ ہو جائے۔"

پھر اگر خفیہ استلحاق جاہلیت میں قابل قبول نہیں تھا تب بھی حضرت ابو سفیانؓ نے کم از کم دس آدمیوں کی موجودگی میں نسب کا اقرار کیا تھا۔ مؤرخ مدائنی نے ان دس گواہوں کے نام شمار کرائے ہیں۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے انہیں نقل کیا ہے۔[1] اس لئے قانونی طور پر اس اقرار کو خفیہ نہیں کہا جا سکتا' ابن خلدون نے اس کے لئے "خفیۃً" کا جو لفظ استعمال کیا ہے' اس کا مطلب اس سے زائد نہیں کہ عام لوگوں میں یہ اقرار مشہور و معروف نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ زیاد کا استلحاق اگر ایسا ہی بے بنیاد اور شریعت کے مسلّمہ قاعدوں کی صریح خلاف ورزی پر مبنی ہوتا جیسا کہ مولانا مودودی صاحب یا بعض دوسرے حضرات نے سمجھا ہے تو پھر ساتھ ہی یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ امت اسلامیہ اپنے خیر القرون میں حق کے محافظوں سے یکسر خالی ہو گئی تھی' ورنہ کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ اتنی بڑی دھاندلی کا ارتکاب ایک ایسے دور میں کیا جائے جس میں چپہ چپہ پر نزول وحی کا مشاہدہ کرنے والے صحابہ موجود ہوں' بیعت رضوان کے شریک صحابہؓ خود اس صریح دھاندلی کے حق میں گواہی دیں' اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اس دھاندلی کے حق میں خود مہر تصدیق ثبت کریں؟

ملک غلام علی صاحب نے لکھا ہے:

"ام المومنین نے سوچا ہو گا کہ بے چاروں کی حاجت روائی ہو۔ اس لئے
ابن ابی سفیان لکھ دیا۔"

---

[1] دیکھئے الاصابہ ص ۵۶۳ ج ۱۱ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ زیاد بن ابیہ

تصور تو فرمائیے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ مطلب یہ ہے کہ ام المومنینؓ نے محض چند "بیچاروں کی حاجت روائی" کی خاطر قرآن و سنت سے اس صریح بغاوت کو گوارا کر لیا۔ خدارا غور فرمائیں کہ کیا معاذ اللہ ایک ولد الزنا کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا برادر نسبتی قرار دینے کی بے غیرتی ان سے کسی بھی قیمت پر سرزد ہو سکتی تھی؟ حیرت ہے کہ جناب ملک غلام علی صاحب کو یہ گوارا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایسا گمان کیا جائے، لیکن مولانا مودودی صاحب کی غلطی تسلیم کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ثابت کیا تھا کہ جن معترضین نے اس وقت استلحاق زیاد پر نکتہ چینی کی تھی ان کی وجہ اعتراض بالکل دوسری تھی، ان کا کہنا یہ تھا کہ ابو سفیانؓ کبھی سمیہ کے قریب تک نہیں گئے، لیکن جب معاملہ دس گواہوں سے ثابت ہو گیا تو انہوں نے اپنے اعتراض سے رجوع کر لیا اور اپنے رویہ پر ندامت کا اظہار کر کے حضرت معاویہؓ سے معافی بھی مانگی۔ ملک صاحب اسکے جواب میں صرف اتنا لکھتے ہیں:

> اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فیصلہ خواہ صحیح تھا یا غلط بہر حال اسے مملکت میں نافذ کر دیا گیا جیسا کہ دیت اور توریث کے فیصلے نافذ کئے گئے تھے۔"

سوال یہ ہے کہ اگر یہ فیصلہ غلط طور پر نافذ کیا گیا تھا تو معترضین نے اپنے سابقہ رویہ پر شرمندگی کا اظہار کیوں کیا؟ حاکم کے کسی فیصلے کو زبردستی نافذ کرا دینا اور بات ہوتی ہے اور اسے صحیح تسلیم کر لینا بالکل دوسری چیز، یہاں معترضین نے صرف یہی نہیں کہ اس فیصلے کے نفاذ میں مزاحمت نہیں کی، بلکہ صراحتاً اقرار کیا کہ ان کا سابقہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی تھا، اور اب وہ اس پر ندامت محسوس کرتے ہیں۔

ملک صاحب کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ بعد میں تاریخ اور انساب کی کتابیں زیاد کو "زیاد بن ابیہ" اور "زیاد بن عبید" ہی لکھتی چلی آئی ہیں۔ علم انساب کے سب سے مشہور عالم اور مورخ علامہ بلاذریؒ دوسری صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی معروف کتاب "انساب الاشراف" میں زیاد کا ترجمہ "زیاد بن ابی سفیان" ہی کے عنوان سے کیا ہے۔

ملک غلام علی صاحب نے اس قضیہ سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت سعدؓ اور حضرت عبد بن زمعہؓ کے درمیان پیش آیا تھا، لیکن یہ استدلال اس لئے درست نہیں کہ اس واقعہ میں باندی کے بچے کے دعویدار دو تھے ایک باندی کے آقا کی طرف سے اس کے بھائی (حضرت عبد بن زمعہؓ) اور دوسرے عتبہ کی طرف سے اس کے بھائی (حضرت سعدؓ)۔ گویا ایک طرف خود صاحب فراش بچے کا مدعی تھا اور دوسری طرف غیر صاحب فراش، اس صورت کا حکم کھلا ہوا تھا کہ بچہ اس کو ملے گا جو فراش کا مالک ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ صاحب فراش کو دیا اور حضرت سعدؓ کا دعویٰ مسترد کر دیا۔

اس کے برخلاف زیاد کے معاملہ میں ابوسفیانؓ کے سوا کسی اور کا اقرار یا دعویٰ نسب ثابت نہیں، اس لئے اس کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے، اگر صورت واقعہ یہ ہوتی کہ ایک طرف عبید (جس کے فراش پر زیاد پیدا ہوا تھا) زیاد کو اپنی طرف منسوب کرنے کا دعویٰ کرتا، اور دوسری طرف ابوسفیانؓ اسے اپنی طرف منسوب کرنا چاہتے تو بلاشبہ یہ معاملہ حضرت سعدؓ کے قضیہ کے مشابہ ہو جاتا، اور اس صورت میں شرعاً زیاد کا نسب عبید سے ثابت ہوتا نہ کہ ابوسفیانؓ سے، لیکن جب خود عبید اس معاملے میں خاموش ہے اور زیاد کے انتساب کا دعویٰ نہیں کرتا تو اب دعویٰ صرف ابوسفیانؓ کا ہے، اور چونکہ یہ دعویٰ اسلام سے قبل ہو چکا تھا، اس لئے وہ قابل قبول ہے، اور اسے حضرت سعد کے دعوے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ملک صاحب نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ بہت منتشر اور غیر مرتب ہے لیکن اس کے بنیادی نکات کا جواب میں نے اوپر دے دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث میں اصل فیصلہ کن باتیں وہیں ہیں جو اوپر آ چکیں، اور اگر یہ نکات ذہن میں رہیں تو ملک صاحب کی علمی بحث کا جواب ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ماضی قریب کے فلاں فلاں مصنفین نے بھی حضرت معاویہؓ کے اس فعل پر اعتراض کیا ہے، تو اصل واقعہ سامنے آنے کے بعد یہ کوئی علمی دلیل نہیں رہتی۔ اصل حقیقت کی دیانتدارانہ تحقیق کے بعد ہمیں اس پر شرح صدر ہے کہ جس جس نے اس معاملہ میں حضرت معاویہؓ کو مطعون کیا ہے، اس نے غلطی کی ہے، خواہ مولانا مودودی ہوں یا مولانا ابوالکلام آزاد یا کوئی اور۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک غلط بات مولانا مودودی صاحب کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی زین العابدین میرٹھی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی لکھ دی ہو تو وہ صحیح کیونکر ہو سکتی ہے۔

غلام علی صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ایک عبارت تحفہ اثنا عشریہ سے نقل کی اور چیلنج کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "مدیر البلاغ مولانا مودودی اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تحریر آمنے سامنے رکھ کر ذرا مجھے بتائیں کہ مولانا مودودی نے وہ کیا خاص بات لکھی ہے اور ان کے بقول اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ سخت اور افسوسناک اور مکروہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔" مولانا مودودی صاحب کی عبارت میں بحث کے شروع میں نقل کر چکا ہوں' قارئین اس کا مقابلہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مندرجہ ذیل جملوں سے کرلیں جو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں لکھے ہیں:

> "اس وقت معاویہؓ نے ابوسفیان کے اسی کلمے سے تمسک کیا جو ان کی زبان سے عمرو بن عاص اور حضرت امیرؓ کے روبرو نکلا تھا اور اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور ۴۴ھ میں زیاد بن ابی سفیان اس کا لقب تحریر کیا۔ تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ اس کو زیاد بن ابی سفیان کہا کریں۔"

یہ درست ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب "حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو درست نہیں سمجھتے' اور اس معاملے میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔ انہوں نے زیاد کے حق میں بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن کیا مذکورہ عبارت میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا ہے جسے حضرت معاویہؓ کے لئے اہانت آمیز کہا جا سکے؟ اس کے بعد مولانا مودودی صاحب کی عبارت پھر پڑھ لیجئے اور دیکھئے کہ اس میں بقول ملک صاحب کے کوئی "خاص بات" ہے یا نہیں؟....

ابن غیلان کا واقعہ

مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے:

> "حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالا تر قرار دیا اور انکی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دوران خطبہ میں اسکو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کروا دیا اور اسکا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رو

سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں"

میں نے اس واقعہ کے اصل ماخذ (البدایہ والنہایہ) کے حوالہ سے ثابت کیا تھا کہ اس واقعہ میں جس شخص کا ہاتھ کاٹا گیا تھا' خود اسکے رشتہ داروں نے ابن غیلان سے یہ تحریر لکھوائی تھی کہ حاکم نے اس کا شبہ میں ہاتھ کاٹا ہے' چنانچہ حضرت معاویہ کے سامنے مقدمہ کی جو صورت خود استغاثہ کرنے والوں نے پیش کی اور جس کا اقرار خود مدعا علیہ حاکم نے بھی تحریری طور پر کیا وہ یہ تھی کہ ابن غیلان نے ایک شخص کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا بلاشبہ حاکم کی سنگین غلطی ہے۔ لیکن اس غلطی کی بناء پر کسی کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں ہے کہ اس حاکم سے قصاص لینے کے لئے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے' بلکہ اس غلطی کی سزا میں اس پر تعزیر بھی جاری کی جاسکتی ہے اور اسے معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ واقعہ میں حضرت معاویہؓ نے اس شخص کی دیت بھی ادا کی اور حاکم کو معزول بھی کر دیا۔

میرے استدلال کے جواب میں ملک غلام علی صاحب نے جو بحث کی ہے' وہ خلط مبحث کا افسوس ناک نمونہ ہے۔ انہوں نے تین چار صفحات میں تو خلفائے راشدین کے عدل و انصاف کے متفرق واقعات ذکر کیے ہیں' ظاہر ہے کہ حضرات خلفائے راشدین کے فیصلوں کے بلند معیار سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ دعویٰ بھی کبھی ہم نے نہیں کیا کہ حضرت معاویہؓ کے فیصلے خلفائے راشدین کے فیصلوں سے بہتر یا حزم و احتیاط اور اصابت رائے میں انکے برابر تھے۔ گفتگو تو یہ ہو رہی ہے کہ انکے فیصلے کو مولانا مودودی صاحب نے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" اور شریعت کے خلاف قرار دیا ہے وہ شرعی قانون کی رو سے غلط کیونکر کہا جاسکتا ہے؟

پھر ملک صاحب نے لکھا ہے کہ چونکہ واقعۃً اس شخص کا ہاتھ شبہ میں نہیں' بلکہ حاکم کو کنکر مارنے پر کاٹا گیا تھا اور "کنکر مارنے پر ہاتھ کاٹ دینا کسی طرح بھی شبہ کی اصطلاح فقہی کی تعریف میں نہیں آسکتا" اس لئے حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ غلط تھا۔

ملک صاحب اگر ذرا ٹھنڈے دل اور انصاف سے غور فرمائیں تو ان پر بھی یہ بات

واضح ہو سکتی ہے کہ مذکورہ واقعہ میں حضرت معاویہؓ کے سامنے کنکر مارنے کا ذکر نہ استغاثہ کرنے والوں نے کیا نہ مدعا علیہ حاکم نے۔ ان کے سامنے تو دادرسی ہی اس بات کی طلب کی گئی کہ ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا گیا ہے۔ جب مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک صورت واقعہ پر متفق ہیں تو حضرت معاویہؓ کو یہ علم غیب آخر کہاں سے حاصل ہو سکتا تھا کہ مظلوم نے خود اصل واقعے کو چھپا کر مدعا علیہ کے جرم کو ہلکا کر دیا ہے۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کو اصل واقعے کی تحقیق کرنی چاہیے تھی۔ لیکن تحقیق اور تفتیش کا سوال وہاں پیش آتا ہے جہاں مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی اختلاف ہو' جہاں مقدمہ کے دونوں فریق کسی بات پر متفق ہو جائیں' وہاں اگر فیصلہ ان کی بیان کردہ متفقہ صورت پر کر دیا جائے تو حاکم کو موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا' فرض کیجئے کہ زید عمر پر یہ دعوی کرتا ہے کہ اس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ حاکم جب عمر سے پوچھتا ہے تو وہ اقبال جرم کر لیتا ہے اگر اس صورت میں حاکم عمر پر قتل کی سزا عائد کر دے تو کیا وہ گناہ گار کہلائے گا؟

جناب غلام علی صاحب نے اس بحث میں دوسری تضاد بیانی یہ کی ہے کہ ایک طرف تو وہ مجھ سے یہ مطالبہ فرماتے ہیں کہ :"میں عثمانی صاحب کا بڑا ممنون ہوں گا اگر وہ البلاغ ہی میں یہ بات واضح فرما دیں کہ یہ عجیب و غریب اصول کتاب و سنت یا کسی فقہی کتاب کے کون سے مقام پر مذکور ہے کہ شبہ کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملتا ہے' اسی طرح حاکم کو بھی ملتا ہے؟ گویا اسطرح وہ فقہی اصول کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف خود ہی تحریر فرماتے ہیں:

"یہ اصول اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ ہر انسان کی طرح ایک حاکم یا قاضی بھی اپنے فیصلے میں غلطی کر سکتا ہے اور وہ جائز تحفظ کا حق دار ہے"

میں حیران ہوں کہ ان دونوں باتوں میں کس طرح تطبیق دوں؟ سوال یہ ہے کہ اگر ایک حاکم غلطی سے کسی کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دے (یعنی سرقہ کی تمام شرائط پوری ہونے میں کوئی کسر رہ گئی ہو' اسکے باوجود وہ قطع ید کی سزا جاری کر دے) تو آپ کے نزدیک سزا میں اس کا ہاتھ کٹے گا یا نہیں؟ ملک صاحب کی پہلی بات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا ہاتھ کٹے گا لیکن اس کی دلیل میں انہوں نے شامی کی جو عبارت پیش کی ہے اس میں کہیں قصاص کا ذکر نہیں۔ اس

میں صرف اتنا لکھا ہے کہ **یعزر القاضی ویعزل عن القضا** (قاضی کو تعزیر کی جائے گی اور اسے عہدہ قضاء سے معزول کردیا جائیگا) اس میں قصاص کا ذکر کہاں ہے؟ اور یہ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت معاویہؓ نے ابن غیلان کو معزول کردیا تھا۔ جس کا ذکر مولانا مودودی نے حذف کردیا ہے۔ اور اگر انکے نزدیک ہاتھ نہیں کٹے گا جیسا کہ ملک صاحب کی دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے تو پھر میرا دعوی بھی تو یہی ہے کہ اس صورت میں حاکم پر قصاص نہیں آئیگا بلکہ اسے تعزیر اور معزولی کی سزا دی جائے گی۔ اس سے میرے استدلال کی تردید کیونکر ہوئی؟

یہ بات انتہائی افسوس ناک ہے کہ ملک غلام علی صاحب نے ردالمحتار (شامی) کی جو عبارت نقل کی ہے اسمیں یہ بات صراحۃً موجود ہے کہ اگر کوئی قاضی یا حاکم شبہ میں سرقہ وغیرہ کی حد جاری کردے تو ضمان بیت المال پر آتا ہے، اور حاکم کو پورا تحفظ ملتا ہے اور اگر عمداً ایسی غلطی ہوئی ہو تو ضمان خود اس پر آتا ہے اس پر تعزیر بھی کی جاتی ہے اور اسے معزول بھی کیا جاتا ہے لیکن قصاص کسی صورت میں نہیں آتا۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ کی پوری عبارت یہ ہے:[1]

> واما الخطا فی حقه تعالی بان قضی بحد زنا او سرقة او شرب واستوفی الحد ثم ظهران الشهود کما مرفالضمان فی بیت المال وان کان القضاء بالجور عن عمد واقربه فالضمان فی ماله فی الوجوه کلها بالجناية والاتلاف ویعزر القاضی ویعزل عن القضاء

> اور رہا حاکم کا حق اللہ کے معاملہ میں غلطی کرنا مثلاً یہ کہ اسنے حد زنا، حد سرقہ یا شراب نوشی کی حد کا فیصلہ کرکے حد جاری کردی پھر معلوم ہوا کہ گواہ حسب سابق (یعنی نااہل) تھے تو ضمان بیت المال پر آئے گا اور اگر فیصلہ جان بوجھ کر ظلم پر مبنی ہو تو تمام صورتوں میں خواہ وہ بدنی نقصان رسانی کی ہوں یا مالی اتلاف کی ضمان خود قاضی کے مال پر آئے گا اور قاضی کو تعزیر بھی کی جائے گی اور اسے قضاء کے عہدہ سے معزول بھی کیا جائیگا۔"

---

[1] الشامیؒ: ردالمحتار، ص ۵۳۰ ج ۴ بولاق مصر "مطلب فی مالو قضی القاضی بالجور"

اس عبارت میں جو پہلی صورت (گواہوں کے نااہل ہونے کی) بیان کی گئی ہے وہ بعینہٖ حضرت معاویہؓ والے مقدمے کی ہے' اس لئے کہ انکے سامنے مقدمہ قضا بالشبہ کا پیش ہوا تھا' اس بارے میں علامہ شامیؒ نے صاف لکھا ہے کہ ضمان (دیت) بھی بیت المال پر ہوگا' حاکم پر نہیں۔ بلکہ اس عبارت سے تو صاف یہ معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ کو معلوم بھی ہو جاتا کہ قضاء قاضی بالجور ہوئی ہے تب بھی اس پر قصاص نہ آتا بلکہ ضمان' تعزیر اور معزولی کی سزائیں دی جاتیں۔ اب یہ انتہا درجے کی دلاوری ہی کی بات ہے کہ ملک صاحب شامی کی اس عبارت کو جو صراحتًہ انکے موقف کی تردید کر رہی ہے اپنی تائید میں پیش کر کے مجھ سے دلیل کا مطالبہ بھی فرماتے ہیں۔ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ!

گورنروں کی زیادتیاں

اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے کچھ اور گورنروں کی زیادتیوں کے واقعات درج کئے تھے اور انکا ذمہ دار حضرت معاویہؓ کو ٹھہرایا تھا ان میں سے پہلا واقعہ زیاد کا تھا کہ اسنے بعض لوگوں کے ہاتھ صرف اس جرم پر کاٹ دیئے کہ انہوں نے اسپر خطبہ کے دوران سنگ باری کی تھی' اس روایت میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اسکے ایک راوی علی ہیں جن سے عمر بن شبہ نے یہ روایت نقل کی ہے اگر یہاں علی سے مراد علی بن عاصم ہیں تو انکی روایات ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک قابل استدلال نہیں ہیں[1] اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ روایات کے معاملے میں بکثرت غلطیاں کرتے ہیں، حافظے میں کمزور ہیں' اور انہیں وہم بہت ہو جاتا ہے اور غلطی کا اعتراف کبھی نہیں کرتے' پھر بعض حضرات کا کہنا تو یہ ہے کہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے اور بعض حضرات نے ان پر کذب کا الزام بھی لگایا ہے۔ یزید بن ہارون فرماتے ہیں: مازلنا نعرفہ بالکذب (ہمیں مسلسل انکے جھوٹ کی اطلاعات ملتی رہی ہیں) انہوں نے کئی روایات خالد الحذاء سے نقل کی ہیں' جب حضرت خالد سے تصدیق کی گئی تو انہوں نے سب کا انکار کیا۔[2]

---

[1] عمر بن شبہ کے اساتذہ میں "علی" نام کے دو استادوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک علی بن عاصم ہیں (تہذیب ص ۳۴۰ ج ۷) اور دوسرے علی بن محمد جن سے طبریؒ میں کئی روایتیں مروی ہیں۔

[2] ابو حاتم الرازیؒ: الجرح والتعدیل ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ج ۳ و تہذیب التہذیب ص ۳۴۴ تا ۳۴۸ ج ۷

اور اگر اس سے مراد علی بن محمد ہیں جیسا کہ تاریخ طبری ہی کے بہت سے مقامات پر عمر بن شبہ، علی بن محمد سے روایت کرتے ہیں تو عمر بن شبہ کے ہم عصروں میں بھی اس نام کے دو صاحبان گزرے ہیں۔ ایک علی بن محمد مدائنی یہ بھی متکلم فیہ ہیں[1]۔ اور دوسرے علی بن محمد موصلی۔ انہیں خود ان کے شاگرد حافظ ابو نعیم نے کذاب قرار دیا ہے[2]۔ پھر ان کے استاد مسلمہ بن محارب ہیں، جتنی اسماء الرجال کی کتابیں ہمارے پاس ہیں ان میں کہیں انکا تذکرہ نہیں مل سکا۔

اس وجہ سے یہ روایت ناقابل اعتماد ہے لیکن علی سبیل الفرض میں نے یہ لکھا تھا کہ اگر اس روایت کو درست بھی مان لیا جائے تو کسی تاریخ میں یہ موجود نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اسکی اطلاع ہوئی اور انہوں نے اس پر زیاد کو کوئی تنبیہہ نہیں کی۔ ملک صاحب نے اس احتمال کو رد کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس واقعہ کا علم نہیں ہوا، میرے نزدیک بھی اسمیں شک نہیں کہ یہ محض احتمال ہی ہے، اسے نہ قطعیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور نہ قوی احتمال قرار دیا جاسکتا ہے اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتماد ہے۔

دوسرا واقعہ بسر بن ابی ارطاةؓ کا تھا کہ انہوں نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباس کے دو بچوں کو قتل کردیا، اور ہمدان میں بعض مسلمان عورتوں کو کنیز بنالیا۔

جہاں تک بچوں کے قتل کا تعلق ہے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت کا نہیں بلکہ مشاجرات کے زمانہ کا قصہ ہے جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے لشکر باہم برسرپیکار تھے۔ اور اول تو ان جنگوں کے بیان میں راویوں نے رنگ آمیزیاں بہت کی ہیں، حافظ ابن کثیر بھی اس قصے کو نقل کر کے لکھتے ہیں وفی صحته عندی نظر اس قصے کی صحت پر مجھے اعتراض ہے (البدایہ ۳۲۲ ج ۷) دوسرے یہ شدید افراتفری کا دور تھا جس میں گورنر اور فوج کے سالار مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہے ہیں۔ ان حالات میں ان پر ہمہ وقت پورا قابو رکھنا بہت مشکل تھا، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ ہدایت کی ہوئی تھی کہ وہ قتال کے وقت حد ضرورت سے آگے نہ بڑھیں خود انہی بسرؓ کا مقولہ میں نے نقل کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں ہر بالغ شخص

---

[1] العسقلانیؒ لسان المیزان ص ۲۵۳ ج ۴ دائرۃ المعارف دکن ۱۳۳۰ھ

[2] الذھبیؒ: میزان الاعتدال ص ۲۳۷ ج ۲ مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۵ھ

کے قتل سے بھی منع کیا تھا چہ جائیکہ چھوٹے بچوں کو بھی قتل کریں۔ اب اگر گورنر اور سپہ سالار اس عہد پر قائم نہیں رہے تو یہ انکی غلطی ہے' اور جس زمانے میں کئی کئی محاذوں پر لڑائی ہو رہی ہو' اس وقت عہدوں میں اکھاڑ پچھاڑ آسان نہیں ہوتی' اسی بناء پر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا گروہ جو ہرگز کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا اس دور میں حضرت علیؓ کے ساتھ لگا رہا اور ان میں سے بعض لوگ اونچے منصبوں پر فائز رہے' اس لئے کہ انہیں اس نازک وقت میں اکھاڑنا نئے نئے فتنوں کا سبب بنتا جنکی روک تھام حضرت علیؓ کے لئے سخت مشکل تھی' اسی قسم کی مجبوریاں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی تھیں جن کی بناء پر وہ گورنروں اور سپہ سالاروں پر کماحقہ نظر نہ رکھ سکے' لیکن جب یہ افراتفری کا وقت گذر گیا تو انہوں نے بسر ابن ابی ارطاۃ کو معزول بھی کردیا۔ ملک غلام علی صاحب نہ جانے کیوں معزولی کو تسلیم نہیں فرماتے' حالانکہ میں نے تاریخ ابن خلدونؒ کا حوالہ بقید صفحات دیا تھا۔ جو صاحب چاہیں تاریخ مذکور ص ۸' ۹ جلد ۳ مطبوعہ بیروت "بعث معاویۃ العمال الی الامصار" کا مطالعہ فرمالیں۔

رہا مسلمان عورتوں کو کنیز بنانے کا قصہ' سو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قصہ الاستیعاب کے سوا کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا' اور استیعاب میں جو سند ذکر کی گئی ہے وہ بھی ضعیف ہے' کیونکہ اس کے راوی موسیٰ بن عبیدہ ہیں جنکے بارے میں امام احمدؒ کا قول ہے کہ ان سے روایت کرنا حلال نہیں۔ اس کے جواب میں ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں کہ: "مولانا نے ابن عبد البر کا جو قول نقل کیا ہے وہ موسیٰ بن عبیدہ وغیرہ کے حوالے سے نہیں نقل کیا ہے' بلکہ ابو عمرو الشیبانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے' ابن عبیدہ والی روایت بعد میں بطور تائید آئی ہے ابو عمرو الشیبانی ثقہ راوی ہیں۔"

یہاں ملک صاحب نے حافظ ابن عبد البر کے کلام کی بالکل غلط تشریح کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع میں حافظ ابن عبد البر نے ابو عمرو الشیبانی کے حوالہ سے بسر بن ابی ارطاۃ کے مدینہ پر خروج کرنے کا ذکر کیا ہے اور اسکے بعد انکے الفاظ یہ ہیں:

> وفی هذه الخرجة التی ذکر ابو عمرو الشیبانی اغار بسر بن ارطاة علی همدان وسبی نساءهم

بسر بن ارطاۃ کے جس سفر کا یہ ذکر ابو عمرو شیبانی نے کیا ہے اسی سفر میں بسر بن ارطاۃ نے ہمدان پر حملہ کر کے وہاں کی عورتوں کو قید کیا۔[1]

پھر اس کی دلیل میں موسیٰ بن عبیدہ والی سند بیان کی ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عورتوں کو کنیز بنانے کا قصہ ابو عمرؔ شیبانی کی روایت سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ شیبانی کا ذکر محض سفر کے حوالہ کے طور پر آیا ہے کہ جس سفر کا انہوں نے ذکر کیا ہے اسی سفر میں موسیٰ ابن عبیدہ کی روایت کے مطابق عورتوں کو کنیز بنانے کا واقعہ بھی پیش آیا ہے۔ لہٰذا اس قصے کو بیچارے ابو عمرو الشیبانی کے سر منڈھ دینا کسی طرح صحیح نہیں۔!

پھر ملک صاحب فرماتے ہیں: "تاریخی بحث میں ہر قدم پر راوی کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرنا نہ ممکن ہے' نہ آج تک کسی سے ہو سکا ہے" لیکن میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ تاریخی روایات کا مسئلہ کے تحت میں گفتگو کر چکا ہوں کہ جن روایتوں سے صحابہ کرام پر فسق یا ارتکاب کبیرہ کا الزام لگتا ہو ان میں راوی کی "خیریت" ضرور معلوم کی جائے گی' اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ راویوں کو ضعیف مجروحؔ جھوٹا کذّاب اور افتراء پرداز سمجھنے کے باوجود انہی کی بات مان کر صحابہ کرام کو مطعون کرنا گوارا کرلے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر سچ مچ یہ بات درست ہوتی کہ مسلمان عورتوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا گیا تو اس واقعے کی شہرت حد تواتر تک پہنچ جانی چاہیے تھی۔ یہ تاریخ اسلام کے اس عظیم سانحہ کا ایک ہی راوی کیوں ہے؟ اور راوی بھی وہ جس سے بقول امام احمدؒ روایت کرنا حلال نہیں؟ اور پھر تاریخی کتابوں کے اتنے بڑے ذخیرے میں یہ بات صرف الاستیعاب ہی میں کیوں ملتی ہے؟ طبری' ابن کثیر' ابن عساکر' حافظ ابن حجر اور ابن سعد جیسے مؤرخین اس قصے کو کیوں نقل نہیں کرتے؟ ملک صاحب اسکے جواب میں فرماتے ہیں:

"جتنی محنت اور جتنا وقت ان حضرات نے کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کیا ہے اگر میں کرتا تو شاید میں بھی متعدد تائیدی حوالے پیش کر دیتا"[2]

---

[1] الاستیعاب تحت الاصابۃ ص ۱۶۴ ج ۱ المکتبۃ التجاریہ ۱۳۵۸ھ

[2] واضح رہے کہ میں نے اپنا سابقہ مضمون تقریباً ڈیڑھ ماہ میں لکھا تھا جبکہ اس کے ساتھ دوسرے

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

اس کے بعد انہوں نے اسد الغابہ کی ایک عبارت اور نقل کی ہے کہ اس میں بھی یہ قصہ موجود ہے۔ لیکن موصوف جو عبارت تائید کے طور پر لائے ہیں' وہ بلا سند حوالہ ہے' میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر تو استیعاب ہی کی روایت تھی کہ اس کی ایک 'ضعیف سہی' سند تو ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اب تک تلاش بسیار کے باوجود مسلمان عورتوں کو کنیز بنانے کا یہ قصہ کسی صحیح سند کے ساتھ کہیں نہیں مل سکا۔ اور اتنا دل گردہ ہم میں نہیں ہے کہ راویوں کو ضعیف اور مجروح جانتے بوجھتے ہم یہ باور کرلیں کہ حضرت عثمانؓ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ امت جسے خیر القرون کہا گیا ہے' غیرت و حمیّت سے اتنی کوری' خدا کے خوف سے اتنی بے نیاز اور آخرت کے خیال سے اتنی بے فکر ہوگئی تھی کہ اسے مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو کا بھی کوئی پاس باقی نہیں رہا تھا؟

اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے دو واقعات ذکر کئے تھے جن میں لڑائی کے دوران مخالفین کا سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا گیا' ایک حضرت عمار بن یاسرؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا اور دوسرا عمرو بن الحمق کا۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ باغیوں کے احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> واکرہ ان تؤخذ رءوسھم فیطاف بھا فی الافاق لانہ مثلۃ وقد نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المثلۃ ولو بالکلب العقور ولانہ لم یبلغنا ان علیا رضی اللہ عنہ صنع ذلک فی شیئی من حروبہ وھو المتبع فی الباب... وقد جوز ذلک بعض المتاخرین من اصحابنا ان کان فیہ کسر شوکتھم او طمانینۃ قلب اھل العدل استدلالا بحدیث ابن مسعودؓ حین

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

تحریری کام بھی جاری تھے اس کے مقابلے میں ملک غلام علی صاحب کا مضمون تیرہ مہینے جاری رہا اور اس عرصے میں ان کی کوئی اور تحریر سامنے نہیں آئی۔

حمل راس ابی جهل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فلم ینکر علیه [۱]

میں اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ باغیوں کے سر اتار کران کا گشت کرایا جائے کیونکہ یہ مُثلہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلکھنے کتے کا بھی مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے' نیز اس لئے کہ ہمیں کوئی روایت ایسی نہیں پہنچی کہ حضرت علیؓ نے اپنی جنگوں میں ایسا کیا ہو' اور اس باب (باغیوں سے لڑائی) میں وہی قابل اتباع ہیں..... اور ہمارے اصحاب (حنفیہ) میں سے بعض متاخرین نے اس عمل کو جائز قرار دیا ہے' اگر اس سے باغیوں کی شوکت ٹوٹتی ہو یا اہل عدل کو دلی طمانیت حاصل ہوتی ہو' یہ حضرات ابن مسعودؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ابو جہل کا سر اتار کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے تو آپؐ نے ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی تھی۔"

جہاں تک حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں میری گذارش یہ تھی کہ یہ روایت مولانا نے صحیح نقل کی ہے' لیکن اس میں صرف اتنا ذکر ہے کہ حضرت عمارؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا' اس میں نہ تو یہ مذکور ہے کہ یہ عمل حضرت معاویہؓ کے حکم سے ہوا' اور نہ یہ کہ حضرت معاویہؓ نے اس کی ہمت افزائی یا تصدیق و توثیق فرمائی' بلکہ میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح حضرت علیؓ نے حضرت زبیر بن عوامؓ کا سر کاٹ کرلانے والے کو زبانی تنبیہہ فرمائی تھی' اسی طرح حضرت معاویہؓ نے بھی اس پر افسوس کا اظہار کیا ہو گا جسے راوی نے ذکر نہیں کیا۔ ملک غلام علی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر حضرت معاویہؓ نے اس پر اظہار افسوس کیا ہوتا تو روایت میں اس کا ذکر ضرور ہوتا' جیسے ان کی دوسری گفتگو روایت میں نقل کی گئی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے گمان کے لئے روایت میں کوئی دلیل نہیں ہے' اور یہ بات بھی میں نے محض ایک احتمال کے طور پر کہی تھی لیکن کیا اس بات سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے حضرت معاویہؓ نے اس عمل کا حکم

---

[۱] السرخسیؒ: المبسوط ص ۱۳۱ ج ۱۰ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ

نہیں دیا تھا' اور نہ کوئی ایسا کام کیا جسے اس عمل پر پسندیدگی کا اظہار کہا جاسکے۔ ادھر مبسوط سرخسیؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ بات کراہت کی حد تک پہنچتی ہے۔ اس مکروہ عمل کا ارتکاب حضرت معاویہؓ کے حکم یا ایماء کے بغیر کچھ لوگوں نے کرلیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ کا تنبیہ کرنا روایات سے ثابت نہیں ہے' لیکن ظاہر ہے کہ اس پر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی کہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں قانون کی بالاتری کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ ان کی سیاست دین کے تابع نہیں رہی تھی۔ اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔

دوسرا واقعہ عمرو بن الحمق کا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے ان کے سر کا گشت کرایا' میں نے گذارش کی تھی کہ گشت کرانے کا قصہ مولانا کے دیئے ہوئے چار حوالوں میں سے صرف البدایہ والنہایہ میں ہے' تہذیب التہذیب میں گشت کرانے کا قصہ نہیں' مگر موصل سے حضرت معاویہؓ کے پاس جانے کا قصہ موجود ہے۔ اس کے برخلاف طبریؒ کی روایت میں نہ سر کاٹنے کا ذکر ہے نہ اسے لیجانے کا بیان ہے اور نہ گشت کرانے کا قصہ ہے' بلکہ حضرت معاویہؓ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ "ہم عمرو بن الحمق پر زیادتی نہیں کرنا چاہتے' انہوں نے حضرت عثمانؓ پر نیزے کے نو وار کئے تھے'[1] تم بھی ان پر نیزے کے نو وار کرو" اس میں یہ الفاظ کہ "ہم ان پر زیادتی نہیں کرنا چاہتے" واضح طور سے حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہر زیادتی کی تردید کر رہے ہیں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ طبریؒ کی یہ روایت دوسری روایتوں کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہے' کیونکہ وہ حضرت معاویہؓ کے بردبارانہ مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے' اس کے برعکس البدایہ والنہایہ کی روایت سند و حوالہ کے بغیر بھی ہے اور حضرت معاویہؓ کے مزاج سے بعید بھی۔ مولانا مودودی صاحب حضرت علیؓ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں ترجیح نہ دیں جو ان کے مجموعی طرزِ عمل سے

---

[1] الطبریؒ: تاریخ الامم والملوک ص ۱۹۷ ج ۴ مطبعۃ الاستقامہ' قاہرہ ۱۳۵۸ھ

مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں۔" (خلافت و ملوکیت ص ۳۴۸)

میں نے پوچھا تھا کہ اس اصول کا اطلاق حضرت معاویہؓ پر کیوں نہیں ہوتا؟ اس کے جواب میں جناب غلام علی صاحب لکھتے ہیں: "فرض کیا کہ امیر معاویہؓ نے اسے گشت نہ کرایا ہو لیکن اتنی بات تو البدایہ اور تہذیب دونوں میں منقول ہے کہ یہ سر موصل سے بصرہ و کوفہ اور وہاں سے دمشق امیر معاویہؓ تک پہنچا۔"

میری گذارش یہ ہے طبریؒ کی روایت حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہر زیادتی کی تردید کر رہی ہے اور اس میں سر کاٹ کر بھیجنے کا بھی ذکر نہیں ہے۔ تاہم اگر بالفرض موصل کے عامل نے یہ سر بھیجا بھی ہو تو حضرت معاویہؓ اس سے بری ہیں' کیونکہ انہوں نے ہر قسم کی زیادتی سے صراحۃً منع فرمادیا تھا۔

حجر بن عدیؒ کا قتل

حضرت معاویہؓ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت حجر بن عدیؒ کو ناجائز طور پر قتل کیا' مولانا مودودی صاحب نے بھی اس الزام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں حضرت حجر بن عدیؒ کے قتل کا پورا واقعہ تاریخ طبری وغیرہ سے نقل کر کے بیان کردیا تھا' جس کی رو سے مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کی تردید ہوجاتی ہے کہ حجر بن عدیؒ کو محض ان کی حق گوئی کی سزا میں قتل کیا گیا۔ میں نے حوالوں کے ساتھ ثابت کیا تھا کہ حضرت حجر بن عدیؒ نے سبائی فتنہ پردازوں کے اکسانے پر حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف ایک بھاری جمعیت تیار کی تھی جو مختلف اوقات میں ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے بناتی رہی' اس نے کھلم کھلا حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر لعن طعن کو اپنا وظیرہ بنالیا اور بالآخر حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف برسرپیکار ہوگئی۔ حضرت مغیرہؓ اور زیاد بن ابی سفیان نے نرمی اور گرمی کا ہر طریقہ آزمالیا' مگر یہ لوگ اپنی شورش سے باز نہ آئے' آخر کار کوفہ کے ستّر شرفاء نے جن میں اونچے درجے کے صحابہؓ و تابعین بھی شامل تھے' ان کے خلاف مندرجہ بالا امور کی شہادت دی' اس شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ نے حجر بن عدیؒ کے قتل کا فیصلہ کیا۔

جناب ملک غلام علی صاحب نے اس مسئلے میں میرے مضمون کے جواب میں جو طویل بحث کی ہے وہ تقریباً اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے' اس لمبی چوڑی بحث میں سے اگر مناظرانہ عبارت آرائی' طعن و تشنیع' غیر متعلق باتوں' سیاسی جذبات انگیزیوں کو خارج کردیا جائے تو تین نکتے ایسے ملتے ہیں جو فی الواقعہ علمی نوعیت کے بھی ہیں اور زیر بحث مسئلہ سے متعلق بھی۔ اس لئے وہ جواب کے مستحق ہیں' یہاں میں مختصراً انہی پر گفتگو کروں گا۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ بغاوت کا جرم صرف اس وقت سزائے موت کا مستوجب ہوتا ہے جبکہ اہل بغی ایک طاقت ور جماعت اور بھاری گروہ پر مشتمل ہوں اور مسلح ہو کر اسلامی حکومت کا مقابلہ کریں' ملک غلام صاحب کا کہنا یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ کے گروہ پر یہ تعریف صادق نہیں آتی' بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا' وہ ایک معمولی ایجی ٹیشن تھا۔ زیاد کی پولیس کے خلاف انہوں نے جو لڑائی لڑی اس میں اسلحہ بھی استعمال نہیں ہوئے۔ اس پورے ہنگامے میں صرف ایک مرتبہ تلوار کے استعمال کا ذکر تواریخ میں آیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ اگر حجر بن عدیؓ کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ تاریخوں میں دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ ان کی جمعیت ایک بھاری اور طاقت ور جمعیت تھی جسے قابو میں لانے کے لئے زیاد جیسے گورنر کو بڑی مشقت و محنت اٹھانی پڑی۔ مندرجہ ذیل دلائل اس کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حجر بن عدیؓ تین ہزار افراد کی مسلح جمعیت لے کر حضرت معاویہؓ کے خلاف کوفہ سے نکلے تھے۔ (فسار حجر عن الکوفۃ فی ثلاثۃ الاف بالسلاح)[1]

(۲) ان کی جمعیت اتنی بڑی تھی کہ اسی کے بل پر انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف یہ کہہ کر آمادہ کرنا چاہا تھا کہ اگر آپ اس معاملے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس آجایئے' اس لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار چکے ہیں (فان کنت تحب ان تطلب ھذا الامر

---

[1] الذہبیؒ: تاریخ الاسلام ص ۲۷۶ ج ۲ مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ

فاقدم الینا فقد وطنا انفسنا علی الموت معک)[1]

(۳) ان کے طاقتور ہونے کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ زیاد جب حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر بصرہ گیا تو وہ ان لوگوں پر قابو نہ پاسکے اور زیاد کو خط میں لکھا کہ:

"اگر تم کوفہ کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آجاؤ۔"[2]

(۴) طبریؒ نے نقل کیا ہے کہ زیاد نے تین مرتبہ اپنی پولیس حجرؓ کے پاس بھیجی ہر بار پولیس کی تعداد میں اضافہ بھی کیا گیا' لیکن کسی بھی مرتبہ پولیس حجرؓ اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آسکی۔

(۵) پولیس کی ناکامی کے بعد زیاد نے ہمدان' تمیم' ہوازن' ابناء اعصر' مذحج' اسد اور غطفان کے قبائل پر مشتمل ایک پوری فوج تیار کی[3] اور اسے کندہ میں حجرؓ کے مقابلے کے لئے بھیجا' یہ فوج بھی حجرؓ کو گرفتار نہ کرسکی' یہاں تک کہ حجر بن عدیؓ نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔

(۶) حضرت وائل بن حجرؓ اور کثیر بن شہابؓ حضرت حجر بن عدیؓ کے خلاف گواہیوں کا جو صحیفہ لیکر گئے تھے اور جس پر انہوں نے خود بھی گواہی دی اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: "انہوں نے امیرالمومنین کے عامل کو نکال باہر کیا ہے" ظاہر ہے کہ دو چار افراد پر مشتمل ایک چھوٹی سی ٹولی یہ کام نہیں کرسکتی۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے کسی تاریخ کی کتاب میں یہ واقعہ نہیں ملا' لیکن جب ستر صحابہ و تابعین اس پر گواہی دے رہے ہیں' اور طبریؒ اسے ذکر کرتے ہیں تو معلوم نہیں تاریخ کی کتاب میں واقعہ ملنے کا اور کیا مطلب ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملک غلام علی صاحب ان تمام باتوں پر غور فرمائیں گے تو ان کا یہ شبہ آسانی سے دور ہو جائے گا کہ حجرؓ کی جماعت ایک معمولی سے گروہ پر مشتمل تھی جس پر اہل بغی کی تعریف صادق نہیں آتی۔

---

[1] الدینوریؒ: الاخبار الطوال' ص ۲۲۱

[2] طبقات ابن سعد ص ۲۱۸ ج ۶ جز ۲۲ دار صادر بیروت والبدایہ والنہایہ ص ۵۳ ج ۸

[3] ابن عساکرؒ: تہذیب تاریخ دمشق ص ۳-۷۳ و ۳-۷۴ ج ۲ روضۃ الشام ۱۳۳۰ھ وطبری ص ۱۹۴ تا ۱۹۶ ج ۴

جناب غلام علی صاحب نے دوسرا نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ اگر بالفرض حجر بن عدیؓ بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے تو گرفتاری کے بعد انہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا' کیونکہ باغی اسیر کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی۔

لیکن جس شخص نے بھی فقہ کی کتابوں میں اسلام کے قانون بغاوت کا مطالعہ کیا ہو' وہ بہ آسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ ملک صاحب کا یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ باغی اگر گرفتار ہو جائے تو سزائے موت سے بچ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی باغی کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ اگر اسے آزاد کر دیا گیا تو وہ پھر اسلامی حکومت کے خلاف جمعیت بنا کر دوبارہ بغاوت کا مرتکب ہو گا تو اسے قتل کرنے کی اجازت تمام فقہاء نے دی ہے' سزائے موت صرف اس وقت موقوف ہوتی ہے جبکہ باغیوں کی جماعت لڑائی میں ختم ہو گئی ہو' اور جو دو چار افراد باقی رہ گئے ہوں ان کی موجودگی اسلامی حکومت کے لئے خطرہ نہ بن سکتی ہو۔ اس سلسلے میں فقہاء کی حسب ذیل تصریحات ملاحظہ فرمایئے: شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> وکذلک لا یقتلون الاسرا ذا لم یبق لھم فئۃ... وان کانت لہ فئۃ فلا باس بان یقتل اسیرھم لانہ ما اندفع شرہ ولکنہ مقھور ولو تخلص انحاز الی فئتہ فاذا رأی الامام المصلحۃ فی قتلہ فلا باس بان یقتلہ
>
> اسی طرح اگر باغیوں کی کوئی جماعت باقی نہ رہ گئی ہو تو قیدی کو قتل نہیں کریں گے.... اور اگر اس کی جماعت باقی ہو تو ان کے گرفتار شدہ باغی کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں اس لئے اس کا شر دفع نہیں ہوا' وہ محض مجبور ہو گیا ہے' اور اگر اسے آزادی مل گئی تو وہ اپنی جماعت کے ساتھ مل جائے گا' لہٰذا اگر امام اسے قتل کرنے میں مصلحت دیکھے تو اسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"[1]

فتاویٰ عالمگیریہ میں اسی مسئلے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

[1] السرخسیؒ: المبسوط ص ۱۲۶' ج ۱۰: مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۴ھ

ومن اسر منهم فليس للامام ان يقتله اذا كان يعلم انه لو لم يقتله لم يلتحق الى فئة ممتنعة اما اذا كان يعلم انه لو لم يقتله يلتحق الى فئة ممتنعة فيقتله

اور باغیوں میں سے جو شخص گرفتار ہو جائے تو اگر یہ معلوم ہو کہ اسے قتل نہ کرنے کی صورت میں وہ کسی طاقت ور جماعت سے جا نہیں ملے گا تو امام کو اسے قتل کرنے کا حق نہیں' لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو کہ اگر اسے قتل نہ کیا گیا تو وہ کسی طاقت ور جماعت سے جا ملے گا تو اسے قتل کر دے۔"[1]

حجر بن عدیؓ کے بارے میں حضرت معاویہؓ کو پورا اندیشہ تھا کہ اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو وہ پھر حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوں گے' چنانچہ ایک موقعہ پر انہوں نے اس کا اظہار بھی فرمایا :

ان حجرًا راسُ القوم واخاف ان خليت سبيله ان يفسد على مصري [2]

حجرؓ اس پوری قوم کے سردار ہیں' اور اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو مجھے خطرہ ہے کہ وہ میری حکومت کے خلاف فساد کریں گے۔"

اور ایک اور موقعہ پر انہوں نے ارشاد فرمایا:

قتله احب الي من ان اقتل معه مائة الف

"ان کا قتل کرنا مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اسکے کہ میں انکے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کروں۔"[3]

ان حالات میں خود فیصلہ کر لیا جائے کہ جناب غلام علی صاحب کا یہ موقف کس حد تک درست ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد حجر بن عدیؓ کو قتل کرنا جائز نہیں رہا تھا۔

---

[1] فتاویٰ عالمگیری ص ۳۲۰ ج ۲ نولکشور' مزید ملاحظہ فرمایئے رد المحتار ص ۴۸۱ ج ۳ و فتح القدیر ص ۴۱۲ ج ۴ و بدائع الصنائع' ص ۱۴۱ ج ۷

[2] الطبری ص ۲۰۴ ج ۴

[3] البدایہ والنہایہ' ص ۵۴ ج ۸

ملک غلام علی صاحب کو اس کارروائی پر تیسرا قابل ذکر اعتراض یہ ہے کہ زیاد نے ستر گواہیوں کا جو صحیفہ حضرت معاویہؓ کے پاس روانہ کیا وہ سب لکھی ہوئی گواہیاں تھیں جو فقہی اصطلاح کے مطابق "کتاب القاضی الی القاضی" کے تحت آتی ہیں' اور گواہی کا یہ طریقہ حدود و قصاص کے معاملات میں معتبر نہیں ہوتا۔

لیکن ملک صاحب موصوف نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ان ستر گواہوں میں سے دو گواہ خود حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ بھی تھے جن کے ذریعے یہ صحیفہ بھیجا گیا تھا' لہٰذا ان دو گواہوں نے اپنی گواہی حضرت معاویہؓ کے سامنے زبانی پیش کی تھی' اور باقی گواہیاں محض تائید کے طور پر تھیں' شرعی نصاب شہادت حضرت وائلؓ اور حضرت کثیرؓ کی زبانی گواہیوں سے پورا ہو گیا تھا' چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبیؒ لکھتے ہیں :

"وجاء الشھود فشھدوا عند معاویۃ علیہ"

"گواہ آئے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کے روبرو حجر بن عدیؓ کے خلاف گواہی دی"۔[1]

بلکہ حافظ ذہبیؒ نے "شہود" کا لفظ صیغہ جمع کے ساتھ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو حضرات کے علاوہ بھی بعض گواہوں نے زبانی شہادت دی تھی' رہا حضرت شریحؒ کا قصہ' سو ان کی تردید کے باوجود نصاب شہادت باقی تھا' اس لئے کہ حضرت وائلؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ نے اپنی گواہیوں سے رجوع نہیں کیا تھا' پھر حضرت شریحؒ نے جن الفاظ میں تردید کی ان میں حضرت حجر بن عدیؓ کے عابد و زاہد ہونے کا ذکر تو موجود ہے لیکن جن باغیانہ سرگرمیوں کی شہادت دوسروں نے دی تھی' ان کی نفی نہیں ہے۔ اس لئے قانونی طور پر ان کی تردید سے اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان تین نکات کی وضاحت کے بعد ملک غلام علی صاحب کی پوری بحث کا جواب ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی ساری گفتگو انہی نکات پر مبنی ہے' البتہ آخر میں ان کے ایک اور اعتراض کا جواب بھی پیش خدمت ہے جو عام ذہنوں میں غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے'

---

[1] الذہبیؒ تاریخ الاسلام' ص ۲۷۶' ج ۲ مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ

ملک صاحب لکھتے ہیں :

"حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ کو قتل کرنے کا حکم دیا' سوال یہ ہے کہ اس دو گونہ اور امتیازی سلوک کی وجہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عثمانی صاحب نے اس سوال کا جواب بعض پوچھنے والوں کو یہ دیا ہے[1] کہ باغی کا قتل واجب نہیں' صرف جائز ہے' اس لئے امیر معاویہؓ نے جسے چاہا قتل کرا دیا' جسے چاہا معاف کر دیا ع ناطقہ سر بگریبان ہے اسے کیا کہیئے! اس کے معنی تو یہ ہیں کہ عثمانی صاحب حضرت معاویہؓ کو ماشاءاللہ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء کے مقام عالی پر فائز کرنا چاہتے ہیں کہ معاملہ عدالت کا نہیں' مشیت کا تھا' میں یہ حقیقت کھول کر بیان کر چکا کہ اول تو یہ اصحاب ہرگز باغی نہ تھے' اور بالفرض اگر تھے بھی تو گرفتار ہو جانے کے بعد مجرد جرم بغاوت کی سزا ہرگز قتل نہیں ہے۔ اب میں عثمانی صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ چبا چبا کر[2] بات کرنے کے بجائے صاف صاف بتائیں کہ انہوں نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ باغی اسیر کا قتل واجب تو نہیں' مگر جائز ہے؟"

(ترجمان القرآن' نومبر ۱۹۶۹ء ص ۴۴)

ملک صاحب کا یہ مطالبہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کسی سے یہ کہنے لگے کہ صاف صاف بتاؤ تم نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ نماز کے لئے وضو ضروری ہے؟ میں حیران ہوں کہ وہ کس بنیاد پر مجھ سے یہ مطالبہ فرما رہے ہیں۔ جس شخص کو بھی فقہی کتابوں سے ادنیٰ مس ہو وہ اس "اصول" کے اثبات کے لئے ایک دو نہیں بلا مبالغہ فقہاء کے بیسیوں حوالے پیش کر سکتا ہے' ملک صاحب مجبور فرماتے ہیں تو ان میں سے چند ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

در مختار فقہ حنفی کا معروف متن ہے' اس میں لکھا ہے:

---

[1] یہ بات مجھ سے ایک خط میں پوچھی گئی تھی ملک صاحب کے اس ارشاد سے اندازہ ہوا کہ یہ خطوط کہاں سے اور کس تنظیم کے ساتھ آ رہے تھے۔

[2] زبان کی شیرینی ملاحظہ فرمایئے۔

والامام بالخیار فی اسیرھم ان شاء قتلہ وان شاء حبسہ [1]

"گرفتار شدہ باغی کے بارے میں امام کو اختیار ہے' اگر چاہے تو اسے قتل کردے اور اگر چاہے تو اسے محبوس رکھے"

امام کمال الدین بن ہمامؒ اس "اختیار" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومعنی ھذا الخیار ان یحکم نظرہ فیما ھو احسن الامرین فی کسر الشوکۃ لا بھوی النفس والتشفی [2]

اس اختیار کا مطلب یہ ہے کہ امام (حاکم) اس بات پر غور کرے کہ باغیوں کی شوکت توڑنے کے لئے کون سی صورت زیادہ بہتر ہے' محض خواہشات نفس اور سنگ دلی کی وجہ سے کوئی صورت اختیار نہ کرے۔

ملک العلماء کاسانی رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

واما اسیرھم فان شاء الامام قتلہ استئصالا لشافتھم وان شاء حبسہ لاند فاع شرہ بالاسر والحبس وان لم یکن لھم فئۃ یتحیزون الیھا لم یتبع مدبرھم و لم یجھز علی جریحھم ولم یقتل اسیرھم لوقوع الامن عن شرھم عند انعدام الفئۃ [3]

"جہاں تک باغی اسیر کا تعلق ہے تو امام اگر چاہے تو اسے قتل کردے تاکہ انکی مکمل بیخ کنی ہو جائے' اور اگر چاہے تو اسے قید رکھے' اس لئے کہ اس کا شر گرفتاری سے بھی دور ہو سکتا ہے اور اگر باغیوں کی کوئی ایسی جمعیت نہ ہو جہاں وہ پناہ لے سکیں تو نہ ان کے بھاگنے والے افراد کا تعاقب کیا جائے گا' نہ ان کے زخمیوں کا کام تمام کیا جائے گا اور نہ ان کے گرفتار شدہ افراد کو قتل کیا جائے گا' اس لئے کہ جب ان کی کوئی جمعیت نہیں رہی تو ان کے شر کا بھی کوئی خوف نہیں رہا۔"

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار' ص ۴۸۱ ج ۳' بولاق مصر۔

[2] ابن الہمامؒ فتح القدیر ص ۴۱۲ ج ۴

[3] الکاسانیؒ بدائع الصنائع ص ۱۴۱ ج ۷' مطبعہ جمالیہ مصر ۱۳۲۸ھ

علامہ مرغینانیؒ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

فان کانت (ای فئۃ) یقتل الامام الاسیر وان شاء حبسہ

اگر باغیوں کی جمعیت موجود ہو تو ان کے گرفتار شدہ افراد کو امام قتل کردے اور چاہے تو قید رکھے۔

یہ چند حوالے میں نے محض مثال کے طور پر پیش کردیئے ہیں' ورنہ فقہ کی کوئی بھی مکمل کتاب اس مسئلے سے خالی نہیں ہے' فقہاءؒ کی ان تصریحات سے قدر مشترک کے طور پر جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جس باغی اسیر کی جمعیت باقی ہو' اسے قتل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ امام کے سپرد کیا گیا ہے تاکہ وہ حالات کے پیش نظر مناسب فیصلہ کرسکے' اگر کسی قیدی کا وجود باغیوں کی جمعیت کو تقویت پہنچا سکتا ہو اور اس سے ان کی جماعت کی شوکت میں اضافہ ہوسکتا ہو تو اسے قتل کروادے' اور جس قیدی کے بارے میں ظن غالب یہ قائم ہوجائے کہ باغیوں کی شوکت کو توڑنے کے لئے اسے قتل کرنا ضروری نہیں ہے تو اس کی سزائے موت کو موقوف کردے۔

تمام فقہاءؒ اس حکم کے بیان پر متفق ہیں اور ہر ایک فقہی کتاب میں امام کو یہ اختیار دیا گیا ہے' اب اگر جناب ملک غلام علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہے تو وہ میدان حشر میں ان تمام بزرگوں سے جنہوں نے اپنی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے یہ سوال ضرور کریں کہ آپ نے صرف حضرت معاویہؓ ہی کو نہیں "اسلامی حکومت کے تمام فرماں رواؤں کو "یعذب من یشاء ویغفر لمن یشاء کے مقام عالی پر کیوں فائز کردیا" اور اپنی کتابوں میں بار بار ان شاء قتلہ وان شاء حبسہ لکھ کر عدالت کے اس مسئلے کو "مشیت" کا مسئلہ کس طرح بنادیا؟

ایک ضروری گذارش

ہم نے حضرت حجر بن عدیؓ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کی سرگرمیاں نفس الامر میں بغاوت کے تحت آتی تھیں' اس لئے حضرت معاویہ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا' اس میں وہ معذور تھے' لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ اس بغاوت کی بناء پر فسق کے مرتکب ہوئے' بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ بغاوت کرنے والا اگر صاحب بدعت نہ ہو اور نیک نیتی کے ساتھ معتدبہ دلیل و تاویل کی بنیاد پر اسلامی

حکومت کے خلاف خروج کرے تو اگرچہ اس پر احکام تو اہل بغی ہی کے جاری ہوں گے، لیکن اس بناء پر اسے فاسق بھی نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے خلاف لڑائی کی، اس میں جمہور اہلسنّت کے نزدیک حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اسی لئے حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ اہل بغی کا سا معاملہ کر کے انکے خلاف جنگ کی، اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے بہت سے رفقاء شہید بھی ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کی شہادت میں حضرت علیؓ کا چنداں قصور بھی نہیں تھا کیونکہ وہ امام برحق تھے، لیکن اس بناء پر حضرت معاویہؓ کو مرتکب فسق قرار نہیں دیا گیا، بلکہ انہیں مجتہد مخطئی کہا گیا، علامہ موفق الدین بن قدامہؒ اسی بات کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

والبغاة اذا لم يكونوا من اهل البدع ليسوا بفاسقين وانما هم يخطئون فى تاويلهم والامام واهل العدل مصيبون فى قتالهم فهم جميعا كالمجتهدين من الفقهاء فى الاحكام من شهد منهم قبلت شهادته اذا كان عدلاً وهذا قول الشافعیؒ ولا اعلم فى قبول شهادتهم خلافا[1]

"اور باغی لوگ اگر اہل بدعت میں سے نہ ہوں تو وہ فاسق نہیں ہیں، بلکہ انکی تاویل غلط ہے، اور امام اور اہل عدل بھی ان سے جنگ کرنے میں برحق ہیں، انکی مثال ایسی ہی ہے جیسے احکام شرعیہ میں مجتہد فقہاء (کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو برغلط سمجھتا ہے، لیکن مرتکب فسق کوئی نہیں ہوتا) لہٰذا ان میں سے جو شخص گواہی دے اسکی گواہی مقبول ہے بشرطیکہ وہ عدل ہو، یہ امام شافعیؒ کا قول ہے اور اسکی شہادت کو قبول کرنے میں علماء کے کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں ہے۔"

حضرت حجر بن عدیؓ چونکہ ایک عابد و زاہد انسان تھے، اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف جو کچھ کیا، اس کا منشاء طلب اقتدار تھا، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے خروج کا ارتکاب کسی تاویل کے ساتھ ہی کیا ہوگا، اس لئے ان کا ذکر بھی ادب و احترام کے ساتھ ہونا چاہئے، اور شاید یہی وجہ ہے

---

[1] ابن قدامہؒ: المغنی ص ۱۱۷ اور ۱۱۸ ج ۸۔ دار المنار مصر ۱۳۶۷ھ

کہ بعض علماء مثلاً شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ نے ان کی موت کے لئے شہادت کا لفظ استعمال کیا' اور چونکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپکو اہل عدل میں سے سمجھتے تھے' اس لئے جہاں شمس الائمہ رحمتہ اللہ علیہ نے بعض شہدائے اہل عدل کی وصیتیں نقل کی ہیں' ان میں حضرت حجر بن عدیؓ کی وصیت بھی نقل فرمادی ہے کہ مجھے غسل نہ دیا جائے۔[1] کیونکہ شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کا اصل مقصد اس جگہ یہ بتانا ہے کہ اہل بغی کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے جو اہل عدل شہید ہو جائیں انہیں غسل نہیں دیا جائے گا' اس کی دلیل میں انہوں نے جہاں حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت زید بن صوحانؓ کی وصیت نقل کی ہے' وہیں حضرت حجر بن عدیؓ کی وصیت بھی نقل کردی ہے جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چونکہ اپنے آپکو اہل عدل میں سے سمجھتے تھے اور انہوں نے یہ وصیت کی کہ مجھے غسل نہ دیا جائے' اس لئے معلوم ہوا کہ شہدائے اہل عدل کو ان کے نزدیک غسل کے بغیر دفن کرنا چاہئے۔ اس سے ملک صاحب کا یہ استنباط درست نہیں ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ نفس الامر میں بھی اہل عدل میں سے تھے اور انہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا' کیونکہ اگر انہیں واقعۃً اہل عدل میں سے مانا جائے تو پھر لازماً کہنا پڑے گا کہ ان کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ اہل بغی میں سے تھے' اب کیا ملک صاحب یہ بھی فرمائیں گے کہ خلیفۂ برحق حجر بن عدیؓ تھے اور حضرت معاویہؓ ان کے مقابلے میں باغی تھے' جبکہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت حسنؓ سے مصالحت کے بعد ان کی خلافت بلاشبہ منعقد ہو چکی تھی؟ اور غالباً مولانا مودودی صاحب کو بھی اس سے انکار نہیں ہوگا۔

میں نے حجر بن عدیؓ کے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے شروع میں لکھا تھا کہ: "اس واقعے میں بھی مولانا مودودی صاحب نے اول تو چند باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے۔" ان چند باتوں میں سے ایک بات تو حضرت عائشہؓ کا قول تھا جو مجھے پہلے کسی کتاب میں نہیں ملا تھا' بعد میں مل گیا تو جمادی الثانیہ ۸۹ء کے البلاغ میں میں نے معذرت کا اعلان کردیا تھا۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے "چند باتیں" بصیغہ جمع لکھا ہے' اگر مولانا مودودی کی کوئی اور بات ابھی تک

---

[1] السرخسیؒ: المبسوط ص ۱۳۱ ج ۱۰ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ

کتابوں میں نہ ملی ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے' ورنہ غیر ذمہ دارانہ باتوں سے پرہیز کیا جائے۔

اس کے جواب میں ملک صاحب سے گذارش ہے کہ براہ کرم ربیع الثانی ۸۹ ۱۳ھ کے البلاغ میں صفحہ ۱۹ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے بتایا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے زیاد کے بارے میں لکھا ہے کہ : "وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا" لیکن جتنے حوالے انہوں نے دیئے ہیں' ان میں کہیں بھی زیاد کا حضرت علیؓ کو گالیاں دینا مذکور نہیں' بلکہ قاتلین عثمانؓ پر لعنت کرنا مذکور ہے۔ طبریؒ' ابن اثیرؒ' البدایہ اور ابن خلدونؒ سب کی عبارتیں میں نے البلاغ کے مذکورہ صفحے پر لکھی دی ہیں۔ کیا ملک صاحب نے ان کا مطالعہ نہیں فرمایا؟

یزید کی ولی عہدی

یزید کی ولی عہدی کے مسئلے میں ملک غلام علی صاحب نے میرے مضمون پر جو تبصرہ فرمایا ہے اسے بار بار ٹھنڈے دل سے پڑھنے کے بعد میں اس کے بارے میں تاویل در تاویل کے بعد ہلکی سے ہلکی بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالباً ملک صاحب نے میرے مضمون کو بنظر غائر پڑھنے سے قبل ہی اس پر تبصرہ لکھنا شروع کردیا ہے اور میرے موقف کو صحیح سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ موصوف کی اس بحث میں جگہ جگہ یہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے ایک موقف تصنیف فرما کر مجھ سے منسوب کرتے ہیں' اور پھر اس کی تردید میں صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اس تبصرے میں کہیں نزاع لفظی باقی رہ گیا ہے' کہیں تضاد بیانی پیدا ہو گئی ہے' اور کہیں بالکل غیر متعلق بحثیں چھڑ گئی ہیں۔

اگر میری مصروفیات میں "بحث برائے بحث" کا کوئی خانہ ہوتا تو میں موصوف کے مضمون کے ایک ایک جز پر تبصرہ کرکے بتاتا کہ انہوں نے میرے موقف کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کن کن تضاد بیانیوں اور لفظی مغالطوں کا ارتکاب کیا ہے' اور بات کہاں سے کہاں پہنچادی ہے' لیکن جیسا کہ میں بار بار عرض کرچکا ہوں' میرے پیش نظر مناظرہ بازی نہیں' صرف اہل سنت کے موقف کا مدلل اظہار اور اس پر جو علمی نوعیت کے اشکالات ہوسکتے ہیں' ان کا دفعیہ ہے' اس لئے اس مسئلے میں میرا کام بہت مختصر رہ گیا ہے' البتہ جن

حضرات کو ملک صاحب کے فن مناظرہ سے زیادہ دلچسپی ہو' ان سے میری درخواست ہے کہ وہ ایک مرتبہ میرے اور ان کے مضمون کو آمنے سامنے رکھ کر ضرور مطالعہ فرمالیں' انشاء اللہ بڑی بصیرت و عبرت حاصل ہوگی۔

میں نے یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں اہل سنت کے جس موقف کا اظہار کیا تھا' وہ یہ تھا کہ یزید کو جانشین نامزد کرنا حضرت معاویہؓ کی رائے کی غلطی تھی جو دیانت داری اور نیک نیتی ہی کے ساتھ سرزد ہوئی' لیکن اس کے نتائج امت کے لئے اچھے نہ ہوئے' میں نے بحث کے شروع ہی میں واضح کردیا تھا کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب سے ہمارا اختلاف یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ صرف رائے کی دیانت دارانہ غلطی نہیں تھی بلکہ اس کا محرک حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا ذاتی مفاد تھا' اس مفاد کو پیش نظر رکھ کر "دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کرلیا کہ وہ امت محمدیہؐ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔" اور ہمارے نزدیک یہ محض رائے کی غلطی تھی' حضرت معاویہؓ نے یزید کو صرف اس لئے ولی عہد نامزد نہیں کیا کہ وہ ان کا بیٹا تھا' بلکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اسے خلافت کا اہل سمجھتے تھے گویا ہمارے نزدیک انکے فیصلہ کی اصل بنیاد یہ تھی کہ ان کے نزدیک وہ خلافت کا اہل بھی تھا اور امت اس پر جمع بھی ہو سکتی تھی' اور مولانا مودودی کے نزیک ان کے فیصلے کی بناء صرف یہ تھی کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔

میرا یہ موقف میرے مضمون سے بالکل واضح ہے اور اسی کے مفصل دلائل میں نے پیش کئے تھے اور آخر میں لکھا تھا:

> "جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں' مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور معاویہؓ کی رائے واقعہ کے لحاظ سے سو فیصد درست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا' بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں بلکہ دیانتداری پر مبنی تھی' اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا' ورنہ جہاں تک رائے کا تعلق ہے' جمہور امت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضرات صحابہ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے جنکی مندرجہ ذیل وجوہ

ہیں:

(ا) حضرت معاویہؓ نے تو بیشک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا' لیکن ان کا یہ عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا' انہوں نے اسکی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظام شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا' اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی الخ"

لیکن ملک غلام علی صاحب یزید کی ولی عہدی کی بحث کے بالکل شروع میں میرا کیا موقف بیان فرماتے ہیں؟ ملاحظہ فرمایئے :

"اب یزید کی ولی عہدی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر اپنے بیٹے یا دوسرے رشتہ دار میں نیک نیتی کے ساتھ شرائط خلافت پاتا ہے تو اسے ولی عہد بنا سکتا ہے اور خلیفہ کی نیت پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ خلافت علی منہاج النبوۃ اور خاندانی بادشاہت دونوں اسلام میں یکساں طور پر جائز و مباح ہیں اور مسلمان ان دونوں میں سے جس طرز حکومت کو چاہیں اپنا سکتے ہیں"

(ترجمان القرآن جنوری ۷۰ء ص ۳۳)

میرے اور ملک صاحب کے اس اقتباس کا ایک ایک جملہ ملا کر دیکھئے' ہمارے فاضل تبصرہ نگار کی سخن فہمی' امانت و دیانت اور نقل و بیان کی خوبصورتی ملاحظہ فرمایئے' اور اس کے بعد بتایئے کہ جو بحث اس سخن فہمی کی بنیاد پر ایسی علمی دلاوری کے ساتھ شروع کی گئی ہو' اس کا کیا جواب دیا جائے....؟

میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ میری بحث کا منشاء حضرت معاویہؓ کے اس فعل کی تصویب و تائید نہیں ہے' بلکہ یہ بتانا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ نیک نیتی پر مبنی تھا' اس لئے کہ وہ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے' اس کے لئے منجملہ اور دلائل کے ایک دلیل میں نے یہ بھی پیش کی تھی کہ حضرت معاویہؓ نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ اگر یزید اس منصب کا اہل ہے تو اس کی

ولایت کو پورا فرمادے ' ورنہ اس کی روح قبض کرلے ' اس پر گفتگو کرتے ہوئے ملک غلام علی صاحب نے یہ بات تسلیم فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں:

> "ان دعائیہ کلمات سے بھی یزید کی فضیلت و اہلیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے ' لیکن یہ رائے جیسا کہ عرض کیا جاچکا ' غلطی اور مبالغے کے احتمال سے خالی نہیں ہو سکتی۔"

(ترجمان مارچ ۱۹۷۰ء ص ۲۵)

میری گذارش یہ ہے کہ جو چیز اس دعا سے بقول آپ کے ثابت نہیں ہوتی ' اسے میں نے ثابت کرنا ہی کب چاہا ہے؟ میرا مدعا بھی اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ "حضرت معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے۔" جہاں تک اس رائے میں "غلطی اور مبالغے کے احتمال" کا تعلق ہے ' میں نے بھی اس کی تردید نہیں کی ' جب ملک صاحب نے حضرت معاویہؓ کو نیک نیت مان لیا تو میرا مقصد حاصل ہوگیا ' اب نہ جانے غلام علی صاحب میری کس بات کی تردید فرما رہے ہیں؟ جب یہ بات میرے اور ملک غلام علی صاحب کے درمیان متفق علیہ ہوگئی کہ حضرت معاویہؓ نے یہ فیصلہ نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا تو پھر خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ مولانا مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل جملہ اس "نیک نیتی" میں کس طرح فٹ بیٹھ سکتا ہے کہ:

> "یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی ' بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کرکے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کرلیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں"

لیکن یہ عجیب و غریب بات ہے کہ جناب غلام علی صاحب ایک طرف تو تسلیم فرماتے ہیں کہ "امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے" اور دوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی اس عبارت میں کوئی غلطی تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ' مولانا مودودی صاحب کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے جو علمی نکات بیان فرمائے ہیں وہ

نہایت دلچسپ ہیں' فرماتے ہیں کہ: مولانا مودودی صاحب نے نیت کا لفظ استعمال نہیں کیا جذبے کا لفظ استعمال کیا ہے اور "صحیح جذبے کی بنیاد پر نہ ہونا اور کام کرنے والے کا نیک نیت نہ ہونا اور اس کی نیت کا متہم ہونا دونوں صورتیں یکساں نہیں ہیں۔" کم از کم میری عقل تو اس فرق کو محسوس کرنے سے بالکل عاجز ہے جو ملک صاحب "نیت" اور "جذبہ" میں بیان فرمانا چاہتے ہیں۔ ملک صاحب سے میری پر خلوص گذارش یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس لفظی تاویل میں پڑنے کے بجائے مولانا کو مشورہ دیں کہ وہ مذکورہ عبارت واپس لے لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو نیک نیتی پر محمول کرنے کے بعد ملک غلام علی صاحب نے مولانا مودودی صاحب کے اس قول کی خود بخود تردید کردی' جس میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے فعل کو ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیا ہے' اس کے بعد ان کی ساری بحث شدید قسم کے نزاع لفظی کے سوا کچھ نہیں' اور میں اس لفظی ہیر پھیر میں الجھ کر بلاوجہ اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

عدالتِ صحابہؓ

میں نے اپنے مقالہ کے آخر میں تین اصولی مباحث پر گفتگو کی تھی۔ عدالت صحابہؓ' تاریخی روایات کی حیثیت اور حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت کا صحیح مقام' ان میں سے آخری دو موضوعات کو تو ملک غلام علی صاحب نے تیرہ قسطیں لکھنے کے بعد "اختصار" کے پیش نظر چھوڑ دیا ہے' البتہ عدالت صحابہؓ کے مسئلہ پر طویل بحث کی ہے۔

جناب ملک صاحب کے انداز بحث میں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ وہ میرے مضمون کے اصل نقطے پر گفتگو کرنے کے بجائے ادھر ادھر کی غیر متعلق یا غیر بنیادی باتوں پر اپنا سارا زور صرف کرتے ہیں' نتیجہ یہ ہے کہ انکے مضمون میں صفحات کے صفحات پڑھنے کے بعد بھی بنیادی باتیں جوں کی توں تشنہ رہ جاتی ہیں' اور ان کے بارے میں آخر تک یہ نہیں کھلتا کہ ان کا موقف کیا ہے؟ اور اگر وہ میری کسی بات پر تبصرہ کرتے ہیں تو اسے سیاق وسباق سے کاٹ کر من مانا مفہوم پہناتے ہیں اور اسکی مفصل تردید شروع کردیتے ہیں۔

اسی عدالت صحابہؓ کے مسئلہ میں میں نے بحث کو سمیٹنے کے لئے ایک تنقیح قائم کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ صحابہؓ کی عدالت کے عقلاً تین مفہوم ہوسکتے ہیں' مولانا مودودی

صاحب نے عدالت کی جو تشریح کی ہے[1]' اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ وہ کون سے مفہوم کو درست سمجھتے ہیں' لہٰذا انہیں اور ان کا دفاع کرنے والے حضرات کو چاہیے کہ وہ صاف طریقے سے یہ واضح کریں کہ عدالت کی ان تشریحات میں سے کونسی تشریح ان کے نزدیک درست ہے؟ اور اگر وہ ان تینوں کو درست نہیں سمجھتے تو دلائل کے ساتھ انکی تردید کر کے ان تینوں کے علاوہ کوئی چوتھی تشریح پیش کریں۔

جناب غلام علی صاحب نے عدالت صحابہؓ کے مسئلے پر پینتالیس صفحے لکھے ہیں' اور ان میں بعض بالکل غیر متعلق باتوں پر کئی کئی ورق خرچ کئے ہیں' مگر آخر تک میرے اس سوال کا واضح جواب نہیں دیا کہ عدالت کے ان تین معانی میں سے کونسا مفہوم ان کے نزدیک درست ہے۔ عدالت صحابہؓ کے میں نے تین مفہوم بیان کئے تھے۔

(۱) صحابہ کرامؓ معصوم اور غلطیوں سے پاک ہیں۔

(۲) صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں (معاذ اللہ) فاسق ہو سکتے ہیں' لیکن روایت حدیث کے معاملہ میں وہ بالکل عادل ہیں۔

(۳) صحابہ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق' یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت "دو ایک یا چند" غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں' لیکن تنبہ کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرمادیا۔ اس لئے وہ ان غلطیوں کی بنا پر فاسق نہیں ہوئے' چنانچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی صحابیؓ نے گناہوں کو اپنی "پالیسی" بنالیا ہو جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جاسکے۔

میں نے لکھا تھا کہ "اصل سوال یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان میں سے کون سا مفہوم درست سمجھتے ہیں؟" پہلا تو ظاہر ہے' کسی کا مسلک نہیں' اب آخری دو مفہوم رہ جاتے ہیں' مولانا نے یہ بات صاف نہیں کی کہ انکی مراد کونسا مفہوم ہے' اس کے بعد میں نے

---

[1] مولانا مودودی نے عدالت کی تشریح یہ کی ہے: "میں الصحابۃ کلھم عدول کا مطلب یہ نہیں لیتا کہ تمام صحابہؓ بے خطا تھے' اور ان میں کا ہر ایک فرد ہر قسم کی بشری کمزوریوں سے پاک تھا اور ان میں سے کسی نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی ہے' بلکہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا آپؐ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابی نے کبھی راستی سے ہرگز تجاوز نہیں کیا ہے۔"

لکھا تھا کہ:

"اگر انکی مراد دوسرا مفہوم ہے یعنی یہ کہ صحابہ کرامؓ صرف روایت حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق و فاجر بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بات ناقابل حد تک خطرناک ہے.....اور اگر مولانا مودودی صاحب عدالت صحابہؓ کو تیسرے مفہوم میں درست سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی اوپر نقل کی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے، سو یہ مفہوم جمہور اہل سنت کے نزدیک درست ہے، لیکن حضرت معاویہؓ پر انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں، اگر انکو درست مان لیا جائے تو عدالت کا یہ مفہوم ان پر صادق نہیں آسکتا۔" (البلاغ۔ رجب ۸۹ھ ص ۱۱)

میری اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ میں نے عدالت کا کوئی مفہوم مولانا مودودی صاحب کی طرف متعین طور سے منسوب نہیں کیا، لیکن ملک غلام علی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مدیر البلاغ کا کارنامہ ملاحظہ ہو کہ توجیہ القول بمالا یرضیٰ قائلہ سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر مولانا مودودی کا یہ مفہوم ہے کہ صحابہ کرام صرف روایت حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق فاجر بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بات ناقابل بیان حد تک غلط اور خطرناک ہے...... غضب یہ ہے کہ مولانا عثمانی صاحب بناء الفاسد علی الفاسد کے اصول پر پہلے تو مولانا مودودی کے منہ میں زبردستی یہ الفاظ ٹھونستے ہیں کہ صحابہ کرام اپنی عملی زندگی میں فاسق و فاجر ہو سکتے ہیں اور پھر اس فاسد اور فرضی بنیاد پر دوسرا ردّایہ جماتے ہیں کہ الخ"

میری اوپر کی عبارت پڑھئے، پھر اس پر ملک صاحب کا تبصرہ، بالخصوص خط کشیدہ جملہ، دیکھئے، اور ہمارے فاضل تبصرہ نگار کے عدل و انصاف، علمی دیانت اور فن مناظرہ کی داد دیجئے، میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ بات صاف نہیں کی کہ وہ عدالت کے کون سے مفہوم کو درست سمجھتے ہیں؟ وہ متعین کر کے بتائیں کہ ان میں سے کونسی تشریح ان کے نزدیک صحیح ہے؟ پھر ہر تشریح سے پیدا ہونے والے مسائل کا الگ الگ ذکر

کرتے ہوئے یہ بھی لکھ رہا ہوں کہ مولانا مودودی کی ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیسرے مفہوم کی طرف مائل ہیں' مگر ملک صاحب آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ کر صرف بیچ کا ایک جملہ نقل کرکے اپنے قارئین کو یہ باور کراتے ہیں کہ عدالت کا دوسرا مفہوم میں نے "زبردستی مولانا مودودی صاحب کے منہ میں ٹھونس دیا ہے" خدا جانے ملک صاحب کے نزدیک ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید کا کوئی مطلب ہے یا نہیں؟

اس طرز عمل کا آخرت میں وہ کیا جواب دیں گے؟ یہ تو وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے' بہر حال' اس سے اتنا معلوم ضرور ہوا کہ عدالت کے دوسرے مفہوم کو وہ درست نہیں سمجھتے۔

اب صرف تیسرا مفہوم باقی رہ گیا' میں نے اپنے طور پر اسی مفہوم کو صحیح اور جمہور اہل سنت کا مسلک قرار دیا تھا' ملک غلام علی صاحب پہلے تو اس کو "سراسر غلط اور بے دلیل موقف" قرار دیتے ہیں (ترجمان اپریل ۷۰ ص ۴۳) لیکن ایک مہینے کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :"تاہم مولانا مودودی کی کوئی تحریر عدالت کی اس تعریف سے بھی متصادم نہیں ہے" (ترجمان' مئی ۷۰ ص ۴۴)۔ یہاں پہلا سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ تعریف "سراسر غلط اور بے دلیل" ہے تو مولانا مودودی کی کوئی تحریر اس سے متصادم کیوں نہیں؟ مولانا نے عدالت کی جو تعریف کی ہے' اس کے بارے میں جناب غلام علی صاحب نے لکھا ہے : "عدالت صحابہؓ کی اس سے بہتر اور محکم تر تعریف اور نہیں ہو سکتی" (ترجمان' اپریل' ص ۴۷) اب یہ عجیب و غریب "بہتر اور محکم تر تعریف" جو ایک "سراسر غلط اور بے دلیل موقف" کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے' اور اس سے متصادم نہیں ہوتی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ تیسرا مفہوم بھی آپکے نزدیک سراسر غلط اور بے دلیل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے عدالت کی جو تین تشریحات پیش کی تھیں وہ تینوں آپکے نزدیک غلط ہو گئیں اب آپکا فرض تھا کہ کوئی چوتھی تشریح خود پیش کرکے حضرت معاویہؓ کو اس پر منطبق فرماتے لیکن پورے مضمون میں آپ نے ان کے علاوہ کوئی اور مفہوم بھی پیش نہیں کیا۔ ملک صاحب شاید اس کے جواب میں یہ فرمائیں کہ مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں عدالت کی جو تشریح انہوں نے نقل کی ہے' وہی چوتھی تشریح ہے' لیکن میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ تشریح مجمل ہے' اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ روایت حدیث میں

تمام صحابہؓ عادل اور راست باز تھے، لیکن عام عملی زندگی میں بھی وہ عادل تھے یا نہیں؟ یہ بات صاف نہیں ہے، اسی بات کو صاف کرنے کے لئے میں نے یہ تین تنقیحات قائم کی تھیں، جن کا حاصل یہ تھا کہ عام عملی زندگی کے اعتبار سے کسی صحابی کو فاسق کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے اس احتمال کو بھی رد کردیا کہ انہیں فاسق کہا جاسکتا ہے، اور اس احتمال کو بھی کہ انہیں فاسق نہیں کہا جاسکتا، اس "ارتفاع نقیضین" کا ارتکاب کرنے کے بعد خدارا یہ تو بتائیے کہ آپ کا موقف ہے کیا؟

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں عرض کیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کی ایک عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ عام عملی زندگی میں بھی کسی صحابی کو فاسق قرار دینا درست نہیں سمجھتے، بلکہ میری بیان کردہ تیسری تشریح کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ "کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسکی عدالت کی کلی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے" اس بات کو درست مانتے ہوئے میں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ مولانا مودودی نے جو الزامات حضرت معاویہؓ پر عائد کئے ہیں، انہیں "ایک دو یا چند معاملات" سے تعبیر کرنا درست نہیں، اگر مولانا مودودی کے عائد کئے ہوئے تمام الزامات درست مان لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رشوت، جھوٹ، مکروفریب، قتل ناحق، اجراء بدعت، مال غنیمت میں خیانت، جھوٹی گواہی، جھوٹا نسب بیان کرنا اور اعانت ظلم جیسے کبیرہ گناہوں کا صرف ارتکاب ہی نہیں کیا، بلکہ ان کو باقاعدہ "پالیسی" بنا لیا تھا، اس لئے اسے "ایک دو یا چند گناہ کر گذرنے" سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، آج اگر کوئی شخص ان تمام گناہوں کو اپنی "پالیسی" بنالے تو خواہ وہ ساری رات تہجد پڑھنے میں گذارتا ہو، اسے فاسق ضرور کہا جائے گا لہٰذا یا تو یہ کہئے کہ (معاذ اللہ) حضرت معاویہؓ بھی فاسق تھے، یا پھر یہ مانئے کہ جو الزامات ان پر مولانا مودودی صاحب نے عائد کئے ہیں، وہ درست نہیں ہیں۔

میرے اس اعتراض کے جواب میں ملک غلام علی صاحب نے حسب عادت خلط مبحث کا ارتکاب کرتے ہوئے پہلے تو ان تمام الزامات کو از سرتو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور پھر آخر میں لکھا ہے:

"میں عزیزم محمد تقی صاحب عثمانی سے کہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو

"خلافت و ملوکیت" کا نسخہ ہے' آپ چاہیں تو اس میں "ایک دو یا چند" کے بجائے گیارہ یا اس سے اوپر کا کوئی عدد درج کرلیں' فقرہ اپنی جگہ پھر بھی صحیح اور بے غبار رہے گا۔"

میرے "بزرگوار محترم" مطمئن ہیں کہ اپنے اس "مشفقانہ" مشورے کے بعد انہوں نے میرے اعتراض کا جواب دیدیا ہے' چنانچہ آگے وہ دوسری غیر متعلق بات شروع کر دیتے ہیں' اب اگر کوئی "بے ادب" یہ سوال کرنے لگے کہ رشوت جھوٹ' مکر و فریب' صلحاء کے قتل' اجراء بدعت' مال غنیمت میں خرد برد' جھوٹی گواہی' جھوٹی نسبت اور اس جیسے بہت سے گناہوں کو "پالیسی" بنالینے والا فاسق کیوں نہیں ہوتا؟ تو یہ اس کی صریح نالائقی اور قرب قیامت کی علامت ہے کہ وہ بزرگوں کی بات کیوں بے چون وچرا نہیں مانتا؟

حضرت معاویہؓ اور فسق و بغاوت

ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا مودودی نے تو فسق یا فاسق کے الفاظ امیر معاویہؓ کے حق میں استعمال نہیں کئے لیکن آپ چاہیں تو میں اہل سنت کے چوٹی کے علماء کی نشان دہی کرسکتا ہوں جنہوں نے یہ الفاظ بھی کہے ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے اہل سنت کے دو عالموں کی عبارتیں پیش کی ہیں' ایک حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی ہے' اور دوسری میر سید شریف جرجانیؒ کی' ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کو بھی رفع کیا جائے جو ان عبارتوں کے نقل کرنے سے پیدا کی گئی ہے' حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی عبارت یہ ہے جس میں وہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں جنگ صفین وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پس نہایت کارش این است کہ مرتکب کبیرہ و باغی باشد و الفاسق لیس باھل اللعن"

(فتاوی عزیزی۔ رحیمیہ دیوبند ص ۱۷۷)

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں شاہ صاحبؒ اصل میں اس مسئلہ پر گفتگو فرمارہے ہیں کہ حضرت معاویہؓ پر لعن طعن جائز نہیں' اس ذیل میں وہ کہتے ہیں کہ "ان کے

بارے میں انتہائی بات یہ ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی ہوں' اور فاسق لعنت کے لائق نہیں ہوتا" اس میں وہ اپنا مسلک بیان نہیں کر رہے کہ معاذ اللہ وہ واقعۃً باغی اور فاسق تھے' بلکہ علی سبیل التسلیم یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر انہیں فاسق بھی مان لیا جائے تب بھی ان پر لعن طعن جائز نہیں۔ دوسرے واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں اس مسئلہ سے متعلق اپنی جو آراء ظاہر کی ہیں وہ بڑی حد تک پیچیدہ' مجمل اور بظاہر نظر متضاد معلوم ہوتی ہیں' اور جب تک اس مسئلے میں ان کی مختلف عبارتیں سامنے نہ ہوں اس وقت تک ان کی مراد کو ٹھیک ٹھیک سمجھا نہیں جا سکتا' میں سمجھتا ہوں کہ ان کے صحیح منشاء کو سمجھنے کے لئے تحفہ اثنا عشریہ کی مندرجہ ذیل عبارت بڑی حد تک مفید ہوگی:

"اب حضرت مرتضٰی سے لڑنے والا اگر ازراہ بغض و عداوت لڑتا ہے تو یہ علمائے اہل سنت کے نزدیک بھی کافر ہے' اس پر سب کا اجماع ہے..... اور شبہ فاسدہ اور تاویل باطل کی بناء پر' نہ نیت عداوت و بغض سے' حضرت سے لڑنے والا مثلاً اصحاب جمل اور اصحاب صفین تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلان اعتقادی میں مشترک ہیں' فرق اتنا ہے کہ اصحاب جمل کی یہ خطائے اجتہادی اور فسق اعتقادی تحقیر کو جائز نہیں کرتا (اسکی وجوہ بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں) مثلاً حضرت موسیٰؑ کی عصمت و علو مرتبہ پر جو نصوص قرآنیہ قطعیہ وارد ہیں وہ اس عمل پر آپ پر طعن کرنے یا آپکی تحقیر کرنے سے مانع ہوئیں جو آپ کے بھائی کے بارے میں آپ سے سرزد ہوا' صرف بے تالی اور عجلت کی بناء پر' ورنہ یہ سب کچھ للہ فی اللہ تھا' نہ شیطان کے وسوسہ سے' حاشا جنابہ من ذلک۔

اور اصحاب صفین کے بارے میں چونکہ یہ امور بالقطع ثابت نہیں ہیں اس لئے توقف و سکوت لازمی ہے' ان آیات و احادیث کے عموم پر نظر رکھتے ہوئے جو فضائل صحابہ میں وارد ہیں' بلکہ تمام مؤمنین کے فضائل میں ان کی نجات اور انکی شفاعت کی امید پروردگار سے رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں' اگر جماعت اہل شام میں سے ہم بالیقین کسی کے متعلق جان لیں کہ وہ حضرت امیر (علیؓ) کے ساتھ عداوت و بغض رکھتا تھا'

تا آنکہ آپکو کافر ٹھہراتا' یا آنجناب علی قباب پر سبّ وطعن کرتا تو اس کو ہم یقیناً کافر جانیں گے۔ جب یہ بات معتبر روایات سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی اور ان کا اصل ایمان بالیقین ثابت ہے تو ہم تمسک اصل ایمان سے کریں گے[1]"

اس عبارت میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اصحاب جمل و اصحاب صفین کے بارے میں بیک وقت "خطائے اجتہادی" کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور "فسق اعتقادی" کا بھی' بظاہر نظر اس میں تضاد معلوم ہوتا ہے' لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ عبارت اور اس نوع کی بعض دوسری عبارتیں بنظر غائر پڑھنے کے بعد میں ان کا موقف یہ سمجھا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت چونکہ نہایت مضبوط دلائل سے منعقد ہو چکی تھی اس لئے حضرت عائشہؓ یا حضرت معاویہؓ کا ان کے خلاف قتال کرنا بلاشبہ غلط تھا' اور دنیوی احکام کے اعتبار سے بغاوت کے ذیل میں آتا تھا جو نفس الامر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ یعنی فسق ہے' اسی لئے حضرت علیؓ کا ان سے جنگ لڑنا جائز اور برحق تھا' لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں' بلکہ شبہ اور تاویل کی بناء پر صادر ہوا تھا' اور بہرحال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر مبنی سہی' لیکن دیانت دارانہ تھے' اس لئے اخروی احکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے' اسی لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے مار دینا اور پھر اسے کھانا دلائل قطعیہ کی بناء پر گناہ کبیرہ ہے' لیکن امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا' اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائل شرعیہ کی رو سے گناہ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بنیاد پر صادر ہوا' اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا' اسی طرح کسی امام برحق کے

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ ص ۶۱۳ مطبوعہ ولی محمد اینڈ سنز کراچی: اس عبارت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ پر سبّ وطعن کرنا معتبر روایات سے ثابت نہیں۔

خلاف بغاوت کرنا گناہ کبیرہ اور فسق ہے' لیکن جیسا کہ ہم نے حضرت حجر بن عدیؓ کے مسئلے میں علامہ ابن قدامہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے' اگر کوئی شخص جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے اپنے دیانتدارانہ اجتہاد کی رو سے اسے جائز سمجھتا ہو' تو اس کی بنا پر وہ فاسق نہیں ہوتا' بلکہ اسکی غلطی کو خطائے اجتہادی کہا جاتا ہے۔

میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تحریروں پر جتنا غور کیا ہے' میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے خروج کے لئے جو فسق اعتقادی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ بغاوت فی نفسہ فسق ہے' لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اس کی بناء پر (معاذاللہ) یہ حضرات فاسق ہو گئے' بلکہ چونکہ ان کی جانب سے اس فعل کا صدور نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد کی بنیاد پر ہوا' اور یہ حضرات اجتہاد کے اہل بھی تھے' اور اپنے موقف کی ایک بنیاد رکھتے تھے' اس لئے یہ انکی اجتہادی غلطی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ کا منشاء یہ ہوتا کہ وہ واقعۃً حضرت معاویہؓ یا حضرت عائشہؓ کو (معاذاللہ) اس خروج کی بنا پر فاسق قرار دیں' جیسا کہ ملک غلام صاحب نے سمجھا ہے تو پھر وہ اپنی مذکورہ عبارت میں اسے "خطائے اجتہادی" سے کیوں تعبیر کرتے ہیں؟

اور میرے نزدیک یہی مراد ان "کثیر من اصحابنا" کی بھی ہے جن کا قول میر سید شریف جرجانیؒ نے شرح مواقف میں نقل کیا ہے' کیونکہ انہوں نے تفسیق کی نسبت خطا کی طرف کی ہے' حضرت معاویہؓ کی طرف نہیں اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ کسی فعل کا فسق ہونا اس کے فاعل کے فاسق ہونے کو مستلزم نہیں ہے' اجتہادی اختلاف میں ایک شخص کا عمل دوسرے کے نظریہ کے مطابق فسق ہوتا ہے' لیکن اسے فاسق نہیں کہا جاتا' جیسے ذبیحہ کی مثال میں عرض کیا جاچکا ہے' ورنہ اگر یہ بات مراد نہیں ہے تو میر سید شریف رحمۃ اللہ تو کثیر من اصحابنا کہہ رہے ہیں' کوئی شخص اہل سنت کے کسی ایک عالم کا قول کہیں دکھلائے جس نے حضرت معاویہؓ یا حضرت عائشہؓ کو جنگ صفین و جمل کی بناء پر فاسق قرار دیا ہو۔

اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے' اور ان کا منشاء یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ' حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ جیسے صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ سے محاربہ کرنے کی بناء پر (معاذاللہ) فاسق ہو گئے تھے' تو انکی یہ بات بلاشک وشبہ غلط اور جمہور امت مسلمہ کے مسلمات کے قطعی خلاف ہے' میں اپنے سابقہ مضمون کے آخر میں حوالوں کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ ساری

امت از اول تا آخر ان حضرات کی اس غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دیتی آئی ہے' اہل سنت کی عقائد و کلام کی کتابیں ان تصریحات سے بھری ہوئی ہیں' اور ان میں سے کسی نے بھی اس بناء پر ان حضرات کو فاسق قرار دینے کی جرأت نہیں کی' اگر بفرض محال شاہ عبدالعزیزؒ یا میر سید شریف جرجانیؒ واقعتہً اس کے خلاف کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں تو جمہور امت کے مقابلے میں انکا قول ہرگز مقبول نہیں ہوگا۔

جنگ صفین کے فریقین کی صحیح حیثیت

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ سے جو جنگیں لڑیں' ان سے حضرت علیؓ سے زیادہ کون متاثر ہو سکتا ہے' لیکن بزعم خود حضرت علیؓ سے محبت رکھنے والے غور سے سنیں کہ وہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے شارح مواقف کی سخت تردید کی ہے۔ (مکتوب ۲۵۱ ص ۶۷ ج ۲ لاہور)

حضرت اسحٰق بن راہویہؒ حدیث و فقہ کے مشہور امام ہیں' وہ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:

> سمع علیؓ یوم الجمل و یوم الصفین رجلاً یغلوفی القول فقال لا تقولوا الا خیرا انما ھم قوم زعموا انا بغینا علیھم و زعمنا انھم بغوا علینا فقاتلنا ھم
>
> حضرت علیؓ نے جنگ جمل و صفین کے موقع پر ایک شخص کو سنا کہ وہ (مقابل لشکر والوں کے حق میں) تشدد آمیز باتیں کہہ رہا ہے' اس پر آپ نے فرمایا کہ ان حضرات کے بارے میں کلمۂ خیر کے سوا کوئی بات نہ کہو' دراصل ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے' اس بناء پر ہم ان سے لڑتے ہیں۔[1]

---

[1] ابن تیمیہؒ: منہاج السنۃ ص ۶۱ ج ۳ بولاق مصر ۱۳۲۲ھ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس قول میں

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

اور علامہ ابن خلدونؒ وغیرہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں قتل ہونے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت علیؓ نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لا یموتن احد من ھٰؤلاء وقلبہ نقی الا دخل الجنۃ [۱]

ان میں سے جو شخص بھی صفائی قلب کے ساتھ مرا ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

حضرت علیؓ کے ان ارشادات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خود ان کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ سے انکا اختلاف اجتہادی اختلاف تھا' اور وہ نہ صرف یہ کہ انہیں اس بناء پر فاسق نہیں سمجھتے تھے' بلکہ ان کے حق میں کلمات خیر کے سوا کسی بات کے روادار نہ تھے' دوسری طرف حضرت معاویہؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ "علیؓ مجھ سے بہتر اور مجھ سے افضل ہیں اور میرا ان سے اختلاف صرف حضرت عثمانؓ کے قصاص کے مسئلہ میں ہے' اور اگر وہ خون عثمان کا قصاص لے لیں تو اہل شام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا سب سے پہلے میں ہونگا۔[۲]" اسی طرح جب قیصر روم مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو ؓیہ اسے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کرلونگا' پھر تمہارے خلاف انکا جو لشکر روانہ ہوگا اس کے ہراول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا دوں گا اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح اکھاڑ پھینکوں گا۔"[۳]

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ لیسوا کفرۃ ولا فسقۃ (یہ نہ کافر ہیں اور نہ فاسق) مکتوبات' مکتوب ۹۶ ص ۱۱۰ ج ۷

حاشیہ صفحہ ہذا

[۱] ابن خلدونؒ: مقدمہ ص ۳۸۵' فصل ۳۰' دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ء

[۲] ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۲۹ ج ۷ و ص ۲۵۹ ج ۸

[۳] الزبیدیؒ: تاج العروس' ص ۲۰۸ ج ۷' دار لیبیا بنغازی "مطقلین"

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات صحابہؓ کی یہ باہمی لڑائیاں اقتدار کی خاطر نہیں تھیں، اور نہ ان کا اختلاف آج کی سیاسی پارٹیوں کا سا اختلاف تھا، دونوں فریق دین ہی کی سربلندی چاہتے تھے، ہر ایک کا دوسرے سے نزاع دین ہی کے تحفظ کے لئے تھا، اور یہ خود ایک دوسرے کے بارہ میں بھی یہی جانتے اور سمجھتے تھے کہ ان کا موقف دیانتدارانہ اجتہاد پر مبنی ہے، چنانچہ ہر فریق دوسرے کو رائے اور اجتہاد میں غلطی پر سمجھتا تھا، لیکن کسی کو فاسق قرار نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاید دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہی جنگ ہو جس میں دن کے وقت فریقین میں جنگ ہوتی اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دوسرے لشکر میں جا کر انکے مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا کرتے تھے۔ [1]

اور خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی طرف رجوع کر کے آپؐ کے ارشادات میں یہ بات تلاش کیجئے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ آپؐ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتی تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدد احادیث میں اس جنگ کی طرف اشارے دیئے ہیں، اور ان سے صاف یہ معلوم ہوتا کہ آپؐ اس جنگ کو اجتہاد پر مبنی قرار دے رہے ہیں۔

صحیح مسلم اور مسند احمدؒ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدد صحیح سندوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

> تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين تقتلهم اولى الطائفتين بالحق [2]
>
> مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے وقت ایک گروہ (امت سے) نکل جائے گا اور اس کو وہ گروہ قتل کرے گا جو مسلمانوں کے دونوں گروہوں میں حق سے زیادہ قریب ہو گا۔

اس حدیث میں امت سے نکل جانے والے فرقہ سے مراد باتفاق خوارج ہیں، انہیں

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۷۷ ج ۷۔ اس قسم کے مزید ایمان افروز واقعات کے لئے دیکھئے تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۷۴ ج ۱

[2] ایضاً ص ۲۷۸ ج ۷

حضرت علیؓ کی جماعت نے قتل کیا جن کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اولی الطائفتین بالحق (دو گروہوں میں حق سے زیادہ قریب) فرمایا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف کھلا حق و باطل کا اختلاف نہیں ہوگا' بلکہ اجتہاد اور رائے کی دونوں جانب گنجائش ہو سکتی ہے' البتہ حضرت علیؓ کی جماعت حق سے نسبتاً زیادہ قریب ہوگی' اگر آپؐ کی مراد یہ نہ ہوتی تو حضرت علیؓ کی جماعت کو "حق سے زیادہ قریب" کے بجائے محض "برحق جماعت" کہا جاتا۔

اسی طرح صحیح بخاری' "صحیح مسلم" اور حدیث کی متعدد کتابوں میں نہایت مضبوط سند کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تقوم الساعة حتی تقتتل فئتان عظیمتان تکون بینهما مقتلة عظیمة دعواهما واحدة

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ (مسلمانوں کی) دو عظیم جماعتیں آپس میں قتال نہ کریں' انکے درمیان زبردست خونریزی ہوگی حالانکہ دونوں کی دعوت ایک ہوگی۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں دو عظیم جماعتوں سے مراد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جماعتیں ہیں[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی دعوت کو ایک قرار دیا ہے' جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے بھی پیش نظر طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ دونوں اسلام ہی کی دعوت کو لے کر کھڑی ہوئی تھیں' اور اپنی اپنی رائے کے مطابق دین ہی کی بھلائی چاہتی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر صحابہ کی ایک بڑی جماعت پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ حق کس جانب ہے' اس لئے وہ مکمل طور پر غیر جانبدار رہے' بلکہ امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا تو کہنا یہ ہے کہ صحابہؓ کی اکثریت اس جنگ میں شریک نہیں تھی' امام احمدؒ نے نہایت صحیح سند کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

هاجت الفتنة واصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم

---

[1] نوویؒ: شرح مسلم' ص ۳۹۰ ج ۲' اصح المطابع کراچی۔

عشرات الالوف فلم یحضرھا منھم مائۃ بل لم یبلغوا ثلاثین[1]

جس وقت فتنہ برپا ہوا تو صحابہ کرامؓ دسیوں ہزار کی تعداد میں موجود تھے' لیکن ان میں سے سو بھی اس میں شریک نہیں ہوئے' بلکہ صحابہؓ میں سے شرکاء کی تعداد تیس تک بھی نہیں پہنچی۔

نیز امام احمدؒ ہی روایت کرتے ہیں کہ امام شعبہؒ کے سامنے کسی نے کہا کہ ابو شیبہ نے حکم کی طرف منسوب کر کے عبدالرحمان بن ابی لیلیٰؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جنگ صفین میں ستر بدری صحابہؓ شامل تھے' حضرت شعبہؒ نے فرمایا کہ ابو شیبہ نے جھوٹ کہا' خدا کی قسم اس معاملہ میں میرا اور حکم کا مذاکرہ ہوا تھا تو ہم اس نتیجے میں پہنچے کہ صفین کی جنگ میں بدری صحابہ میں سے سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کوئی شریک نہیں ہوا۔

(منہاج السنۃ بحوالہ بالا)

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ کا موقف صراحۃً باطل اور معاذ اللہ "فسق" تھا تو صحابہؓ کی اتنی بڑی تعداد نے کھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اگر وہ صراحۃً بر سرِ بغاوت تھے تو قرآن کریم کا یہ حکم کھلا ہوا تھا کہ ان سے قتال کیا جائے' پھر صحابہؓ کی اکثریت نے اس قرآنی حکم کو کیوں پس پشت ڈال دیا؟ حضرت ابن کثیرؒ نے بھی مذکورہ دو حدیثیں اپنی تاریخ میں نقل کر کے لکھا ہے:

وفیہ ان اصحاب علیؓ ادنی الطائفتین الی الحق وھذا ھو منھب اھل السنۃ والجماعۃ ان علیاً ھو المصیب وان کان معاویۃؓ مجتھداً وھو ما جور ان شاء اللہ[2]

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ کے اصحاب دونوں جماعتوں میں حق سے زیادہ قریب تھے' اور یہی اہل سنت والجماعۃ کا مسلک ہے کہ حضرت علیؓ برحق تھے' اگرچہ حضرت معاویہؓ مجتہد تھے' اور انشاء اللہ اس اجتہاد پر انہیں بھی ثواب ملے گا۔

---

[1] ابن تیمیہؒ اس روایت کی سند نقل کر کے لکھتے ہیں: ھذا الاسناد اصح اسناد علی وجہ الارض (یہ سند روئے زمین پر صحیح ترین سند ہے) منہاج السنۃ ص ۱۸۶ ج ۳

[2] البدایہ والنہایہ ص ۲۷۹ ج ۷

شیخ الاسلام محی الدین نووی رحمتہ اللہ علیہ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کتنے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

منهب اهل السنة والحق احسان الظن بهم والامساک عما شجر بينهم وتاويل قتالهم وانهم مجتهدون متاولون لم يقصدوا معصية ولا محض الدنيا بل اعتقد كل فريق انه المحق و مخالفه باغ فوجب عليه قتاله ليرجع الى امر الله وكان بعضهم مصيبا وبعضهم مخطئا معذورا فى الخطا لانه باجتهاد والمجتهد اذا اخطا لا اثم عليه وكان على رضى الله عنه هو المحق المصيب فى ذلك الحروب هذا منهب اهل السنة وكانت القضايا مشتبهة حتى ان جماعة من الصحابة تحيروا فيها فاعتزلوا الطائفتين ولم يقاتلوا ولو تيقنوا الصواب لم يتاخروا عن مساعدته [1]

"اہل سنت اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے' انکے باہمی اختلافات کے بارے میں توقف کیا جائے' اور انکی لڑائیوں کی صحیح توجیہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ مجتہد اور متاول تھے' انہوں نے نہ گناہ کا قصد کیا اور نہ محض دنیا کا' بلکہ ہر فریق کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ حق پر ہے اور اس کا مخالف بر سر بغاوت' اس لئے اس سے قتال کرنا اس پر واجب ہے تاکہ اللہ کے احکام کی طرف لوٹ آئے' ان میں سے بعض کی رائے واقعتہً صحیح تھی' اور بعض کی غلط' لیکن چونکہ یہ غلط رائے بھی اجتہاد کی وجہ سے قائم ہوئی تھی اور مجتہد اگر غلطی بھی کرے تو اس پر گناہ نہیں ہوتا اس لئے جن لوگوں کی رائے غلط تھی وہ بھی معذور تھے اور جنگوں میں حضرت علیؓ کا اجتہاد واقعتہً درست تھا' یہ اہل سنت کا مذہب ہے' اور اس وقت حق اتنا مشتبہ اور غیر واضح تھا کہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور غیر جانبدار رہ کر لڑائی میں

[1] نوویؒ شرح مسلمؒ ص ۳۹۰' ج ۲

شریک نہ ہوئی، حالانکہ اگر ان حضرات صحابہؓ کے سامنے اس وقت حق یقینی طور پر واضح ہو جاتا تو وہ اس کی نصرت سے پیچھے نہ رہتے۔"

یہ ہے اہل سنت کا صحیح موقف جو قرآن و سنت کے مضبوط دلائل، صحیح روایات اور صحابہ کرامؓ کی مجموعی سیرتوں پر مبنی ہے، اب اگر ان تمام روشن دلائل، قوی احادیث اور ائمہ اہل سنت کے واضح ارشادات کے علی الرغم کسی کا دل ہشام، کلبی اور ابو مخنف جیسے لوگوں کے بیان کئے ہوئے افسانوں ہی پر فریفتہ ہے، اور وہ ان کی بناء پر حضرت معاویہؓ کو موردِ الزام ٹھہرانے اور گناہ گار ثابت کرنے پر ہی مصر ہے تو اس کے لئے ہدایت کی دعا کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ جس شخص کو سورج کی روشنی کے بجائے اندھیرا ہی اچھا لگتا ہو تو اس ذوق کا علاج کس کے پاس ہے؟ لیکن ایسا کرنے والے کو خوب اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ پھر معاملہ صرف حضرت معاویہؓ ہی کا نہیں ہے، ان کے ساتھ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ پر بھی (معاذ اللہ) فسق کا الزام عائد کرنا ہوگا، اور پھر اجلہ صحابہؓ کی وہ عظیم الشان جماعت بھی اس ناوک تفسیق سے نہیں بچ سکتی جس نے (نعوذ باللہ) ان حضرات کو کھلے فسق کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا، امت اسلامیہ کے ساتھ اس صریح دھاندلی کا کھلی آنکھوں نظارہ کیا، اور حضرت علیؓ کو جو اس دھاندلی کے خلاف جہاد کر رہے تھے، بے یار و مددگار چھوڑ کر گوشہ عافیت کو اختیار کر لیا لہٰذا عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ اور باقی اجلہ صحابہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت مسلمہ بن مخلدؓ اور حضرت فضالہ بن عبیدؓ جیسے حضرات کے لئے بھی یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ کر باطل کے ہاتھ مضبوط کئے اور امام برحق کی اطاعت کو چھوڑ کر فسق کا ارتکاب کیا۔

اگر کوئی شخص یہ تمام باتیں تسلیم کرنے کو تیار ہے تو وہ حضرت معاویہؓ کو بھی فاسق قرار دے لیکن پھر اسے پردے میں رکھ کر بات کرنے کے بجائے جرأت کے ساتھ کھل کر ان تمام باتوں کا اقرار کرنا چاہیئے اور واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہیئے کہ صحابہؓ کے بارے میں تعظیم و تقدیس کے عقائد ان کی افضلیت کے دعوے، ان کے حق میں خیر القرون کے خطابات

سب ڈھونگ ہیں' ورنہ عملاً ان میں اور آج کے دنیا پرست سیاستدانوں میں شمہ برابر کوئی فرق نہیں تھا۔

آخر میں میں ملک غلام علی صاحب کے ایک اور سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں' میں نے لکھا تھا کہ اگر صحابہ کرامؓ کو عام عملی زندگی میں فاسق قرار دے دیا جائے تو دین کے سارے عقائد واحکام خطرے میں پڑجائیں گے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث ہمیں انہی کی واسطہ سے پہنچی ہیں' اور اگر وہ عملی زندگی میں فاسق ہوسکتے ہیں تو پھر روایت حدیث کے معاملہ میں انہیں فرشتہ تسلیم کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اسکے جواب میں جناب غلام علی صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں :

"روایت حدیث اور تبلیغ دین کے لئے عدالت کا جو معیار آپ صحابہ کرام کے لئے وضع فرمارہے ہیں کیا اس کو آپ پورے سلسلۂ رواۃ پر نافذ اور چسپاں کریں گے؟"

ملک صاحب نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے لکھی ہے جیسے روایات کے ردو قبول کے قواعد آج ہم پہلی بار مدون کرنے بیٹھے ہیں' اور ہمارے اختیار میں ہے کہ اس معاملے میں جو اصول چاہیں مقرر کرلیں' میں عرض کرچکا ہوں کہ عدالت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فاسق نہ ہو' یہ بات اس کی روایت قبول کرنے کے لئے لازمی شرط ہے' یہ شرط آج میں نے اپنی جانب سے نہیں گھڑدی ہے' اصول حدیث کی جو کتاب چاہیں کھول کر دیکھ لیجئے اس میں یہ شرط لکھی ہوئی ملے گی اور چودہ سو سال سے اسی شرط کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے' اب صحابہ کرامؓ کے بارے میں چونکہ امت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی فاسق نہیں تھا بلکہ ان میں سے ہر فرد عادل ہے' اس لئے انکی تمام روایات مقبول ہیں' اس کے برخلاف دوسرے رواۃ حدیث کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سب عادل تھے' اس لئے انکی ہر روایت مقبول نہیں' بلکہ ان میں سے ہر راوی کے حالات کی تحقیق کرکے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ عادل تھا یا نہیں؟ اگر وہ عادل ہو تو اسکی روایت قبول کی جائے گی' اور اگر فاسق ہو تو اسے رد کردیا جائے گا' لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں' وہ چونکہ سب کے سب بلا استثناء عادل ہیں' اس لئے ان کی ہر روایت مقبول ہے' ان کی عدالت کو مجروح کرکے انکی بیان کردہ حدیث کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اب اگر کوئی شخص صحابہؓ کی عدالت پر طعن کرکے انہیں فاسق قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان روایات کو بھی مشتبہ بنا رہا ہے جو ان سے مروی ہیں اور جنہیں امت نے غیر مشتبہ سمجھ کر ان پر بہت سے احکام و مسائل کی عمارت کھڑی کردی ہے۔

دوسرے راویانِ حدیث کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کے ایک ایک قول و فعل کو جانچ کر دیکھا گیا ہے کہ وہ عدالت کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ اور جو اس معیار پر پورا نہیں اترا اس کی روایات کو رد کردیا گیا ہے' لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ عقیدہ مسلم رہا ہے کہ وہ عدالت کے معیار بلند پر فائز ہیں' لہٰذا انکی ہر روایت قابل اعتماد سمجھی گئی ہے' اب اگر کوئی شخص اس عقیدے میں خلل اندازی کرے تو وہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ایک ایک صحابی کے نجی حالاتِ زندگی کی از سر نو تحقیق کرکے یہ طے کیا جائے کہ جو روایتیں اس نے بیان کی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ آپ خود فیصلہ کرلیجئے کہ یہ اقدام دین کی ساری عمارت کو متزلزل کرنے کے مترادف ہے یا نہیں؟

ملک صاحب میری اس دلیل کو تو "عجیب و غریب استدلال" فرماتے ہیں' اور لکھتے ہیں کہ اس میں "مغالطے مضمر ہیں" لیکن حضرت علیؓ سے امیدواری خلافت کا اعتراض دور کرتے ہوئے جو کچھ مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے' اس کے بارے میں نہ جانے ان کا کیا خیال ہوگا؟ مولانا لکھتے ہیں:

> "کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیتؓ اور ان کے اصحاب کبارؓ کی' کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بانیان سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبر خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم' صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق' یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوتے تھے؟..... تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے' تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں' مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا' قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا' اور تقدس کی ساری داستانیں ریاکاری کی داستانیں تھیں..... ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کونسی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ

کے اہل بیت و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے' اگر
پہلی تصویر پر کسی کا دل ریجھتا ہو تو ریجھے۔ مگر اس کے ساتھ ایک امید
واری اور دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں' پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل
طلب ہو جائے گا" [1]

سوال یہ ہے کہ اگر تاریخ کے صفحات حضرت علیؓ کی سیرت پر امیدواری خلافت کا داغ لگا دیتے ہیں تو اس سے تو پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جاتا ہے' رسالت کا دعوی محض ایک "ڈھونگ" بن جاتا ہے' قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہیں رہتا' اور تقدس کی ساری داستانیں ریاکاری کی داستانیں ہو جاتی ہیں' لیکن حضرت عثمانؓ' حضرت معاویہؓ' حضرت عمرو بن عاصؓ' حضرت مغیرہ بن شعبہؓ' حضرت عائشہؓ' حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت عبادہ بن صامتؓ' حضرت ابو سعید خدریؓ' حضرت سعد بن ابی وقاصؓ' حضرت سعد بن زیدؓ' حضرت عبداللہ بن عمرؓ' حضرت اسامہؓ اور ان جیسے دوسرے بہت سے حضرات کی سیرت پر کتنے ہی داغ لگتے رہیں' ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کبار کی کیسی ہی بھیانک تصویر بنتی رہے' اس سے دین و ایمان کا کوئی مسئلہ حل طلب نہیں ہوتا؟ جو استدلال حضرت علیؓ کے بارے میں کیا گیا تھا وہی استدلال ان حضرات صحابہؓ کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے تو وہ "عجیب و غریب" بن جاتا ہے' اور اس میں "مغالطے مضمر" ہو جاتے ہیں۔ ع

تم ہی بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

عدالت صحابہؓ کی بحث کے دوران ملک صاحب نے لکھا ہے:

"البلاغ میں چونکہ یہ سوال خاص طور پر اٹھایا گیا ہے کہ کسی صحابی
یا کسی راوی کی جانب بدعت کے انتساب کے بعد اس کی بیان کردہ
حدیث کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے' اسلئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ
اس مسئلہ پر بھی مختصر بحث کر دوں"

اس کے بعد موصوف نے تقریباً آٹھ صفحات پر بحث کی ہے کہ راوی حدیث کے کسی

---

[1] رسائل و مسائل ص ۴۷ تا ۷۶: اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۵۱ء

قول و فعل پر بدعت کا اطلاق اس کی روایت میں کس حد تک قادح ہو سکتا ہے؟ لیکن میں حیران ہوں کہ جس سوال کو انہوں نے مجھ سے منسوب کر کے فرمایا ہے کہ اسے ابلاغ میں "خاص طور پر" اٹھایا گیا ہے' وہ میں نے کب اور کس جگہ لکھا ہے؟ میری ساری بحث تو فسق کے بارے میں تھی' یہ بحث تو میں نے کہیں بھی نہیں چھیڑی کہ مبتدع کی روایت کس حد تک قابل قبول ہے؟ چہ جائیکہ اس سوال کو "خاص طور پر" اٹھایا ہو۔ لیکن ملک صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ اس دعوے کو مجھ سے منسوب کر کے اس کی مفصل تردید بھی کر رہے ہیں' اور بیچ میں طنز و تعریض بھی فرما رہے ہیں' آپ ہی بتائیے کہ میں جواب میں اس کے سوا کیا عرض کروں کہ۔

وہ بات میرے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بڑی ناگوار گذری ہے

آخری گذارش

ترجمان القرآن میں تیرہ ماہ تک مسلسل اس موضوع پر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد ملک صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اتحاد کی دعوت بھی دی ہے' اور مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی خدمات گناتے ہوئے لکھا ہے کہ "اگر اب بھی ہم نے باہمی خانہ جنگی جاری رکھی اور ہر اختلافی مسئلہ میں ایک دوسرے کو توہین اسلام کا مرتکب قرار دیا تو اس کا فائدہ اعدائے اسلام ہی کو پہنچے گا۔"

اس نیک جذبے کی پوری قدر دانی کے ساتھ میں یہ ضرور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب کے نظریات سے اختلاف' یا اس پر علمی تنقید کونسی لغت کی رو سے "خانہ جنگی" کی تعریف میں داخل ہے؟ اور کیا "خانہ جنگی" سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کے تمام نظریات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے؟ وہ جس موقع پر' جس زمانے میں' جو چاہیں تحریر فرماتے رہیں' خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو' خواہ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوتا ہو یا غلط فہمیاں پھیلتی ہوں' لیکن انکی تحریریں پڑھنے والے کا کام صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان پر بلا مطالبہ دلیل ایمان لے آئے؟ وہ صحابہ کرامؓ تنقیص کی حد تک تنقید فرمائیں تو اسے "علمی ضرورت" کا نام دیا جائے لیکن کوئی شخص خود

مولانا مودودی کے نظریات پر تنقید کے لئے خالص علمی انداز میں بھی زبان کھولے تو "خانہ جنگی" کا مجرم قرار پائے۔

اگر اتحاد و اتفاق کا مفہوم یہی کچھ ہے کہ "منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو ورنہ چپ رہو[1]" تو ملک صاحب خود انصاف کے ساتھ غور فرمالیں کہ یہ "اتحاد و اتفاق" کبھی قائم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مولانا مودودی صاحب نے مغربی افکار و نظریات کے مقابلے میں جو کام کیا ہے، وہ بلاشبہ قابل تعریف اور قابل قدر ہے اس شعبے میں ان کی خدمات کو ان سے اختلاف رکھنے والے بھی سراہتے ہیں، اور ہم نے بھی اس کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا، لیکن کاش! کہ مولانا اپنے دائرہ عمل کو اسی حد تک محدود رکھتے، اور اسلام کے بلند مقاصد کی خاطر اس نازک دور میں وہ مسائل نہ چھیڑتے جنہوں نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی، اگر ان کا قلم حجاج کی تلوار کی طرح کفر والحاد کے ساتھ اسلام کے ستونوں کو بھی اپنا ہدف نہ بنالیتا تو علماء یا عام مسلمانوں کو ان سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی، یہی علماء اور یہی عام مسلمان جو آج "مودودی" کے نام سے بدکتے ہیں، ان کے دست و بازو بن کر کفر والحاد کے سیلاب کا یک جہتی کے ساتھ مقابلہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جس شدومد کی ساتھ مغربی الحاد کا مقابلہ کیا، اسی تندی اور تیزی کے ساتھ اپنے قلم کا رخ تاریخ اسلام کی ان شخصیتوں کی طرف بھی پھیر دیا جو امت مسلمہ کے عمائد ہیں اور جن کے بارے میں مسلمانوں کا ضمیر انتہائی حساس واقع ہوا ہے۔

میرا انتہائی دردمندانہ التماس ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور انکے رفقاء جماعت خدا کے لئے کبھی اس بات پر بھی ٹھنڈے دل اور سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں کہ اس وقت اہل سنت ان مکاتب فکر کے مجموعہ سے عبارت ہے جو دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کے ناموں سے معروف ہیں، ان میں سے کوئی مکتب فکر ایسا نہیں ہے جو مولانا مودودی صاحب کے ان نظریات سے بیزار نہ ہو، سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے کے سارے مسلمان عقل و خرد سے بالکل خالی ہیں؟ یا ان سے انصاف و دیانت بالکل اٹھ گئی ہے؟ یا یہ سب کے سب

---

[1] یہ الفاظ مولانا مودودی صاحب نے دور ملوکیت کے خصائص میں ذکر کئے ہیں اور حضرت معاویہؓ پر ان کو چسپاں کیا ہے۔

حاسد اور کینہ پرور ہیں؟ کہ خواہ مخواہ مولانا کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟۔۔۔ آخر کوئی تو بات ہے جس سے ان مکاتب فکر کے سنجیدہ، صاحب بصیرت اور علمی مزاج رکھنے والے لوگوں کے دل بھی مجروح ہوئے ہیں اور جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں جو اس نازک دور میں فرقہ وارانہ مباحث چھیڑنے سے ہمیشہ پرہیز کرتے رہے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کے جن نظریات سے ان سارے مکاتب فکر میں کبیدگی پیدا ہوئی اور جن سے ملک کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ مباحث کا در کھل گیا، تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ وہ سو فیصد حق ہیں، لیکن کیا اس "حق" کا اظہار اسی وقت ضروری تھا جبکہ اسلامی صفوں میں معمولی سا انتشار دشمنوں کی پیش قدمی کو میلوں آگے بڑھا لاتا ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تھی کہ کعبہ کو از سر نو بنائے ابراہیمی پر تعمیر فرمائیں، یہ اقدام سو فیصد برحق تھا، لیکن آپؐ نے محض اس بناء پر اس نیک کام کو چھوڑ دیا کہ اس سے امت میں انتشار کا اندیشہ تھا۔ افسوس۔ اور نہایت افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جو اسلام کے بلند مقاصد کا پرچم لے کر چلے تھے، اس واضح حقیقت کو نہیں پہچانا کہ اگر وہ ان اختلافی مسائل کو نہ چھیڑتے تو ملّت کا نقشہ کیا ہوتا؟

پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ان کے رفقائے جماعت کا جو مزاج مجموعی طور پر تیار ہوا ہے، اس نے عملاً مولانا کے ایک ایک لفظ کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا ہے، ان میں سے اکثر حضرات جماعت اسلامی کے باہر سے مولانا پر تنقید کا ایک لفظ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، خواہ وہ کتنی دردمندی، کتنی سنجیدگی اور کتنی تہذیب و شائستگی کے ساتھ کی گئی ہو، عملاً وہ مولانا مودودی صاحب کو تنقید سے بالاتر ہی سمجھنے لگے ہیں، اور اس طرز عمل نے پوری جماعت کو عام مسلمانوں کی نگاہ میں ایک فرقہ بنا دیا ہے۔

اگر کوئی شخص امت کے عام مسلّمات کے خلاف کوئی تحریر شائع کرتا ہے تو اسے کم از کم اس کے لئے تو تیار رہنا چاہئے کہ جانب مخالف سے علمی اور تحقیقی انداز میں اس پر تنقید کی جائے، لیکن جماعت اسلامی کے بہت سے پُرجوش کارکنوں اور مولانا کے معتقدین کی طرف سے جو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں، انکا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کے کسی نظریئے کے خلاف زبان تنقید کھولنا ہی جرم ہے، اور بعض خطوط کو پڑھ کر تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ علمی تنقید لکھ کر (خدانخواستہ) میں نے دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھ دیا ہے۔ خود ملک

صاحب نے جن تیوروں کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مولانا سے اظہار اختلاف کے بعد میں ان لوگوں کی صف میں آگیا ہوں جن سے علمی مباحثہ نہیں 'لڑائی ضروری ہے۔ جو حضرات نظریاتی اختلاف کے مدلّل اظہار اور نزاع و جدال میں عملاً خود کوئی فرق نہ رکھتے ہوں 'حیرت ہے کہ انہیں دوسروں سے خانہ جنگی کی شکایت ہے۔

میری صاف گوئی 'مولانا 'ان کے معتقدین اور انکی جماعت کو ممکن ہے ناگوار ہو 'لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ باتیں دکھے ہوئے دل کے ساتھ خیر خواہی کے جذبے سے اس احساس کے تحت لکھی ہیں کہ ان کے مذکورہ طرز عمل سے امت کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے جس محنت جانفشانی اور خود اعتمادی کے ساتھ مغربی افکار کا مقابلہ کیا ہے 'خطرہ ہے کہ ان کا یہ طریق کار ان ساری خدمات کے اثر کو زائل نہ کردے۔ اگر آج بھی مولانا مودودی اور انکی جماعت نے اپنی سنگین غلطیوں کو محسوس نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا 'لیکن پانی کے سر سے گذر جانے کے بعد اس احساس کا کوئی فائدہ امت نہیں اٹھا سکے گی۔ کاش! کہ دردمندی سے نکلے ہوئے یہ کلمات ان میں سے کسی صاحب دل کے سینے میں اتر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے 'اسکی صحیح خدمت کی توفیق بخشے 'اور مسلمانوں کو باہمی نزاع و جدال کے فتنے سے بچا کر ان میں اتحاد و اتفاق پیدا فرمائے۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی

۱۴ شوال ۱۳۹۰ھ

حصہ سوم

حضرت معاویہؓ
شخصیت، کردار اور کارنامے

مولانا محمود اشرف عثمانی

حضرت معاویہؓ

شخصیت، کردار اور کارنامے

جلیل القدر صحابی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عالم اسلام کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے احسان سے یہ امت مسلمہ بکدوش نہیں ہو سکتی۔ آپ ان چند کبار صحابہؓ میں ہیں جن کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری اور حق تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ وحی کو لکھنے کا شرف حاصل ہے۔

پھر۔۔۔۔ آپ اسلامی دنیا کی وہ مظلوم ہستی ہیں جن کی خوبیوں اور ذاتی محاسن و کمالات کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کو چھپانے کی پیہم کوششیں کی گئیں' آپ پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے' آپ کے متعلق ایسی باتیں گھڑی گئیں اور ان کو پھیلایا گیا جن کا کسی عام صحابی سے تو در کنار کسی شریف انسان سے پایا جانا مشکل ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جس شدومد کے ساتھ پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کیا گیا' اس کی وجہ سے آپؓ کا وہ حسین ذاتی کردار نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے پیدا کیا تھا' نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا حضرت معاویہؓ کو بس جنگ صفین کے قائد کی حیثیت سے جانتی ہے جو حضرت علیؓ کے مقابلے کے لئے آئے تھے' لیکن وہ حضرت معاویہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منظورِ نظر تھے' جنہوں نے کئی سال تک آپؐ کے لئے کتابت وحی کے نازک فرائض انجام دیئے' آپؐ سے اپنے علم و عمل کے لئے بہترین دعائیں لیں' جنہوں نے حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ کے زمانے میں

اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا' جنہوں نے تاریخ اسلام میں سب سے پہلا بحری بیڑہ تیار کیا' اپنی عمر کا بہترین حصہ رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد میں گذارا' اور ہر بار ان کے دانت کھٹے کئے آج دنیا ان کو فراموش کر چکی ہے' لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ وہ ہیں جن کی حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ ہوئی تھی' لیکن قبرص' روڈس' صقلیہ اور سوڈان جیسے اہم ممالک کس نے فتح کئے؟ سالہا سال کے باہمی خلفشار کے بعد عالم اسلام کو پھر سے ایک جھنڈے تلے کس نے جمع کیا؟ جہاد کا جو فریضہ تقریباً متروک ہو چکا تھا اُسے از سر نو کس نے زندہ کیا؟ اور اپنے عہد حکومت میں نئے حالات کے مطابق شجاعت و جواں مردی' علم و عمل' حلم و بردباری' امانت و دیانت میں نظم و ضبط کی بہترین مثالیں کس نے قائم کیں؟ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو پروپیگنڈے کی غلیظ تہوں میں چھپ کر رہ گئی ہیں' اس مقالہ میں حضرت معاویہ کی زندگی کے انہی حسین پہلوؤں کو سامنے لانا مقصود ہے' یہ آپ کی مکمل سیرت نہیں' بلکہ آپ کی سیرت کے وہ گوشے ہیں' جو تاریخ کے ملبہ میں دب کر آج نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو رہے ہیں اور ان کے مطالعہ سے حضرت معاویہؓ کے کردار کی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو ہر لحاظ سے دلکش ہی دلکش ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس تصویر میں تاریخ اسلام کے اس عظیم کردار کی ایک دلآویز جھلک دیکھ سکیں گے۔

ابتدائی حالات

آپؓ عرب کے مشہور و معروف قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی شرافت و نجابت اور جود و سخا میں پورے عرب میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا' اس قبیلہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں آقائے دو جہاں مبعوث ہوئے۔ پھر قریش میں سے آپ اس نامور خاندان بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے جو نسبی و منصبی حیثیت سے بنو ہاشم کے بعد سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا۔

حضرت معاویہؓ کے والد ماجد' حضرت ابو سفیانؓ اسلام لانے سے قبل ہی اپنے خاندان میں ممتاز حیثیت کے مالک اور قبیلہ کے معزز سرداروں میں شمار ہوتے تھے' آپ فتح مکہ کے دن اسلام لائے' آپ کے اسلام لانے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت ہوئی اور آپؐ نے اعلان فرمایا:

"جو شخص بھی ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے امن دیا جائے گا۔"

اسلام لانے سے قبل زمانہ جاہلیت میں بھی آپ اعلیٰ صفات کے مالک اور اخلاق کریمانہ کے حامل تھے، علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

وکان رئیسا مطاعاً ذا مال جزیل

آپ اپنی قوم کے سردار تھے، آپ کے حکم کے اطاعت کی جاتی تھی اور آپ کا شمار مال دار لوگوں میں ہوتا تھا۔[1]

پھر آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے اور غزوۂ حنین اور غزوہ یرموک میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ ۳۱ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت معاویہؓ آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے، بعثت نبوی سے پانچ سال قبل آپ کی ولادت ہوئی۔[2] بچپن ہی سے آپ میں اولوالعزمی اور بڑائی کے آثار نمایاں تھے چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ نو عمر تھے آپؓ کے والد ابو سفیان نے آپ کی طرف دیکھا اور کہنے لگے:

میرا بیٹا بڑے سر والا ہے اور اس لائق ہے کہ اپنی قوم کا سردار بنے، آپ کی والدہ ہند نے یہ سنا تو کہنے لگیں:

"فقط اپنی قوم کا؟ میں اس کو روؤں اگر یہ پورے عالم عرب کی قیادت نہ کرے"[3]

اسی طرح ایک بار عرب کے ایک قیافہ شناس نے آپ کو چھٹ پنے کی حالت میں دیکھا تو بولا:

"میرا خیال ہے کہ یہ اپنی قوم کا سردار بنے گا۔"[4]

ماں باپ نے آپ کی تربیت خاص طور پر کی اور مختلف علوم وفنون سے آپ کو آراستہ کیا اور اس دور میں جبکہ لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا اور عرب پر جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی، آپ کا شمار ان چند گنے چنے لوگوں میں ہونے لگا جو علم وفن سے آراستہ تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

---

[1] ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۲۱ ج ۸ مطبوعہ مصر ۱۹۳۹ء

[2] ابن حجرؒ: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳ مطبوعہ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۹۳۹ء

[3] حوالہ مذکورہ بالا

[4] علامہ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۱۸ ج ۸ مطبوعہ مطبعۃ کردستان العلمیۃ مصر ۱۳۴۸ھ

اسلام

آپؓ ظاہری طور پر فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے مگر در حقیقت آپ اس سے قبل ہی اسلام قبول کر چکے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی بناء پر ظاہر نہ کیا تھا' مشہور مورخ واقدی کہتے ہیں: کہ آپؓ صلح حدیبیہ کے بعد ہی ایمان لے آئے تھے مگر آپ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور فتح مکہ کے دن ظاہر کیا۔ اپنے اسلام کو چھپائے رکھنے اور فتح مکہ کے موقع پر ظاہر کرنے کی وجہ خود حضرت معاویہؓ نے بیان کی۔ چنانچہ فاضل مورخ ابن سعد کا بیان ہے: کہ حضرت معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ "میں عمرۃ القضا سے پہلے اسلام لے آیا تھا' مگر مدینہ جانے سے ڈرتا تھا کیوں کہ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تم گئے تو ہم ضروری اخراجات زندگی دینا بھی بند کر دیں گے۔" اس عذر اور دوسری مجبوریوں کی بنا پر آپؓ نے اپنے والد کے ہمراہ فتح مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا۔ ؎ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بدر' احد' خندق' اور غزوۂ حدیبیہ میں آپ کفار کی جانب سے شریک نہ ہوئے حالانکہ اس وقت آپ جوان تھے' آپ کے والد ابوسفیان سالار کی حیثیت سے شریک ہو رہے تھے اور آپ کے ہم عمر جوان بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے رہے تھے' ان تمام باتوں کے باوجود آپ کا شریک نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کی حقانیت ابتداء ہی سے آپ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق

اسلام لانے کے بعد آپ مستقلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لگے رہے اور آپ اس مقدس جماعت کے ایک رکن رکین تھے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کے لئے مامور فرمایا تھا' چنانچہ جو وحی آپ پر نازل ہوتی اسے قلمبند فرماتے اور جو خطوط و فرامین' سرکار دوجہاںؐ کے دربار سے جاری ہوتے انہیں بھی تحریر

؎ ابن حجر الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳ مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ

فرماتے۔ وحی خداوندی لکھنے کی وجہ سے ہی آپ کو کاتب وحی کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ:[۶]

نبی کریم کے کاتبین میں سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابت آپؐ کی خدمت میں حاضر رہے اور اس کے بعد دوسرا درجہ حضرت معاویہؓ کا تھا۔ یہ دونوں حضرات دن رات آپؐ کے ساتھ لگے رہتے اور اس کے سوا کوئی کام نہ کرتے تھے۔[۷]

حضورؐ کے زمانے میں کتابت وحی کا کام جتنا نازک تھا اور اس کے لئے جس احساس ذمہ داری، امانت و دیانت اور علم و فہم کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری، کتابت وحی، امانت و دیانت اور دیگر صفات محمودہ کی وجہ سے نبی کریمؐ نے متعدد بار آپ کے لئے دعا فرمائی۔ حدیث کی مشہور کتاب جامع الترمذی میں ہے کہ ایک بار نبی کریمؐ نے آپ کو دعا دی اور فرمایا:

اللھم اجعلہ ھادیا مھدیا واھدبہ

"اے اللہ معاویہؓ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا دیجئے۔ اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت دیجئے۔"[۸]

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریمؐ نے آپ کو دعا دی اور فرمایا:

اللھم علم معاویۃ الکتاب والحساب وقہ العذاب

---

[۶] جمال الدین یوسف: النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر و القاہرہ ص ۱۵۴ ج ۱ مطبوعہ وزارۃ الثقافۃ والارشاد والقومی مصر۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۷ ج ۹ مطبوعہ دار الکتاب بیروت ۱۹۶۷ء: ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۵ ج ۳ مطبوعہ مکتبۃ التجاریۃ الکبری ۱۹۳۹ء: البدایہ والنھایہ ص ۲۱ ج ۸ مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ

[۷] ابن حزم: جوامع السیرۃ ص ۲۷

[۸] جامع الترمذی ص ۲۴۷ ج ۲ مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید قرآن محل کراچی۔ ابن اثیر: اسد الغابہ ص ۳۸۶ ج ۴ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ طہران ۱۳۸۴ھ۔ حافظ خطیب: تاریخ بغداد ص ۲۰۸ ج ۱ مطبوعہ دار الکتاب بیروت

اے اللہ معاویہؓ کو حساب کتاب سکھا اور اس کو عذاب جہنم سے بچا۔[۹]

مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا:

اللھم علمہ الکتاب ومکن لہ فی البلاد وقہ العذاب

اے اللہ معاویہؓ کو کتاب سکھلا دے اور شہروں میں اس کے لئے ٹھکانا بنا دے اور اس کو عذاب سے بچالے۔[۱۰]

نبی کریمؐ نے آپ کی امارت و خلافت کی اپنی حیات میں ہی پیشن گوئی فرمادی تھی اور اس کے لئے دعا بھی فرمائی تھی جیسا کہ مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے۔ نیز حضرت معاویہؓ خود بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے وضو کا پانی لے کر گیا۔ آپ نے پانی سے وضو فرمایا اور وضو کرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور فرمایا

اے معاویہ! اگر تمہارے سپرد امارت کی جائے (اور تمہیں امیر بنادیا جائے) تو تم اللہ سے ڈرتے رہنا اور انصاف کرنا[۱۱]

اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

جو شخص اچھا کام کرے اسکی طرف توجہ کر اور مہربانی کر اور جو کوئی برا کام کرے اس سے درگذر کر۔

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد خیال لگا رہا کہ مجھے ضرور اس کام میں آزمایا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (مجھے امیر بنا دیا گیا)۔

ان روایات سے صاف واضح ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دربار نبوی

---

[۹] ابن عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۸۱ ج ۳: ایضاً مجمع الزوائد ص ۳۵۶ ج ۹ ایضاً کنزالعمال ص ۸۷ ج ۷ بحوالہ ابن النجار (کر) مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کراچی ۱۳۱۴ھ

[۱۰] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۳۵۶ ج ۹ طبع بیروت ایضاً النجوم الزاہرۃ ص ۱۳۴ ج ۱ مطبوعہ مصر

[۱۱] ابن حجرؒ: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳ مطبوعہ مصر: ایضاً مجمع الزوائد ص ۳۵۵، ۳۵۶ ج ۹ مطبوعہ بیروت: وفیہ! رواہ احمد والطبرانی فی الاوسط والکبیر ورجال احمد وابی یعلی رجال الصحیح

میں کیا مرتبہ حاصل تھا؟ اور آپؐ ان سے کتنی محبت فرماتے تھے؟

ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ نبی کریمؐ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کسی کام میں مشورہ کے لئے طلب فرمایا مگر دونوں حضرات کوئی مشورہ نہ دے سکے تو آپ نے فرمایا

ادعوا معاویۃ احضروہ امرکم فانہ قوی امین

کہ معاویہ کو بلاؤ اور معاملہ کو ان کے سامنے رکھو کیوں کہ وہ قوی ہیں (مشورہ دیں گے) اور امین ہیں [۱۲] (غلط مشورہ نہ دیں گے) لیکن اس روایت کی سند کمزور اور ضعیف ہے۔

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہوئے اور حضرت معاویہؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا:

"اے معاویہ! تمہارے جسم کا کون سا حصہ میرے جسم کے ساتھ مل رہا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا پیٹ (اور سینہ) آپ کے جسم مبارک کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپ نے دعا دی:

اللھم املاہ علمًا

اے اللہ اس کو علم سے بھر دے [۱۳]

جب آپ کے والد اسلام لے آئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اسلام لانے سے قبل مسلمانوں سے قتال کرتا تھا اب آپ مجھے حکم دیجئے کہ میں کفار سے لڑوں اور جہاد کروں، نبی کریمؐ نے فرمایا:

ضرور! جہاد کرو [۱۴]

چنانچہ اسلام لانے کے بعد آپؓ اور آپ کے والد نے آنحضرتؐ کے ہمراہ مختلف

---

[۱۲] مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۶ ج ۹ مطبوعہ بیروت وفیہ : رواہ الطبرانی والبزار باختصار ورجالہ ثقات فی بعضھم خلاف وشیخ البزار ثقہ وشیخ الطبرانی لم یوثقہ الا الذہبی فی المیزان ولیس فیہ جرح مفسر ومع ذلک فھو حدیث منکر : ایضا حافظ ذہبی تاریخ الاسلام ص ۳۱۹ ج ۲

[۱۳] حافظ ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۳۱۹ ج ۲

[۱۴] حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۲۱ ج ۸ مطبوعہ مصر

غزوات میں شرکت کی اور کفار سے جہاد کیا۔ آپؓ نے آنحضرتؐ کے ہمراہ غزوۂ حنین میں شرکت کی اور رسول کریمؐ نے آپ کو قبیلہ ہوازن کے مال غنیمت میں سے سو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی عطا فرمائی[15]۔

حضرت معاویہؓ صحابہؓ کی نظر میں

ان احادیث سے سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاویہؓ سے تعلق اور اس سے آپ کی فضیلت صاف ظاہر ہے' اس کے علاوہ دوسرے جلیل القدر صحابہؓ سے بھی متعدد اقوال مروی ہیں جن سے ان کی نظر میں حضرت معاویہؓ کے مقام بلند کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے حضرت معاویہؓ کی برائی کی گئی تو آپؓ نے فرمایا:

> دعونا من ذم فتی قریش من یضحک فی الغضب ولا ینال ماعنده الا علی الرضا ولا یوخذ ما فوق راسه الا من تحت قدمیه[16]
>
> قریش کے اس جوان کی برائی مت کرو جو غصہ کے وقت ہنستا ہے (یعنی انتہائی بردبار ہے) اور جو کچھ اس کے پاس ہے بغیر اس کی رضامندی کے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور اس کے سر پر کی چیز کو حاصل کرنا چاہو تو اس کے قدموں پر جھکنا پڑے گا (یعنی انتہائی غیور اور شجاع ہے۔)

اور حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: اے لوگو! تم میرے بعد آپس میں فرقہ بندی سے بچو اور اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ رکھو کہ معاویہؓ شام میں موجود ہیں[17]۔

یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس سے حضرت معاویہؓ کی اپنے بڑوں کے مقابلے میں اطاعت شعاری اور حضرت عمرؓ کی اپنے گورنروں اور مخصوصین پر کڑی

---

[15] حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۱۷ ج ۸ مطبوعہ مصر

[16] ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۷ ج ۳ مطبوعہ مصر

[17] ابن حجر: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳ مطبوعہ مصر

نگرانی ظاہر ہوتی ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب الاصابہ میں نقل کیا کہ ایک بار حضرت معاویہؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے، حضرت معاویہؓ نے اس وقت ایک سبز رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا، صحابہ کرامؓ نے حضرت معاویہؓ کی طرف دیکھنا شروع کردیا، حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا تو کھڑے ہوئے اور درہ لے کر حضرت معاویہؓ کی طرف بڑھے اور مارنے لگے۔ حضرت معاویہؓ پکارتے رہے: اللہ اللہ، اے امیرالمومنین! آپ کیوں مارتے ہیں؟ مگر حضرت عمرؓ نے کچھ جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے، صحابہؓ کرام حضرت عمرؓ سے کہنے لگے: آپ نے اس جوان (حضرت معاویہؓ) کو کیوں مارا؟ حالانکہ ان جیسا آپ کی قوم میں ایک نہیں!

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں نے اس شخص میں بھلائی کے علاوہ کچھ نہ پایا اور اس کے متعلق مجھے صرف بھلائی کی ہی خبر ملی ہے، لیکن میں نے چاہا کہ اس کو اتاروں اور یہ کہہ کر آپ نے حضرت معاویہؓ کے لباس کی جانب اشارہ کیا۔[۸]

نیز آپ کے متعلق حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے: تم قیصر و کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ خود تم میں معاویہؓ موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کی نظر میں آپ کا مرتبہ اور مقام اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے آپ کے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ کے انتقال کے بعد آپ کو شام کا گورنر مقرر کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے گورنروں اور والیوں کے تقرر کے معاملہ میں انتہائی محتاط تھے اور جب تک کسی شخص پر مکمل اطمینان نہ ہوجاتا اسے کسی مقام اور علاقہ کا امیر مقرر نہ کرتے تھے، پھر جس شخص کو گورنر بناتے اس کی پوری نگرانی فرماتے، اور جب کبھی معیار مطلوب سے فروتر محسوس ہوتا اسے معزول فرمادیتے تھے، ان کا آپ کو شام کا گورنر

---

[۸] ابن حجرؒ: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳

مقرر کرنا اور آخر حیات تک انہیں اس عہدے پر باقی رکھنا ظاہر کرتا ہے
انہیں آپؓ پر مکمل اعتماد تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کا دور آیا' وہ بھی آپ پر مکمل اعتماد کرتے تھے اور تمام اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی آپ کو شام کی گورنری کے عہدہ پر نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آس پاس کے دوسرے علاقے اردن' حمص' قنسوین اور فلسطین وغیرہ بھی آپ کی ماتحت گورنری میں دے دیئے۔

اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ شہید کردیئے گئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ پر مسلمانوں کی ایک جماعت نے بیعت کرلی اور آپ خلیفہ ہوگئے' اور آپ کے اور حضرت معاویہؓ کے درمیان قاتلین عثمان سے قصاص لینے کے بارے میں اختلاف پیش آیا جس نے بڑھ کر قتال کی صورت اختیار کرلی اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کی بنیاد پڑگئی' مگر جیسا کہ ہر ہوش مند جانتا ہے کہ اس میں دونوں جانب اختلاف کا منشاء دین ہی تھا' اس لئے فریقین ایک دوسرے کے دینی مقام اور ذاتی خصائل و اوصاف کے قائل تھے اور اس کا اظہار بھی فرماتے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ جب جنگ صفین سے واپس لوٹے تو فرمایا

ایها الناس لاتکرهوا امارة معاویة فانکم لو فقدتموه رأیتم الرؤس تندر عن کواهلها کانما الحنظل [19]

"اے لوگو! تم معاویہ کی گورنری اور امارت کو ناپسند مت کرو' کیونکہ اگر تم نے انہیں گم کردیا تو دیکھو گے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے جس طرح حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔"

خلفائے راشدین کے علاوہ دیگر اجلہ صحابہ کرام کو دیکھئے کہ ان کی نگاہ میں حضرت معاویہؓ کی کیا قدر و منزلت تھی؟

---

[19] حافظ ابن کثیر : البدایہ والنہایہ ص ۱۳۱ ج ۸ مطبوعہ مصر

حضرت ابن عباسؓ سے ایک فقہی مسئلہ میں حضرت معاویہ کی شکایت کی گئی تو آپ نے فرمایا:

انہ فقیہ [۲۰]

یقیناً معاویہؓ فقیہ ہیں۔

(جو کچھ انہوں نے کیا اپنے علم وفقہ کی بنا پر کیا ہوگا) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے جواب میں فرمایا:

انہ قد صحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کہ معاویہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اٹھایا ہے (اس لئے ان پر اعتراض بیجا ہے)۔[۲۱]

حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اٹھانا ہی اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کوئی فضیلت اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ایک بار حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت کریب نے آکر آپ سے شکایت کے لہجے میں بیان کیا کہ حضرت معاویہؓ نے وتر کی تین رکعتوں کے بجائے ایک رکعت پڑھی ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا:

اصاب ای بنی لیس احد منا اعلم من معاویۃ [۲۲]

"اے بیٹے! جو کچھ معاویہؓ نے کیا، صحیح کیا، کیوں کہ ہم میں معاویہؓ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ آپ کے علم وتفقہ اور تقویٰ سے کس درجہ متاثر تھے، یہ حال تو دینی امور میں تھا، دنیاوی امور میں حضرت ابن عباسؓ کا قول مشہور ہے:

ما رایت اخلق للملک من معاویۃ [۲۳]

---

[۲۰] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۲۳ ج ۸ مطبوعہ مصر

[۲۱] ابن حجر: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳ ایضاً: صحیح بخاری ص ۵۳۱ ج ۱ مطبوعہ نور محمد دہلی ۱۳۵۷ھ

[۲۲] بیہقی: سنن کبریٰ ص ۲۶ ج ۳ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۵۶ھ [۲۳] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸ طبع مصر، ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۵ ج ۴ ابن حجر: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳ مطبوعہ مصر

کہ میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر سلطنت اور بادشاہت کا لائق کسی کو نہ پایا۔

حضرت عمیر بن سعدؓ کا قول حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے عمیر بن سعدؓ کو حمص کی گورنری سے معزول کردیا اور ان کی جگہ حضرت معاویہؓ کو مقرر کیا تو کچھ لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں' حضرت عمیرؓ نے انہیں سختی سے ڈانٹا اور فرمایا:

لا تذکروا معاویة الا بخیر فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللهم اهد به

معاویہؓ کا صرف بھلائی کے ساتھ ذکر کرو' کیونکہ میں نے نبی کریمؐ کو ان کے متعلق یہ دعا دیتے سنا ہے: اے اللہ اس کے ذریعہ سے ہدایت عطا فرما۔[۲۴]

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: کہ میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر سرداری کے لائق کوئی آدمی نہیں پایا۔[۲۵]

سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آپس کی جنگوں میں غیر جانب دار رہے' فرمایا کرتے تھے:

ما رایت احداً بعد عثمان اقضی بحق من صاحب هذا الباب یعنی معاویةؓ

کہ میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد کسی کو معاویہؓ سے بڑھ کر حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں پایا۔[۲۶]

حضرت قبیصہ بن جابر کا قول ہے:

ما رایت احداً اعظم حلما ولا اکثر سوددا ولا ابعد اناة ولا الین مخرجا ولا ارحب باعا بالمعروف من معاویة[۲۷]

---

[۲۴] جامع الترمذی ص ۲۲۴ ج ۲ مطبوعہ سعید کراچی

[۲۵] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸ مطبوعہ مصر [۲۶] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

[۲۷] حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸ جلال الدین سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۵۶ مطبع نور محمد کراچی

"میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو (حضرت) معاویہؓ سے بڑھ کر بردبار'
ان سے بڑھ کر سیادت کا لائق' ان سے زیادہ باوقار' ان سے زیادہ نرم
دل' اور نیکی کے معاملہ میں ان سے زیادہ کشادہ دست ہو۔"

ان چند روایات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ آپ کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ اور ان کی نگاہ میں آپؓ کا مرتبہ کیا تھا؟

حضرت معاویہؓ تابعین کی نظر میں

تابعین کرام میں آپ کی حیثیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور خلافت میں کبھی کسی کو کوڑوں سے نہیں مارا' مگر ایک شخص جس نے حضرت معاویہؓ پر زبان درازی کی تھی' اس کے متعلق انہوں نے حکم دیا کہ اسے کوڑے لگائے جائیں۔[28]

حافظ ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ جو مشہور تابعین میں سے ہیں' ان سے کسی نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابن المبارکؒ جواب میں کہنے لگے: بھلا میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں؟ جس نے سرکار دو جہاںؐ کے پیچھے نماز پڑھی ہو اور جب سرکارؐ نے سمع اللہ لمن حمدہ' کہا تو انہوں نے جواب میں ربنا ولک الحمد کہا ہو۔[29]

انہی عبداللہ ابن المبارکؒ سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا: کہ یہ بتلایئے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ میں سے کون افضل ہیں؟ سوال کرنے والے نے ایک جانب اس صحابی کو رکھا جس پر طرح طرح کے اعتراضات کیئے گئے تھے' اور دوسری طرف اس جلیل القدر تابعی کو' جس کی جلالت شان پر تمام امت کا اتفاق ہے' یہ سوال سن کر عبداللہ ابن المبارکؒ غصہ میں آگئے اور فرمایا: تم ان دونوں کی آپس میں نسبت پوچھتے ہو'

---

[28] ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۸۳ ج ۳ مطبوعہ مصر' حافظ ابن کثیر' البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸

[29] ابن کثیر البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸

خدا کی قسم! وہ مٹی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کی ناک کے سوراخ میں چلی گئی' وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔[۳۰]

اسی قسم کا سوال حضرت معافی بن عمرانؒ سے کیا گیا تو وہ بھی غضب ناک ہو گئے اور فرمایا: بھلا ایک تابعی کسی صحابی کے برابر ہو سکتا ہے؟ حضرت معاویہؓ نبی کریمؐ کے صحابی ہیں' ان کی بہن نبی کریمؐ کے عقد میں تھیں' انہوں نے وحی خداوندی کی کتابت کی اور حفاظت کی' بھلا ان کے مقام کو کوئی تابعی کیسے پہنچ سکتا ہے؟

اور پھر یہ حدیث پڑھ کر سنائی کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

"جس نے میرے اصحاب اور رشتہ داروں کو برا بھلا کہا اس پر اللہ کی لعنت ہو"۔[۴۱]

مشہور تابعی حضرت احنف بن قیسؒ اہل عرب میں بہت حلیم اور بردبار مشہور ہیں ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ بردبار کون ہے؟ آپ یا معاویہؓ؟ آپ نے فرمایا: بخدا میں نے تم سے بڑا جاہل کوئی نہیں دیکھا (حضرت) معاویہؓ قدرت رکھتے ہوئے حلم اور بردباری سے کام لیتے ہیں اور میں قدرت نہ رکھتے ہوئے بردباری کرتا ہوں' لہٰذا میں ان سے کیسے بڑھ سکتا ہوں؟ یا ان کے برابر کیسے ہو سکتا ہوں؟[۴۲]

سوانح

جیسا کہ ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں' حضرت معاویہؓ کی ولادت بعثت نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی اور آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ شام وغیرہ کے علاقوں میں مصروف جہاد رہے' اسی دوران آپ نے جنگ یمامہ میں شرکت کی' بعض مورخین کا خیال ہے کہ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب

---

[۳۰] حوالہ مذکورہ بالا

[۴۱] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹ ج ۸ مطبوعہ مصر

[۴۲] تاریخ طبری ص ۱۸۷ ج ۶۔ العقد الفرید ص ۱۶۵ ج ۸ بحوالہ "حضرت معاویہؓ" مولفہ حکیم محمود احمد ظفر

کو آپ ہی نے قتل کیا تھا' مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت وحشیؓ نے نیزہ مارا تھا اور آپ نے اس کے قتل میں مدد کی تھی۔[۳۳]

پھر حضرت عمرؓ کا دور آیا اور ۱۹ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بھائی' یزید بن ابی سفیانؓ کو جو اس وقت شام کے گورنر تھے' حکم دیا کہ "قیساریہ" کو فتح کرنے کے لئے جہاد کریں' "قیساریہ" روم کا مشہور شہر اور رومیوں کی فوجی چھاؤنی تھی' چنانچہ یزید بن ابی سفیانؓ نے شہر کا محاصرہ کر لیا' یہ محاصرہ طول کھینچ گیا تو یزید بن ابی سفیان آپ کو اپنا نائب مقرر کر کے دمشق چلے گئے' حضرت معاویہؓ نے "قیساریہ" کا محاصرہ جاری رکھا یہاں تک کہ شوال ۱۹ھ میں اسے فتح کر لیا' اس فتح کے ایک ماہ بعد ہی ذیقعدہ ۱۹ھ میں یزید بن ابی سفیانؓ طاعون کے مہلک مرض میں وفات پا گئے' حضرت عمرؓ کو ان کی موت کا بہت صدمہ ہوا اور کچھ عرصہ بعد آپ نے ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کو شام کا گورنر بنا دیا اور آپ کا وظیفہ ایک ہزار درہم ماہانہ مقرر فرمایا' حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں آپ نے چار سال شام کے گورنر کی حیثیت سے گذارے[۳۴] اس عرصے میں آپ نے روم کی سرحدوں پر جہاد جاری رکھا اور بہت سارے شہر فتح کئے۔[۳۵]

حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے آپ کو اس عہدہ پر نہ صرف باقی رکھا' بلکہ آپ کے حسن انتظام' تدبر اور سیاست سے متاثر ہوتے ہوئے' حمص' قنسرین' اور فلسطین کے علاقے بھی آپ کے ماتحت کر دیئے[۳۶] حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں کل بارہ سال یا اس سے کچھ زائد آپ نے گورنر کی حیثیت سے گذارے' اس عرصے میں بھی آپ' اعلاء کلمۃ اللہ کے واسطے جہاد میں مصروف رہے۔

۲۵ھ میں آپ نے روم کی جانب جہاد کیا اور عموریہ تک جا پہنچے اور راستے میں فوجی مرکز قائم کئے۔

---

[۳۳] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۱۷ ج ۸

[۳۴] ابن عبد البرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۵' ۳۷۶' ۳ ج ۳: و دیگر کتب تاریخ

[۳۵] علامہ ابن خلدون: تاریخ ابن خلدون ص ۳۶۷ ج ۱ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ء

[۳۶] تاریخ ابن خلدون ص ۱۰۰۷ ج ۲ طبع بیروت

قبرص بحیرہ روم میں شام کے قریب ایک نہایت' زرخیز اور خوب صورت جزیرہ ہے اور یورپ اور روم کی طرف سے مصر و شام کی فتح کا دروازہ ہے اس مقام کی بہت زیادہ اہمیت تھی کیونکہ مصر و شام جہاں اب اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا' ان کی حفاظت اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی' جب تک کہ بحری ناکہ مسلمانوں کے قبضے میں نہ آئے' اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ ہی سے آپ کی اس زرخیز' حسین اور اہم جزیرہ پر نظر تھی اور ان کے دور خلافت میں آپ ان سے قبرص پر لشکر کشی کی اجازت طلب کرتے رہے مگر حضرت عمرؓ نے سمندر کی مشکلات اور دوسری وجوہات کی بناء پر اجازت نہ دی' جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو آپ نے ان سے اجازت طلب کی اور اصرار کیا تو حضرت عثمانؓ نے اجازت دیدی اور آپ نے مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار بحری بیڑہ تیار کرایا اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ہمراہ ۲۷ھ میں قبرص کی جانب روانہ ہوئے۔[۳۷]

مسلمانوں کی تاریخ میں بحری بیڑہ کی تیاری اور بحری جنگ کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ابن خلدون لکھتے ہیں: حضرت معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے بحری بیڑہ تیار کرایا اور مسلمانوں کو اس کے ذریعے جہاد کی اجازت دی۔[۳۸] پہلی بار بحری بیڑہ تیار کرانا حضرت معاویہؓ کی محض ایک تاریخی خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے نہایت عظیم سعادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا بحری جہاد کرنے والوں کے حق میں جنت کی بشارت دی تھی' چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے۔

اول جیش من امتی یغزون البحر قد اوجبوا

میری امت کے پہلے لشکر نے جو بحری لڑائی لڑے گا' اپنے اوپر جنت واجب کرلی ہے۔[۳۹]

---

[۳۷] حافظ ذہبی: العبر ص ۲۹ ج ۱ مطبع حکومۃ الکویت ۱۹۶۰ء ایضاً تاریخ ابن خلدون ص ۱۰۰۸ ج ۲ طبع بیروت

[۳۸] مقدمہ ابن خلدون: ص ۴۵۳ مطبوعہ بیروت

صحیح البخاری ص ۴۱۰ ج ۱ مطبوعہ نور محمد دہلی

۲۷ھ میں آپ اس کی طرف اپنا بحری بیڑہ لے کر روانہ ہوئے اور ۲۸ھ میں وہ آپ کے ہاتھوں فتح ہوگیا اور آپ نے وہاں کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا۔[۱]

۳۳ھ میں آپ نے افرنطینہ، ملطیہ، اور روم کے کچھ قلعے فتح کیے۔[۲]

۳۵ھ میں غزوہ ذی خشب پیش آیا، اور آپؓ نے اس میں امیر لشکر کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔[۳]

۳۶ھ میں حضرت عثمانؓ شہید ہوگئے، اور اس کے بعد جنگ صفین و جمل کے مشہور واقعات پیش آئے، آپ کا موقف اس سلسلہ میں یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اس لئے قاتلوں سے قصاص لینے میں کسی قسم کی نرمی نہ برتی جائے، اور قاتلوں سے جو نرمی برتی جارہی ہے، ان کو عہدوں پر مامور کیا جارہا ہے اور وہ خلافت کے کاموں میں جو بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، اس سلسلہ کو ختم کیا جائے، چنانچہ البدایہ والنہایہ میں مذکور واقعہ سے آپ کے اس موقف کی مکمل وضاحت ہوتی ہے اور اس بے بنیاد الزام کی قلعی کھل جاتی ہے کہ آپؓ اقتدار کی خواہش کے لئے ایسا کر رہے تھے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

> وقد ورد من غير وجه ان ابا مسلم الخولانی وجماعة معه دخلوا على معاوية فقالوا له: انت تنازع علياً ام انت مثله؟ فقال: والله انی لاعلم انه خير منی وافضل واحق بالامر منی ولکن الستم تعلمون ان عثمان قتل مظلوماً وانا ابن عمه وانا اطلب بدمه وامره الی فقولوا له فليسلم الی قتلة عثمان وانا اسلم له امره فاتوا علياً فکلموه فی ذلک فلم يدفع اليهم احدا فعند ذلک صمم اهل الشام على القتال مع معاوية[۴]

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ مختلف سندوں سے ہم تک یہ بات پہنچی ہے

---

[۱] جمال الدین یوسف: النجوم الزاہرۃ ص ۸۵ ج ۱ مطبوعہ مصر

[۲] ابن خلدون: ص ۱۰۰۸ ج ۲ بیروت

[۳] حافظ ذہبی: العبر ص ۳۴ ج ۱ مطبوعہ کویت

[۴] جمال الدین یوسف: النجوم الزاہرۃ ص ۹۲ ج ۱

[۵] حافظ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۲۹ ج ۸ مطبوعہ مصر

کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے اختلاف کے دوران' حضرت ابو مسلم خولانی لوگوں کی ایک جماعت کے ہمراہ حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے تاکہ ان کو حضرت علیؓ کی بیعت پر آمادہ کر سکیں' اور جا کر حضرت معاویہؓ سے کہا: تم علیؓ سے جھگڑ رہے ہو' کیا تمہارا خیال یہ ہے تم علم و فضل میں اس جیسے ہو؟ حضرت معاویہؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم! میرا یہ خیال نہیں' میں جانتا ہوں کہ علیؓ مجھ سے بہتر ہیں' افضل ہیں اور خلافت کے بھی مجھ سے زیادہ مستحق ہیں' لیکن کیا تم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اور میں ان کا چچازاد بھائی ہوں اس لئے مجھے ان کے خون کا قصاص اور بدلہ لینے کا زیادہ حق ہے۔

تم جا کر حضرت علیؓ سے یہ بات کہو کہ قاتلین عثمان کو میرے سپرد کر دیں' میں خلافت کو ان کے سپرد کر دوں گا۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کے پاس آئے' ان سے اس معاملہ میں بات کی' لیکن انہوں نے (ان معقول دلائل و اعذار کی بناء پر جو ان کے پاس تھے) قاتلین کو ان کے حوالہ نہیں کیا۔ اس موقعہ پر اہل شام نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس واقعہ کے بعد اس شبہ اور بہتان کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ ذاتی نام و نمود اور اقتدار کی خواہش کے لئے ایسا کر رہے تھے۔

اس بات کا اندازہ اس ایمان افروز خط سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت معاویہؓ نے ان ہی اختلافات کے دوران قیصر روم کو تحریر فرمایا تھا' روم کے بادشاہ قیصر نے عین اس وقت جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف شباب پر تھا اور قتل و قتال کی نوبت آرہی تھی' ان اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شام کے سرحدی علاقوں پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ کیا' حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع مل گئی' آپ نے اسے ایک خط بھجوایا اور اس میں لکھا:

مجھے اس بات کا علم ہوا ہے کہ تم سرحد پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہو' یاد رکھو! اگر تم نے ایسا کیا تو میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کر لوں گا۔ اور ان کا جو لشکر تم سے لڑنے کے لئے روانہ ہو گا' اس کے ہراول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا کر رکھ دوں گا" جب یہ خط قیصر روم

کے پاس پہنچا تو وہ اپنے ارادہ سے باز آگیا اور لشکر کشی سے رک گیا۔ یہ
کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ کفر کے مقابلہ میں اب بھی ایک جسم
وجان کی طرح ہیں اور ان کا اختلاف' سیاسی لیڈروں کا اختلاف نہیں
ہے۔

بہر حال یہ افسوسناک اختلاف اور قتال پیش آیا' اور دراصل اس میں بڑا ہاتھ ان مفسدین کا تھا جو دونوں جانب غلط فہمیاں پھیلاتے اور جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتے رہے۔

۳۷ھ میں صفر کے مہینہ میں واقعہ صفین پیش آیا[۵۵] اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے ہمراہ ستر ہزار آدمی شریک ہوئے[۵۶] جس میں صحابہ اور تابعین شامل تھے۔ آپ کے اور حضرت علیؓ کے درمیان یہ جنگ چار پانچ سال تک جاری رہی۔[۵۷]

اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ شہید کردیئے گئے' آپ پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا اور آپؓ کو زخم آئے۔

حضرت علیؓ کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے سیدنا حسنؓ خلافت پر متمکن ہوئے جو ابتداء ہی سے صلح جو اور مسلمانوں کے آپس کے قتال سے سخت متنفر تھے' شروع میں مفسدین نے انہیں بھی بہکایا مگر وہ ان کے کہے میں نہ آئے اور ۴۱ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے خلافت آپ کے سپرد کی' آپؓ نے ان کے لئے سالانہ دس لاکھ درہم وظیفہ مقرر کردیا۔[۵۸]

حضرت حسن بصریؒ' حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان صلح کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

استقبل واللہ الحسن بن علی معاویۃ بکتائب امثال الجبال
فقال عمرو بن العاص انی لاری کتائب لاتولی حتی یقتل

---

[۵۴] تاج العروس ص ۲۰۸ ج ۷ مادہ اصطفلین' مطبوعہ دار لیبیا: بنغازی
[۵۵] حافظ ذہبی: العبر ص ۳۸ ج ۱ مطبوعہ کویت
[۵۶] حافظ ذہبی: العبر ص ۴۰ ج ۱ مطبوعہ کویت
[۵۷] ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۶ ج ۳ مطبوعہ مصر
[۵۸] حافظ ذہبی: العبر ص ۴۹ ج ۱ مطبوعہ کویت

اقرانها فقال له معاوية وكان والله خير الرجلين أي عمرو ان قتل هؤلاء هؤلاء و هؤلاء هؤلاء من لي بأمور المسلمين؟ من لي بنسائهم؟ من لي بضيعتهم؟

کہ سیدنا حسن، پہاڑ جیسے لشکر لے کر حضرت معاویہؓ کے مقابلہ پر سامنے آئے تو حضرت عمرو بن العاصؓ حضرت معاویہؓ سے کہنے لگے:

میں لشکروں کو دیکھ رہا ہوں کہ بغیر قتل عظیم کے واپس نہ لوٹیں گے۔ (یعنی قتال عظیم ہوگا) تو حضرت معاویہؓ فرمانے لگے:

بتلاؤ! اگر انہوں نے انہیں قتل کیا اور ان لوگوں نے ان کو قتل کیا تو مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان کی عورتوں کی رکھوالی کی ضمانت کون دے گا؟ اور یتیم بچوں اور مال و متاع کا ضامن کون ہوگا؟[۴۹]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دل میں قوم وملت کا کتنا درد تھا اور وہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو کتنی بری نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے علاوہ علامہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کا ارادہ کیا تو ایک سفید کاغذ منگوایا اور اس کے آخر میں اپنی مہر لگائی اور کاغذ حضرت حسنؓ کے پاس روانہ فرما کر کہلا بھیجا کہ یہ سفید کاغذ آپ کی طرف بھیج رہا ہوں اور اس کے آخر میں، میں نے اپنی مہر لگادی ہے، آپ جو چاہیں شرطیں تحریر فرمادیں مجھے منظور ہیں[۵۰] چنانچہ حضرت حسنؓ نے کچھ شرطیں لکھ دیں اور اس طرح ۴۱ھ میں آپ کے اور حضرت حسنؓ کے درمیان صلح ہوگئی اور تمام مسلمانوں نے متفقہ طور آپ کو خلیفہ مقرر کرکے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، اس سال کو تاریخ عرب میں عام الجماعۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ یہ وہ سال ہے کہ جس میں امت کا منتشر شیرازہ پھر مجتمع ہوگیا اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: کہ جب حضرت حسنؓ صلح کرکے مدینہ تشریف لائے تو ایک

---

۴۹ جمع الفوائد ص ۸۴۳ طبع مدینہ منورہ، صحیح البخاری ص ۲۷۳، ۲۷۳ ج ۱ مطبوعہ نور محمد دہلی

۵۰ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۷۵ طبع بیروت

شخص نے حضرت معاویہؓ سے صلح کرنے پر آپ کو برا بھلا کہا تو آپ نے فرمایا:

لا تقل ذلک فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تذھب الایام واللیالی حتی یملک معاویۃ

مجھے برا بھلا مت کہو' کیوں کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ رات اور دن کی گردش اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ معاویہؓ امیر نہ ہو جائیں گے۔[۵۱]

حضرت معاویہؓ کے امیر المومنین ہو جانے کے بعد جہاد کا وہ سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا' جو حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد بند ہو گیا تھا' آپ نے اہل روم سے جہاد کیا' آپ نے اہل روم کے خلاف سولہ جنگیں لڑیں' آپ نے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا' ایک حصہ کو آپ گرمی کے موسم میں جہاد کے لئے روانہ فرما دیتے تھے' پھر جب سردیوں کا موسم آتا تو آپ دوسرا تازہ دم حصہ جہاد کے لئے بھیجتے تھے' آپ کی آخری وصیت بھی یہ تھی:

شد خناق الروم

"روم کا گلا گھونٹ دو"[۵۲]

۴۹ھ میں آپ نے قسطنطنیہ کی جانب زبردست لشکر روانہ کیا جس کا سپہ سالار سفیان بن عوف کو مقرر کیا[۵۳] اس لشکر میں اجلہ صحابہ کرام شریک تھے' اور یہی وہ غزوہ ہے جس کی نبی کریمؐ نے اپنی حیات میں ہی پیشن گوئی فرما دی تھی' اور اس میں شریک ہونے والوں کے متعلق فرمایا تھا:

اول جیش یغزو القسطنطنیۃ مغفور لھم

پہلا لشکر جو قسطنطنیہ کا جہاد کرے گا ان کو بخش دیا جائے گا۔[۵۴]

آپ ہی کے دور خلافت میں صقلیہ کے عظیم الشان جزیرہ پر مسلمانوں نے فوج کشی کی

---

۵۱ حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۱ ج ۸ مطبوعہ مصر

۵۲ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

۵۳ ابن تغری بردیؒ: النجوم الزاہرہ ص ۱۳۴ ج ۱

۵۴ حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۲۷ ج ۸

اور کثیر تعداد میں 'مال غنیمت مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا[۵۵] نیز آپ ہی کے زمانے میں بحستان سے کابل تک کا علاقہ فتح ہوا اور سوڈان کا پورا ملک اسلامی حکومت کے زیر نگین آگیا[۵۶]

ذیل میں ان غزوات کا ایک انتہائی اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے جو حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں پیش آئے'

اس سے قبل حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہؓ ایک طویل عرصہ تک شام کے گورنر رہے' اس دوران انہوں نے رومی نصرانیوں کے خلاف بہت سے جہاد کئے' وہ سب ان کے علاوہ ہیں۔

غزوات [۵۷]

۲۷ھ اس سال آپ بحری بیڑہ لے کر قبرص کی جانب بڑھے' مسلمانوں کی' تاریخ میں پہلی بحری جنگ تھی۔

۲۸ھ قبرص کا عظیم الشان جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔

۳۲ھ اس سال حضرت معاویہؓ نے قسطنطنیہ کے قریب کے علاقوں میں جہاد جاری رکھا۔

۳۳ھ افرنطیہ' ملطیہ' اور روم کے کچھ قلعے فتح ہوئے۔

۳۵ھ آپؓ کی قیادت میں غزوہ ذی خشب' پیش آیا۔

۴۲ھ غزوہ بحستان پیش آیا اور سندھ کا کچھ حصہ مسلمانوں کے زیر نگین آگیا۔

۴۳ھ ملک سوڈان فتح ہوا اور بحستان کا مزید علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔

۴۴ھ کابل فتح ہوا اور مسلمان ہندوستان میں قندابیل کے مقام تک پہنچ گئے۔

۴۵ھ افریقہ پر لشکر کشی کی گئی اور ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے زیر نگین آیا۔

---

[۵۵] مقدمہ ابن خلدون: ص ۴۵۴ مطبوعہ بیروت

[۵۶] ابن حزم: جوامع السیرۃ ص ۳۴۸' ایضاً سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۴۹ طبع نور محمد

[۵۷] اس نقشہ کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: حافظ ذہبی: العبر فی خبر من غبر ج ا مطبوعہ کویت ۱۹۶۰ء و دیگر کتب تاریخ

۳۶ھ صقلیہ (سسلی) پر پہلی بار حملہ کیا گیا اور کثیر تعداد میں مال غنیمت مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔

۴۷ھ افریقہ کے مزید علاقوں میں غزوات جاری رہے۔

۵۰ھ ۵۱ھ غزوہ قسطنطنیہ پیش آیا' یہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ تھا۔

۵۴ھ مسلمان نہر جیحون کو عبور کرتے ہوئے بخارا تک جا پہنچے۔

۵۶ھ غزوہ سمرقند پیش آیا۔

سیرت

آپ ایک وجیہہ اور خوبصورت انسان تھے' رنگ گورا تھا اور چہرہ پروقار اور بردباری تھی۔[۵۷] حضرت مسلمؓ فرماتے ہیں کہ معاویہؓ ہمارے پاس آئے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھے۔[۵۸] اس ظاہری حسن و جمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سیرت کی خوبیوں سے بھی نوازا تھا' چنانچہ ایک بہترین عادل حکمراں میں جو اوصاف ہو سکتے ہیں وہ آپ کی ذات میں موجود تھے' حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

"تم قیصر و کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ تم میں معاویہؓ موجود ہیں"[۵۹]

حکمراں کی حیثیت سے

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہوا' حضرت عثمانؓ کے زمانے سے باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ رک گیا تھا' آپ کے عہد حکومت میں یہ سلسلہ پوری قوت کے ساتھ جاری ہو گیا' حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے زمانے

---

۵۷ ابن حجر: الاصابہ' البدایہ والنہایہ' ابن اثیر وغیرہ

۵۸ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۵ ج ۹

۵۹ ابن طباطبا: الفخری ص ۱۲۹

ہی میں بحری فوج قائم کرلی تھی اور عبداللہ بن قیس حارثی کو اس کا افسر مقرر کیا تھا' اپنے عہد حکومت میں انہوں نے بحری فوج کو بہت ترقی دی' مصر و شام کے ساحلی علاقوں میں بہت سے جہاز سازی کے کارخانے قائم کئے چنانچہ ایک ہزار سات سو جنگی جہاز رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے' بحری فوج کے کمانڈر جنادہ بن ابی امیہ تھے' اس عظیم الشان بحری طاقت سے آپ نے قبرص' روڈس جیسے اہم یونانی جزیرے فتح کئے اور اسی بحری بیڑہ سے قسطنطنیہ کے حملہ میں بھی کام لیا۔

ڈاک کا محکمہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قائم ہوچکا تھا آپ نے اس کی تنظیم و توسیع کی اور تمام حدود سلطنت میں اس کا جال پھیلا دیا۔

آپ نے ایک نیا محکمہ دیوانِ خاتم کے نام سے بھی قائم کیا۔

نیز آپ نے خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے متعدد غلام مقرر فرمائے اور دیبا و حریر کا بہترین غلاف بیت اللہ پر چڑھایا۔

آپ اکتالیس سال امیر رہے[٦٠] حافظ ابن کثیرؒ آپ کے عہد حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> واجمعت الرعايا على بيعته فی سنة احدى واربعين كما قدمنا
> فلم يزل مستقلاً بالامر فی هذه المدة الى هذه السنة التی
> كانت فيها وفاته' والجهاد فی بلاد العدو قائم' وكلمة الله
> عالية' والغنائم ترد اليه من اطراف الارض' والمسلمون معه
> فی راحة وعدل وصفح وعفو[٦١]

آپ کے دور حکومت میں جہاد کا سلسلہ قائم رہا' اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا اور مال غنیمت' سلطنت کے اطراف سے بیت المال میں آتا رہا' اور مسلمانوں نے راحت و آرام اور عدل و انصاف سے زندگی بسر کی۔

آپ تالیف قلب' عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں خاص احتیاط برتتے تھے۔[٦٢]

---

[٦٠] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۷ ج ۸

[٦١] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۱۹ ج ۸

[٦٢] ابن تیمیہؒ: منہاج السنۃ ص ۲۸۳ ج ۲

اسی وجہ سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

ما رایت احدًا بعد عثمان اقضی بحق من صاحب ھذا الباب

کہ میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو حق کا فیصلہ کرنے والا نہ پایا۔[۶۳]

حضرت ابو اسحٰق السبیعیؒ فرمایا کرتے تھے:

"اگر تم حضرت معاویہؓ کو دیکھتے یا ان کا زمانہ پالیتے تو (عدل و انصاف کی وجہ سے) تم ان کو مہدی کہتے۔[۶۴]

اور حضرت مجاہدؒ سے بھی منقول ہے کہ وہ فرماتے:

اگر تم معاویہؓ کے دور کو پالیتے تو کہتے کہ مہدی تو یہ ہیں۔[۶۵]

اسی طرح ایک بار امام اعمشؒ کی مجلس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا تذکرہ ہوا تو امام اعمش فرمانے لگے:

اگر تم حضرت معاویہؓ کے زمانے کو پالیتے تو تمہیں پتہ چل جاتا، لوگوں نے پوچھا ان کے حلم اور بردباری کا؟ فرمایا: نہیں! بلکہ ان کے عدل و انصاف کا۔[۶۶]

آپ کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے حضرت امام اعمشؒ آپ کو "المصحف" کے نام سے یاد کرتے تھے۔[۶۷]

آپ کا دور حکومت ہر اعتبار سے ایک کامیاب دور شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کے دور میں مسلمان خوش حال رہے اور انہوں نے امن و چین کی زندگی گزاری، آپ نے رعایا کی بہتری

---

[۶۳] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۳ ج ۸

[۶۴] حوالہ مذکورہ بالا۔

[۶۵] العواصم من القواصم ص ۲۰۵

[۶۶] حوالا مذکورہ بالا

[۶۷] قاضی ابو بکر بن عربی: العواصم من القواصم ص ۲۱۰

اور دیکھ بھال کے لئے متعدد اقدامات کئے' جن میں سے ایک انتظام آپ نے یہ کیا کہ ہر قبیلہ اور قصبہ میں آدمی مقرر کئے جو ہر خاندان میں گشت کر کے یہ معلوم کرتے کہ کوئی بچہ تو پیدا نہیں ہوا؟ یا کوئی مہمان باہر سے آکر تو یہاں نہیں ٹھہرا؟ اگر کسی بچے کی پیدائش یا کسی مہمان کی آمد کا علم ہوتا تو اس کا نام لکھ لیتے اور پھر بیت المال سے اس کے لئے وظیفہ جاری کر دیا جاتا تھا۔[۶۸]

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الادب المفرد میں بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا تھا کہ دمشق کے غنڈوں اور بدمعاشوں کی فہرست بنا کر مجھے بھیجی جائے[۶۹] اس کے علاوہ آپ نے رفاہ عامہ کے لئے نہریں کھدوائیں' جو نہریں بند ہو چکی تھیں انہیں جاری کروایا مساجد تعمیر کرائیں اور عامۃ المسلمین کی بھلائی اور بہتری کے لئے اور کئی دوسرے اقدامات کئے۔ آپ کے ان اقدامات کی وجہ سے عوام بھی آپ سے محبت کرتے تھے اور آپ پر جان نثار کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> کانت سیرۃ معاویۃ مع رعیتہ من خیار امیر الولاۃ و کان رعیتہ یحبونہ' وقد ثبت فی الصحیحین عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال خیار ائمتکم الذین تحبونھم و یحبونکم و تصلون علیھم و یصلون علیکم[۷۰]
>
> حضرت معاویہؓ کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ بہترین حکمران کا برتاؤ تھا اور آپ کی رعایا آپ سے محبت کرتی تھی اور صحیحین بخاری و مسلم میں یہ حدیث ثابت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: تمہارے امراء میں سب سے بہتر امیر وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے اور تم ان پر رحمت بھیجتے ہو اور وہ تم پر۔

یہی وجہ تھی کہ اہل شام آپ پر جان چھڑکتے تھے اور آپ کے ہر حکم کی دل و جان سے

---

[۶۸] ابن تیمیہ: منہاج السنۃ ص ۱۸۵ ج ۳

[۶۹] امام بخاریؒ: الادب المفرد ص ۵۵۲ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

[۷۰] ابن تیمیہؒ: منہاج السنۃ ص ۱۸۹ ج ۳

تعمیل کرتے تھے' چنانچہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے اپنے لشکریوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا:

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ معاویہؓ اکھڑ جاہلوں کو بلاتے ہیں تو وہ بغیر عطیہ اور داد و دہش کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور سال میں دو تین بار جدھر چاہیں ادھر انہیں لے جاتے ہیں اور میں تمہیں بلاتا ہوں' حالانکہ تم لوگ عقل مند ہو' اور عطیات پاتے رہتے ہو مگر تم میری نافرمانی کرتے ہو' میرے خلاف کھڑے ہو جاتے ہو' اور میری مخالفت کرتے رہتے ہو۔[1]

آپ کی رعایا کے آپ پر فدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کی مصیبت اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرتے تھے اور ان کی تکلیف دور کرنے میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ ایک واقعہ سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت ثابت جو ابو سفیانؓ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں روم کے ایک غزوہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ شریک تھا' جنگ کے دوران ایک عام سپاہی اپنی سواری سے گر پڑا اور اٹھ نہ سکا تو اس نے لوگوں کو مدد کے لئے پکارا' سب سے پہلے جو شخص اپنی سواری سے اتر کر اس کی مدد کو دوڑا وہ حضرت معاویہؓ تھے۔[2] آپؓ کے ان اوصاف اور آپ کے دور حکومت کی ان خصوصیات کا اعتراف عام مؤرخین کے علاوہ خود شیعہ مؤرخین کو بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ شیعی مؤرخ امیر علی لکھتے ہیں :

"مجموعی طور پر حضرت معاویہؓ کی حکومت اندرون ملک بڑی خوشحال اور پر امن تھی اور خارجہ پالیسی کے لحاظ سے بڑی کامیاب تھی۔"[3]

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ عام مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی لیتے' ان کی شکایات کو بغور سنتے اور پھر حتی الامکان انہیں دور فرماتے تھے۔

---

[1] تاریخ طبری ص ۱۳۸ ج ۵

[2] مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۷ ج ۹

[3] بحوالہ حضرت معاویہؓ: مولفہ حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی

حضرت معاویہؓ کے روزمرہ کے معمولات

مشہور مؤرخ مسعودی نے آپ کے دن بھر کے اوقات کا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے۔ مسعودیؒ لکھتے ہیں:

آپ فجر کی نماز ادا کرکے زیرِ سلطنت ممالک سے آئی ہوئی رپورٹیں سنتے پھر قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے اور تلاوت کے بعد گھر تشریف لے جاتے اور وہاں ضروری احکامات جاری کرتے' پھر نماز اشراق ادا کرکے باہر تشریف لاتے اور خاص خاص لوگوں کو طلب فرماتے اور ان کے ساتھ دن بھر کے ضروری امور کے متعلق مشورہ کرتے' اس کے بعد ناشتہ لایا جاتا جو رات کے بچے ہوئے کھانے میں سے ہوتا۔ پھر آپ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے اور اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد باہر تشریف لاتے اور مسجد میں مقصورہ سے کمر لگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے' اس وقت میں عام مسلمان جن میں کمزور' دیہاتی بچے' عورتیں سب شامل ہوتے' آپ کے پاس آتے اور اپنی ضرورتیں تکلیفیں بیان کرتے تھے' آپ ان سب کی دل دہی کرتے' ضرورتیں پوری فرماتے' اور ان کی تکلیفوں کو دور کرتے تھے۔ جب تمام لوگ اپنی حاجتیں بیان کرلیتے اور آپ ان کے متعلق احکام جاری فرما دیتے اور کوئی باقی نہ بچتا تو آپ اندر تشریف لے جاتے اور وہاں خاص خاص لوگوں' معززین اور اشراف قوم سے ملاقات فرماتے' آپ ان سے کہتے:

> "حضرات! آپ کو اشراف قوم اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس مجلس خصوصی میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے' لہٰذا آپ کا فرض ہے جو لوگ یہاں حاضر نہیں ہیں ان کی ضرورتیں بیان کریں۔"

وہ ضرورتیں بیان کرتے اور آپ ان کو پورا فرماتے پھر دوپہر کا کھانا لایا جاتا اور اس وقت کاتب بھی حاضر ہوتا وہ آپ کے سرہانے کھڑا ہوجاتا اور باریاب ہونے والوں کو ایک ایک کرکے پیش کرتا اور جو کچھ وہ اپنی مشکلات اور معروضات تحریر کرکے لاتے' آپ کو پڑھ کر سناتا رہتا آپ کھانا کھاتے جاتے اور احکام لکھواتے جاتے تھے اور ہر باریاب ہونے والا شخص جب تک حاضر رہتا کھانے میں شریک رہتا' پھر آپ گھر تشریف لے جاتے اور ظہر کی

ملہ یاد رہے کہ یہ مشہور متعصب معتزلی مورخ ہیں

نماز کے وقت تشریف لاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد خاص مجلس ہوتی جس میں وزراء سے ملکی امور کے متعلق مشورہ ہوتا اور احکامات جاری ہوتے۔ یہ مجلس عصر تک جاری رہتی' آپؓ عصر کی نماز ادا کرتے اور پھر عشاء کے وقت تک مختلف امور میں مشغول رہتے' عشاء کی نماز کے بعد امراء سے امور سلطنت پر گفتگو ہوتی۔ یہ گفتگو ختم ہوتی تو علمی مباحث چھڑ جاتے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔[۴۴] مسعودی کا بیان ہے کہ آپ نے دن میں پانچ اوقات ایسے رکھے ہوئے تھے جن میں لوگوں کو عام اجازت تھی کہ وہ آئیں اور اپنی شکایات بیان کریں۔

حلم' بردباری اور نرم خوئی

آپ اس درجہ کے حلیم اور بردبار تھے کہ آپ کا حلم ضرب المثل بن گیا' اور آپ کے تذکرہ کے ساتھ حلم کا تصور اتنا لازم ہو گیا کہ بغیر اس کے آپ کا تذکرہ نامکمل ہے' آپ کے مخالفین آپ کے پاس آتے اور بسا اوقات انتہائی نازیبا رویہ اور سخت کلامی کے ساتھ پیش آتے' مگر آپؓ اسے ہنسی میں ٹال دیتے' یہی وہ رویہ تھا جس نے بڑے بڑے سرداروں اور آپ کے مخالفوں کو آپ کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا' چنانچہ حضرت قبیصہ بن جابر کا قول ہے کہ:

"میں نے حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو بردبار نہیں پایا"[۴۵]

ابن عون کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ایک عام آدمی کھڑا ہوتا اور ان سے کہتا: اے معاویہؓ! تم ہمارے ساتھ ٹھیک ہو جاؤ ورنہ ہم تمہیں سیدھا کر دیں گے' اور سیدنا معاویہؓ فرماتے: بھلا کس چیز سے سیدھا کرو گے؟ تو وہ جواب میں کہتا کہ لکڑی سے' آپ فرماتے: اچھا! پھر ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔[۴۶]

حضرت مسورؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ شروع میں آپ کے مخالف تھے پھر وہ آپ کے پاس

---

[۴۴] ملخص از مسعودی: مروج الذہب بہامش کامل ابن اثیر ص ۱۰۳ تا ۱۰۵ ج ۶

[۴۵] النجوم الزاہرۃ ص ۱۴۳ ج ۱

[۴۶] حافظ ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۳۲۳ ج ۲

اپنی کسی حاجت سے آئے' آپؓ نے وہ حاجت پوری کی' پھر انہیں بلایا اور فرمایا:

اے مسور! تم ہم پر کیا کچھ طعن و تشنیع کرتے رہے ہو؟

حضرت مسورؓ نے جواب دیا: اے امیر المومنین! جو کچھ ہوا اسے بھول جائیے۔

آپ نے فرمایا: نہیں! وہ سب باتیں جو تم میرے متعلق کہا کرتے تھے بیان کرو۔

چنانچہ حضرت مسورؓ نے وہ تمام باتیں آپ کے سامنے دہرادیں جو وہ آپ کے متعلق کہا کرتے تھے' آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ تمام الزامات کو سنا اور ان کا جواب دیا' آپ کے اس رویہ کا اثر یہ ہوا کہ اس واقعہ کے بعد حضرت مسورؓ جب بھی حضرت معاویہؓ کا ذکر کرتے بہترین الفاظ میں کرتے اور ان کے لئے دعائے خیر کیا کرتے تھے۔[۲۷]

آپ کے حلم اور بردباری کے واقعات کتب تاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔ منہ پھٹ لوگ اور مخالفین آتے اور جس طرح منہ میں آتا' شکایتیں پیش کرتے مگر آپ انتہائی برد باری سے کام لیتے' ان کی شکایات سنتے' ان کی تکلیفوں کو حتی الامکان دور کرتے اور ان کو انعامات سے نوازتے تھے' اسی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ آپ کی مجلس سے اٹھتے تو آپ کے گرویدہ ہو کر مجلس سے باہر آتے' خود حضرت معاویہؓ کا قول ہے کہ:

غصہ کے پی جانے میں جو مزہ مجھے ملتا ہے وہ کسی شے میں نہیں ملتا۔[۲۸]

مگر یہ سب حلم اور بردباری اس وقت تک ہوتی جب تک کہ دین اور سلطنت کے امور پر زد نہ پڑتی ہو اسی وجہ سے اگر کہیں سختی کرنے کا موقعہ ہوتا تو سختی بھی فرماتے اور اصولوں پر کسی قسم کی مداہنت برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ آپؓ کا قول ہے:

انی لا احول بین الناس و بین السنتهم مالم یحولوا بیننا و بین ملکنا[۲۹]

کہ میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں

---

[۲۷] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد ص ۲۰۸ ج ۱ مطبوعہ بیروت

[۲۸] تاریخ طبری ص ۱۵۷ ج ۲ مطبوعہ حیدر آباد دکن

[۲۹] ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۵ ج ۴

ہوتا جب تک کہ وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ

ہونے لگیں۔"

اسی طرح ایک اور موقعہ پر حضرت معاویہؓ اصول سیاست بیان کرتے ہوئے فرماتے:

"جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا' جہاں زبان کام

دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا' اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال

برابر تعلق بھی قائم ہو اسے قطع نہیں ہونے دیتا' جب لوگ اسے کھینچتے

ہیں تو میں ڈھیل دیدیتا ہوں' اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا

ہوں۔"؎

عفوودرگذر اور حسن اخلاق

حق تعالیٰ نے آپ کو دیگر صفات محمودہ کے علاوہ حسن خلق اور عفوودرگذر کی اعلیٰ صفات سے بھی نوازا تھا' ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ مخالفین اور جہلاء آپ کے پاس آتے' بدتہذیبی کے ساتھ پیش آتے اور آپ بلند حوصلگی سے کام لے کردرگزر کرتے' اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا' جس سے حضرت معاویہؓ کے صبروتحمل' فداکاری اور اطاعت رسولؐ پر روشنی پڑتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بابرکات میں حضرت وائل بن حجرؓ جو "حضرموت" کے بادشاہ کے بیٹے تھے' آپؐ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد کچھ روز آپؐ کے پاس مقیم رہے' جب وہ واپس ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو کسی ضرورت کی وجہ سے ان کے ساتھ کردیا' حضرت معاویہؓ ساتھ ہولئے۔ یہ پیدل تھے اور وائل بن حجرؓ اونٹ پر سوار۔ حضرت وائلؓ خاندانی شہزادے تھے اور نئے نئے اسلام لائے تھے' اس لئے شہزادگی کی خوبو ابھی باقی تھی اس لئے انہوں نے حضرت معاویہؓ کو ساتھ بٹھانا گوارا نہ کیا' کچھ دور تک تو حضرت معاویہؓ پیدل چلتے رہے مگر عرب کی صحرا کی گرمی' الامان والحفیظ! جب پاؤں تپتی ہوئی

؎ یعقوبی ص ۲۳۸ ج ۲

ریت میں جھلسنے لگے تو تنگ آکر حضرت وائلؓ سے گرمی کی شکایت کی اور کہا کہ:۔

مجھے بھی اپنے ساتھ سوار کر لیجئے' مگر وہ شہزادگی کی شان میں تھے' کہنے لگے:"یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں تمہیں سوار کرلوں تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو بادشاہوں کے ساتھ سوار ہو سکتے ہوں۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا: اچھا! اپنے جوتے ہی دے دیجئے کہ ریت کی گرمی سے کچھ بچ جاؤں' مگر انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہنے لگے:

تمہارے لئے بس اتنا شرف کافی ہے کہ میری اونٹنی کا جو سایہ زمین پر پڑ رہا ہے اس پر پاؤں رکھ کر چلتے رہو' مختصر یہ کہ انہوں نے نہ حضرت معاویہؓ کو سوار ہونے دیا اور نہ اس قیامت خیز گرمی سے بچنے کا کوئی اور انتظام کیا۔ اور سارا راستہ حضرت معاویہؓ نے پیدل طے کیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ بھی خاندانی اعتبار سے کچھ کم رتبہ نہیں تھے وہ بھی سردار قریش کے بیٹے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کے لئے پیشانی پر شکن لائے بغیر ان کے ساتھ چلتے رہے۔

مگر یہی وائل بن حجرؓ حضرت معاویہؓ کے پاس اس وقت آتے ہیں جب وہ خلیفہ بن چکے ہیں تو حضرت معاویہؓ انہیں پہچانتے ہیں اور وہ سارا واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ سب کچھ بھلا کر ان کی بھرپور مہمانداری کرتے ہیں اور ان کے ساتھ انتہائی عزت و اکرام کا برتاؤ کرتے ہیں۔[۱] اس واقعہ سے آپ کے اخلاق کریمانہ' بلند حوصلگی اور عفو و درگذر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عشق نبویؐ

آپ کو سرکار دو عالمؐ سے گہرا تعلق اور عشق تھا' ایک مرتبہ آپ کو پتہ چلا کہ بصرہ میں ایک شخص ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت مشابہت رکھتا ہے' آپ نے وہاں کے گورنر کو خط لکھا کہ تم فوراً اسے عزت و اکرام کے ساتھ یہاں روانہ کر دو' چنانچہ

---

[۱] ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۰۵ ج ۳ مطبوعہ مصر: ایضاً تاریخ ابن خلدون ص ۸۳۵ ج ۲ مطبوعہ بیروت

اسے عزت و اکرام کے ساتھ لایا گیا' آپ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا' اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کو انعامات اور خلعت سے نوازا۔[۸۲]

اسی عشق رسولؐ کی بناء پر آپ نے سرکار دو جہاںؐ کے کٹے ہوئے ناخن' ایک کپڑا اور بال مبارک سنبھال کر حفاظت کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جن کے متعلق آپ نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی کہ انہیں میری ناک' کان اور آنکھوں میں رکھ کر مجھے دفنا دیا جائے۔[۸۳]

اسی طرح وہ چادر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن زہیرؓ کو ان کا قصیدہ سن کر مرحمت فرمائی تھی اسے آپ نے رقم دے کر حاصل کیا تھا۔[۸۴]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی تعلق کی وجہ سے آپ کی بہت سی اداؤں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی جھلک پائی جاتی تھی' چنانچہ حضرت ابوالدرداء فرمایا کرتے تھے:۔

> کہ میں نے نماز پڑھنے میں کسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنا مشابہ نہیں پایا' جتنے حضرت معاویہؓ آپؐ سے مشابہ تھے۔[۸۵]

یہی عشق رسولؐ تھا جس کی وجہ سے آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کو دل و جان سے قبول کرتے تھے۔

حضرت جبلہ بن سحیم بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دوران ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ گلے میں رسی پڑی ہوئی ہے جسے ایک بچہ کھینچ رہا ہے اور آپ اس سے کھیل رہے ہیں' جبلہ بن سحیم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اے امیرالمومنین! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا "بیوقوف چپ رہو! میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر کسی کے پاس بچہ ہو تو وہ بھی بچوں کی سی حرکتیں کر لیا کرے تاکہ بچہ خوش ہو جائے۔[۸۶]

---

[۸۲] المحبر ص ۴۷

[۸۳] ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۳ ج ۴۔ ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۸۰ ج ۳

[۸۴] تاریخ ابن خلدون ص ۸۱۸ ج ۲ طبع بیروت

[۸۵] مجمع الزوائد و منبع الفوائد ص ۳۵۷ ج ۹ [۸۶] سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۱۵۴

اطاعت پیمبرؐ

اطاعت رسول کی ایک نادر مثال وہ واقعہ ہے جو مشکوۃ شریف میں منقول ہے کہ حضرت معاویہؓ اور اہل روم کے درمیان ایک مرتبہ صلح کا معاہدہ ہوا، صلح کی مدت کے دوران آپ اپنی فوجوں کو روم کی سرحدوں پر جمع کرتے رہے، مقصد یہ تھا کہ جونہی مدت معاہدہ ختم ہو گی فوراً حملہ کر دیا جائے گا، رومی حکام اس خیال میں ہوں گے کہ ابھی تو مدت ختم ہوئی ہے اتنی جلدی مسلمانوں کا ہم تک پہنچنا ممکن نہیں، اس لئے وہ حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اور اس طرح فتح آسان ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جیسے ہی مدت پوری ہوئی، آپ نے پوری قوت سے رومیوں پر یلغار کر دی وہ لوگ اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکے، اور پسپا ہونے لگے، آپ روم کا علاقہ فتح کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ ایک صحابی حضرت عمرو بن عبسہؓ پکارتے ہوئے آئے: "وفاء لا غدر" مومن کا شیوہ وفا ہے غدر و خیانت نہیں،

آپؓ نے پوچھا: کیا بات ہے؟

وہ کہنے لگے: میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جب دو قوموں کے درمیان کوئی صلح کا معاہدہ ہو تو اس معاہدہ کی مدت میں نہ تو کوئی فریق عہد کھولے نہ باندھے (یعنی اس میں کوئی تغیر نہ کرے) یہاں تک کہ مدت گزر جائے۔"

حضرت عمرو بن عبسہؓ کا مقصد یہ تھا کہ اس حدیث کی رو سے جنگ بندی کے دوران جس طرح حملہ کرنا ناجائز ہے اسی طرح دشمن کے خلاف فوجوں کو لے کر روانہ ہونا بھی جائز نہیں، چنانچہ جب حضرت معاویہؓ نے سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا تو فوراً حکم دیا کہ فوجیں واپس ہو جائیں، چنانچہ پورا لشکر واپس ہو گیا اور جو علاقہ فتح ہو چکا تھا اسے بھی خالی کر دیا گیا۔[۵۵] ایفاء عہد کی یہ حیرت انگیز مثال شاید ہی کسی اور قوم کے پاس ہو کہ عین اس وقت جبکہ تمام فوجیں فتح کے نشہ میں چور ہوں، صرف ایک جملہ سن کر سارا علاقہ خالی کرنے کا حکم دیدیا، اور لشکر کا ایک ایک فرد کسی حیل و حجت کے بغیر فوراً واپس لوٹ گیا۔

اسی طرح ایک بار حضرت ابو مریم الازدی آپؓ کے پاس گئے، آپؓ نے پوچھا کیسے آنا

---

[۵۵] مشکوۃ المصابیح، باب الامان ص ۳۴۷، مطبوعہ نور محمد کراچی رواہ ابو داؤد و الترمذی

ہوا؟

کہنے لگے! میں نے ایک حدیث سنی ہے وہ آپ کو سنانے آیا ہوں اور وہ حدیث یہ ہے کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ کہتے سنا' آپ فرما رہے تھے کہ جس شخص کو اللہ نے مسلمانوں پر مقرر کیا اور اس نے مسلمانوں اور اپنے درمیان پردے حائل کر لئے تو اللہ اس کے اور اپنے درمیان پردے حائل کر دے گا۔ ابو مریم الازدیؓ بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہی مجھ سے حضرت معاویہؓ نے یہ حدیث سنی فوراً حکم دیا کہ ایک آدمی مقرر کیا جائے جو لوگوں کی حاجتوں کو ان کے سامنے پیش کرتا رہے۔[۵۸]

خشیت باری تعالیٰ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے آپ کے خوف و خشیت اور فکر آخرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ مواخذہ قیامت کے خوف سے لرزہ براندام رہتے تھے' اور اس کے عبرت آموز واقعات سن کر زار و قطار روتے تھے۔

علامہ ذہبیؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ ایک جمعہ کو دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے اور فرمایا:

ان المال مالنا والفیئی فیئنا' من شئنا اعطینا ومن شئنا منعنا[۵۹]

"جو کچھ مال ہے وہ سب ہمارا ہے اور جو کچھ مال غنیمت ہے وہ بھی صرف ہمارا ہے' ہم جس کو چاہیں گے دیں گے اور جس سے چاہیں گے روک لیں گے۔"

آپ نے یہ بات کہی' کسی نے اس کا جواب نہ دیا' اور بات آئی گئی ہو گئی' دوسرا جمعہ آیا اور آپ خطبہ کے لئے تشریف لائے تو آپ نے پھر یہی بات دہرائی' پھر کسی نے جواب نہ دیا اور خاموشی طاری رہی' تیسرا جمعہ آیا اور آپ نے پھر یہی فرمایا تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

---

۵۸ حافظ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۸

۵۹ ترمذی' ابواب الزہد' بحوالہ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ج ۲ ص ۴۳ مطبوعہ اعظم گڑھ

ہرگز نہیں! مال ہمارا ہے اور مال غنیمت کا مال بھی ہمارا ہے' جو ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہو گا ہم تلواروں کے ذریعے اللہ تک اس کا فیصلہ لے جائیں گے' یہ سن کر آپ منبر سے اتر آئے اور اس آدمی کو بلا بھیجا اور اندر لے گئے' لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں' آپ نے حکم دیا کہ سب دروازے کھول دیئے جائیں اور لوگوں کو اندر آنے دیا جائے' لوگ اندر گئے تو دیکھتے ہیں کہ وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا: اللہ اس شخص کو زندگی عطا فرمائے اس نے مجھے زندہ کر دیا' میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا' آپؐ فرماتے تھے: میرے بعد کچھ حکمراں ایسے آئیں گے جو (غلط) بات کہیں گے اور ان پر نکیر نہیں ہوگی اور ایسے حکمران جہنم میں جائیں گے۔ تو میں نے یہ بات پہلے جمعہ کو کہی اور کسی نے جواب نہ دیا تو میں ڈرا کہیں میں بھی ان حکمرانوں میں سے نہ ہو جاؤں' پھر دوسرا جمعہ آیا اور اس میں بھی یہ واقعہ پیش آیا تو مجھے اور فکر ہو گئی' یہاں تک کہ تیسرا جمعہ آیا اور اس شخص نے میری بات پر نکیر کی اور مجھے ٹوکا تو مجھے امید ہوئی کہ میں ان حکمرانوں میں سے نہیں ہوں۔[۹۰]

سادگی اور فقرو استغناء

حضرت معاویہؓ کے مخالفین نے اس بات کا پروپیگنڈہ بڑی شدومد کے ساتھ کیا ہے کہ آپ ایک جاہ پسند انسان تھے' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

حضرت ابو مجلزؒ سے روایت ہے: وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت معاویہؓ کو کسی مجمع میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جو لوگ موجود تھے وہ احتراماً آپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر آپ نے اس کو بھی ناپسند کیا اور فرمایا:

ایسا مت کیا کرو! کیونکہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے واسطے کھڑے ہوا کریں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔[۹۱]

آپ کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ یونس بن میسرہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو

---

۹۰ حافظ ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۳۲۱ و ۳۲۲ ج ۲

۹۱ الفتح الربانی علی ترتیب مسند الامام احمد ص ۳۵۷ ج ۲۲

دمشق کے بازاروں میں دیکھا' آپ کے بدن پر پیوند لگی ہوئی قمیص تھی اور آپ دمشق کے بازاروں میں چکر لگا رہے تھے۔[92]

اسی طرح ایک مرتبہ لوگوں نے آپ کو دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے دیکھا کہ آپ کے کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔[93]

یہ تو آپ کی طبعی سادگی اور استغناء کی شان تھی مگر شام کی گورنری کے دوران آپ نے ظاہری شان و شوکت کے طریقے بھی اختیار کئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ سرحدی علاقہ تھا' اور آپؓ چاہتے تھے کہ کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی شان و شوکت کا دبدبہ قائم رہے' شروع شروع میں حضرت عمر فاروقؓ کو آپ کی یہ ظاہری شان و شوکت ناگوار بھی ہوئی اور انہوں نے آپ سے اس کے متعلق باز پرس کی' آپ نے جواب میں کہا: اے امیر المومنین ہم ایک ایسی سرزمین میں ہیں جہاں دشمن کے جاسوس ہر وقت کثیر تعداد میں رہتے ہیں' لہٰذا ان کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ظاہری شان و شوکت دکھانا ضروری ہے اسی میں اسلام اور اہل اسلام کی بھی عزت ہے۔

اس موقع پر حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ بھی حضرت عمر فاروقؓ کے ہمراہ تھے وہ آپ کے اس حکیمانہ جواب کو سن کر کہنے لگے: امیر المومنین! دیکھئے کس بہترین طریقے سے انہوں نے اپنے آپ کو الزام سے بچالیا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا: اسی لئے تو ہم نے ان کے کاندھوں پر یہ بار گراں ڈالا ہے۔[94]

علم و تفقہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علوم دینیہ میں کامل دسترس اور کمال تفقہ عطا فرمایا تھا۔ ابن حزم لکھتے ہیں: آپ کا شمار ان صحابہ میں سے ہے جو صاحب فتویٰ ہونے کی حیثیت سے[95] ہیں نیز

---

[92] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۴ ج ۸

[93] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۸

[94] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۲۴ و ۱۲۵ ج ۸

[95] ابن حزمؒ: جوامع السیرۃ ص ۳۲۰

ابن حجرؒ نے بھی آپ کو ان صحابہ کے متوسط طبقے سے شمار کیا ہے جو مسائل شرعیہ میں فتویٰ دیتے تھے۔[۹۶]

حضرت ابن عباسؓ آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے انہ فقیہ یعنی حضرت معاویہؓ یقیناً فقیہ ہیں۔

آپ سے نبی کریمؐ کی ایک سو تریسٹھ احادیث مروی ہیں[۹۷] اور آپ سے احادیث روایت کرنے والوں میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ، معاویہؓ بن خدیجؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سائب بن یزیدؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ جیسے صحابہ اور محمد بن سیرینؒ، سعید بن المسیبؒ، علقمہ بن وقاصؒ، ابوادریس الخولانیؒ اور عطیہ بن قیسؒ وغیرہ جیسے تابعین شامل ہیں۔[۹۸] آپ اعلیٰ پائے کے خطیب تھے، اور آپ کے خطبات عربی ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح وہ حکیمانہ اقوال جو آپ سے منقول ہیں، نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور علم و حکمت میں اپنی مثال آپ ہیں، آپ نے اپنے دور میں علم و حکمت کی سرپرستی کی، تاریخ اسلام میں آپ کے دور تک فن تاریخ کے اوراق بالکل سادہ تھے، سب سے پہلے آپؓ نے اس زمانے کے ایک ممتاز اخباری عبید بن شریہ سے تاریخ قدیم کی داستانیں، سلاطین عجم کے حالات، اور زبانوں کی ابتداء اور اس کے پھیلنے کی تاریخ لکھائی، یہ مسلمانوں میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب تھی۔[۹۹]

ظرافت

آپ ایک ہنس مکھ اور خوش اخلاق انسان تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی آپ سے بغیر کسی خوف کے ملتا اور آپ سے ہر قسم کی فرمائش کرتا، آپ سے اگر ممکن ہوتا تو پورا کردیتے ورنہ ٹال دیتے، ایک بار ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا میں ایک مکان بنا رہا ہوں،

---

[۹۶] ابن حجرؒ: الاصابہ فی تمییز الصحابہ ص ۲۲ ج ا

[۹۷] ابن حزمؒ: جوامع السیرۃ ص ۲۷۷، سیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص ۱۴۹

[۹۸] ابن حجرؒ: الاصابہ ص ۴۱۳ ج ۳

[۹۹] ابن ندیم: الفہرست ص ۱۳۲ بحوالہ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی ص ۳۲ ج ۲

آپ اس میں میری مدد کر دیجئے اور بارہ ہزار درخت عطا کر دیجئے آپ نے پوچھا' گھر کہاں ہے؟

کہنے لگا بصرہ میں!

آپ نے پوچھا! لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔

کہنے لگا دو فرسخ لمبائی ہے اور دو ہی فرسخ چوڑائی'

آپ نے مزاحاً فرمایا:

لا تقل داری بالبصرة ولکن قل البصرة فی داری

"یہ مت کہو کہ میرا گھر بصرہ میں ہے بلکہ یوں کہو کہ بصرہ میرے گھر میں ہے۔" [۱۲۲]

وفات

آپ کی پوری زندگی علم و عمل کی زندگی تھی' آپ سے جتنا کچھ بن سکا آپ نے مسلمانوں اور عوام الناس کی اصلاح اور بہبود کے لئے کام کیا اور اس کے لئے اپنی پوری زندگی خرچ کردی' مگر اس کے باوجود جب مخالفین آپؓ پر بے سروپا الزامات لگاتے اور آپ کو طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بناتے تو آپ کو اس کا افسوس ہوتا' چنانچہ حضرت معاویہؓ سے کسی نے پوچھا:

کیا بات ہے؟ آپ پر بڑھاپا جلد آ گیا تو جواب میں فرمایا:

کیوں نہ آئے؟ جب دیکھتا ہوں اپنے سر پر ایک اکھڑ جاہل آدمی کو کھڑا پاتا ہوں جو مجھ پر قسم قسم کے اعتراضات کرتا ہے اگر اس کے اعتراضات کا ٹھیک جواب دے دیتا ہوں تو تعریف کا کہیں سوال نہیں! اور اگر جواب دینے میں مجھ سے ذرا سی چوک ہو جائے تو وہ بات چہار عالم میں پھیلا دی جاتی ہے۔ [۱۲۳]

۶۰ھ میں جبکہ آپ عمر کی اٹھترویں منزل سے گذر رہے تھے' آپ کی طبیعت کچھ ناساز

---

[۱۲۲] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۴۱ ج ۸

[۱۲۳] حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ص ۱۴۰ ج ۸

ہوئی اور پھر طبیعت خراب ہوتی چلی گئی' اور طبیعت کی ناسازی' مرض وفات میں تبدیل ہو گئی' اسی مرض وفات میں آپ نے خطبہ دیا جو آپ کا آخری خطبہ تھا' اس میں اور باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا:

ایها الناس : ان من زرع قد استحصد وانی قد ولیتکم ولن یلیکم احدٌ بعدی خیر منی وانّما یلیکم من هو شر منی کما کان من ولیکم قبلی خیرٌ امنی

"اے لوگو! بعض کھیتیاں ایسی ہیں جن کے کٹنے کا وقت قریب آچکا ہے میں تمہارا امیر تھا' میرے بعد مجھ سے بہتر کوئی امیر نہ آئے گا جو آئے گا مجھ سے گیا گذرا ہی ہو گا' جیسا کہ مجھ سے پہلے جو امیر ہوئے وہ مجھ سے بہتر تھے۔"[۲۰۱]

اس خطبہ کے بعد آپ نے تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت فرمائی' فرمایا: کوئی عاقل اور سمجھدار آدمی مجھے غسل دے اور اچھی طرح غسل دے' پھر اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور کہا! اے بیٹے! میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ کے ہمراہ تھا آپ اپنی حاجت کے لئے نکلے' میں وضو کا پانی لیکر پیچھے گیا اور وضو کرایا تو آپؐ نے اپنے جسم مبارک پر پڑے ہوئے دو کپڑوں میں سے ایک کپڑا مجھے عنایت فرمایا' وہ میں نے حفاظت سے رکھ لیا تھا' اسی طرح آپؐ نے ایک بار اپنے بال اور ناخن مبارک کاٹے تو میں نے انہیں جمع کر کے رکھ لیا تھا تو تم کپڑے کو تو میرے کفن کے ساتھ رکھ دینا اور ناخن اور بال مبارک میری آنکھ' منہ اور سجدے کی جگہوں پر رکھ دینا اور پھر ارحم الراحمین کے حوالے کر دینا۔[۲۰۲]

آپ نے یہ وصیت کی اور اس کے بعد مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ دمشق کے مقام پر وسط رجب ۶۰ھ میں علم' حلم' اور تدبر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔[۲۰۳]

انا للہ وانا الیہ راجعون

---

[۲۰۱] حوالہ مذکورہ بالا ص ۱۴۱ ج ۸

[۲۰۲] ابن عبد البر: الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۸ ج ۳' ابن اثیر: تاریخ کامل ص ۲ ج ۴' ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ص ۱۴۱ ج ۸

[۲۰۳] ابن حجر: الاصابہ ص ۴۱۴ ج ۳ ایضاً ابن خلدون ص ۴۲ ج ۳ مطبوعہ بیروت

آپ کی نماز جنازہ حضرت ضحاک بن قیسؓ نے پڑھائی اور دمشق میں ہی باب الصغیر میں آپ کی تدفین ہوئی' صحیح قول کے مطابق آپ کی عمر اٹھتر سال تھی۔[۱۰۵]

علامہ ابن اثیرؒ نے اپنی تاریخ کامل میں نقل کیا کہ ایک دن عبدالملک بن مروان آپ کی قبر کے قریب سے گذرے تو کھڑے ہوگئے اور کافی دیر تک کھڑے رہے اور دعائے خیر کرتے رہے۔ ایک آدمی نے پوچھا کہ یہ کس کی قبر ہے؟ عبدالملک بن مروان نے جواب دیا:

قبر رجل كان والله فيما علمته ينطق عن علم ويسكت عن حلم اذا اعطى اغنى واذا حارب افنى ثم عجل له الدهر ما اخره لغيره ممن بعده هذا قبر ابى عبدالرحمان معاوية

"یہ اس شخص کی قبر ہے کہ جب بولتا تو علم و تدبر کے ساتھ بولتا تھا۔ اور اگر خاموش رہتا تو حلم و بردباری کی وجہ سے خاموش رہتا تھا۔ جسے دیتا اسے غنی کر دیتا' جس سے لڑتا اسے فنا کر ڈالتا۔"[۱۰۶]

آپ کے دور حکومت پر ایک شیعہ مؤرخ کا تبصرہ

مضمون کے آخر میں اس تبصرہ کو نقل کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا جو ساتویں صدی ہجری کے مشہور مؤرخ ابن طباطبا نے اپنی کتاب **الفخری** میں حضرت معاویہؓ اور ان کے دور حکومت پر کیا ہے۔ اس تبصرہ کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ تبصرہ ایسے مؤرخ نے کیا ہے جو شیعہ ہے اور اثناء عشری طبقے سے تعلق رکھتا ہے' اگرچہ اس تبصرہ میں کہیں کہیں انہوں نے جانبداری سے بھی کام لیا ہے مگر بحیثیت مجموعی اس میں تعصب کم اور حقیقت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ ابن طباطبا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

حضرت معاویہؓ دنیوی معاملات میں بہت ہی دانا تھے' فرزانہ و عالم تھے حلیم اور باجبروت فرمانروا تھے' سیاست میں کمال حاصل تھا' اور دنیاوی معاملات کو سلجھانے کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے' دانا تھے' فصیح و بلیغ تھے'

---

[۱۰۵] ابن عبدالبرؒ الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۷۸ ج ۳

[۱۰۶] ابن اثیرؒ: تاریخ کامل ص ۵ ج ۴

حلم کے موقع پر حلم اور سختی کے موقع پر سختی بھی کرتے تھے' لیکن حلم بہت غالب تھا' سخی تھے' مال خوب دیتے تھے' حکومت کو پسند کرتے تھے بلکہ اس سے دلچسپی تھی' رعایا کے شریف لوگوں کو انعامات سے نوازتے رہتے تھے' اس لئے قریشی شرفاء مثلاً عبداللہ عباسؓ' عبداللہ بن زبیرؓ' عبداللہ بن جعفرؓ طیار' عبداللہ بن عمرؓ' عبدالرحمان بن ابی بکرؓ' ابان بن عثمان بن عفانؓ اور خاندان ابوطالب کے دوسرے لوگ دمشق کا سفر کرکے ان کے پاس جاتے تھے اور (حضرت) معاویہؓ خاطر تواضع اور مہمان نوازی کے علاوہ ان کی ضروریات پوری کرتے رہتے۔ یہ لوگ ہمیشہ ان سے سخت کلامی کرتے اور نہایت ناپسندیدہ انداز سے پیش آتے لیکن یہ کبھی تو اسے ہنسی میں اڑادیتے اور کبھی سُنی ان سُنی کردیتے اور جب ان حضرات کو رخصت کرتے تو بڑے اعلیٰ تحائف اور انعامات دیکر رخصت کرتے' ایک بار انہوں نے ایک انصاری کے پاس پانچ سو دینار یا درہم بھیجے' انصاری نے بہت کم خیال کیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ رقم لے جاؤ اور (حضرت) معاویہؓ کے منہ پر مار کر واپس کردو' پھر اس سے قسم دے کر کہا کہ جیسا میں نے بتایا ہے اسی طرح کرے' وہ رقم لے کر (حضرت) معاویہؓ کے پاس پہنچا اور کہا:

اے امیرالمومنین! میرے والد گرم مزاج اور جلد باز ہیں' انہوں نے قسم دیکر ایسا حکم دیا ہے اور میں ان کے خلاف جانے کی قدرت نہیں رکھتا' یہ سن کر (حضرت) معاویہؓ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ تمہارے والد نے جو کچھ حکم دیا ہے اسے پورا کرلو اپنے چچا کے (یعنی میرے) ساتھ نرمی بھی ملحوظ رکھو (یعنی زور سے نہ مارو) وہ صاحبزادے شرماگئے اور رقم ڈال دی' حضرت معاویہؓ نے رقم دوگنی کرکے انصاری کو بھجوادی۔

ان کے لڑکے یزید کو جب خبر ہوئی تو غصہ میں اپنے والد کے پاس آیا اور کہا: آپ حلم میں مبالغہ سے کام لینے لگے ہیں' اندیشہ ہے کہ لوگ اسے

آپ کی کمزوری اور بزدلی پر محمول کرنے لگیں گے' انہوں نے جواب دیا کہ بیٹے! حلم میں نہ کوئی ندامت کی بات ہے نہ برائی کی تم اپنا کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو'

اس قسم کے کردار نے (حضرت) معاویہؓ کو خلیفہ عالم بنادیا اور مہاجرین وانصار میں ہر وہ شخص ان کے آگے جھک گیا جو اپنے آپ کو ان سے زیادہ حق دار خلافت سمجھتا تھا' حضرت معاویہؓ مدبر ترین انسان تھے (حضرت) عمر بن خطابؓ نے ایک بار اہل مجلس سے فرمایا:

"تم لوگ قیصرو کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ تمہارے اندر معاویہؓ موجود ہیں۔"

حضرت معاویہؓ کئی حکومتوں کے مربی' کئی امتوں کی سیاست چلانے والے' اور کئی ملکوں کے راعی تھے' حکومت میں انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی ایجاد کیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کی تھیں' مثلاً انہوں نے سب سے پہلے فرمانرواؤں کے لئے باڈی گارڈ مقرر کئے جو ان کے سامنے ہتھیار تانے رہتے تھے' اور جامع مسجد میں انہی نے مقصورہ تیار کرایا جس میں فرمانروا اور خلیفہ' لوگوں سے الگ الگ ہو کر تنہا نماز ادا کرسکے' امیرالمومنین علیہ السلام (حضرت علیؓ) کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اسی کے خوف سے (حضرت) معاویہؓ نے ایسا کیا.... اور انہی نے سب سے پہلے برید (ڈاک) کا وہ طریقہ اختیار کیا جس سے جلد جلد خبریں مل جایا کریں' برید سے مراد یہ ہے کہ مختلف جگہوں پر نہایت چست شہ سوار متعین کردیئے جائیں تاکہ جہاں ایک تیز رفتار خبر رساں پہنچے اور اس کا گھوڑا تھک چکا ہو تو دوسرا شہ سوار دوسرے تازہ دم گھوڑے پر آگے روانہ ہو جائے اور اسی طرح ایک چوکی سے دوسری چوکی تک تیزی کے ساتھ خبر پہنچ جائے' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملکی معاملات میں ایک نیا محکمہ جسے دیوان خاتم کہتے ہیں (یعنی مہریں ثبت کرنے کا محکمہ) قائم کیا' یہ دوسرے قابل اعتبار محکموں میں سے ایک تھا' بنی عباس تک یہ

طریقہ جاری رہا پھر بعد میں ترک کر دیا گیا' دیوان خاتم کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک محکمہ تھا جس میں کئی ملازمین ہوتے جب کسی معاملہ میں خلیفہ کے دستخطوں سے کوئی حکم صادر ہوتا تو وہ پہلے اس محکمہ میں لایا جاتا اور اس کی ایک کاپی یہاں نتھی کر لی جاتی اور اسے موم (لاکھ) سے سربمہر کر دیا جاتا' اس کے بعد اس محکمہ کے افسر اعلیٰ کی مہر لگا دی جاتی' حضرت معاویہؓ معاملات دنیوی کو حل کرنے میں ہمیشہ مصروف کار رہتے تھے ان کی فرمانروائی بڑی مستحکم تھی اور پیچیدہ معاملہ ان کے لئے آسان تھا۔

عبدالملک بن مروان کو دیکھئے وہ اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ جب حضرت معاویہؓ کی قبر پر گئے اور ان کے لئے دعائے خیر کرنے لگے تو ایک شخص نے پوچھا کہ :

اے امیرالمومنین! یہ کس کی قبر ہے؟

انہوں نے جواب دیا کہ جہاں تک میرا علم اس شخص کے بارے میں ہے وہ یہ ہے کہ صاحب قبر پوری واقفیت کے بعد بولتا تھا اور حلم کی وجہ سے خاموش رہتا تھا' جسے دیتا اسے غنی کر دیتا' اور جس سے لڑتا اسے فنا کر ڈالتا تھا۔ (حضرت) عبداللہ بن عباسؓ جو بڑے نقاد تھے کہتے ہیں :

کہ ریاست فرمانروائی کی طرف توجہ دینے میں (حضرت) معاویہؓ سے زیادہ لائق میں نے اور کسی کو نہیں دیکھا"[۱]

---

[۱] ابن طباطبا: الفخری ص ۱۲۹ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

نقوشِ رفتگاں

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف کراچی

مُطالعے کے دوران چُھنے ہُوئے دلچسپ واقعات
علمی وادبی لطائف اور معلُوماتی نکات

جسٹس مُفتی محمد تقی عُثمانی صاحب

ادارۃ المعارف کراچی

مآثر حضرت عارفیؒ

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر محمد عبد الحی صاحب عارفی قدس سرہٗ
کے مزاج و مذاق، سیرت اور افادات کا تذکرہ

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی

میرے والد میرے شیخ

اور اُن کا مزاج و مذاق

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴